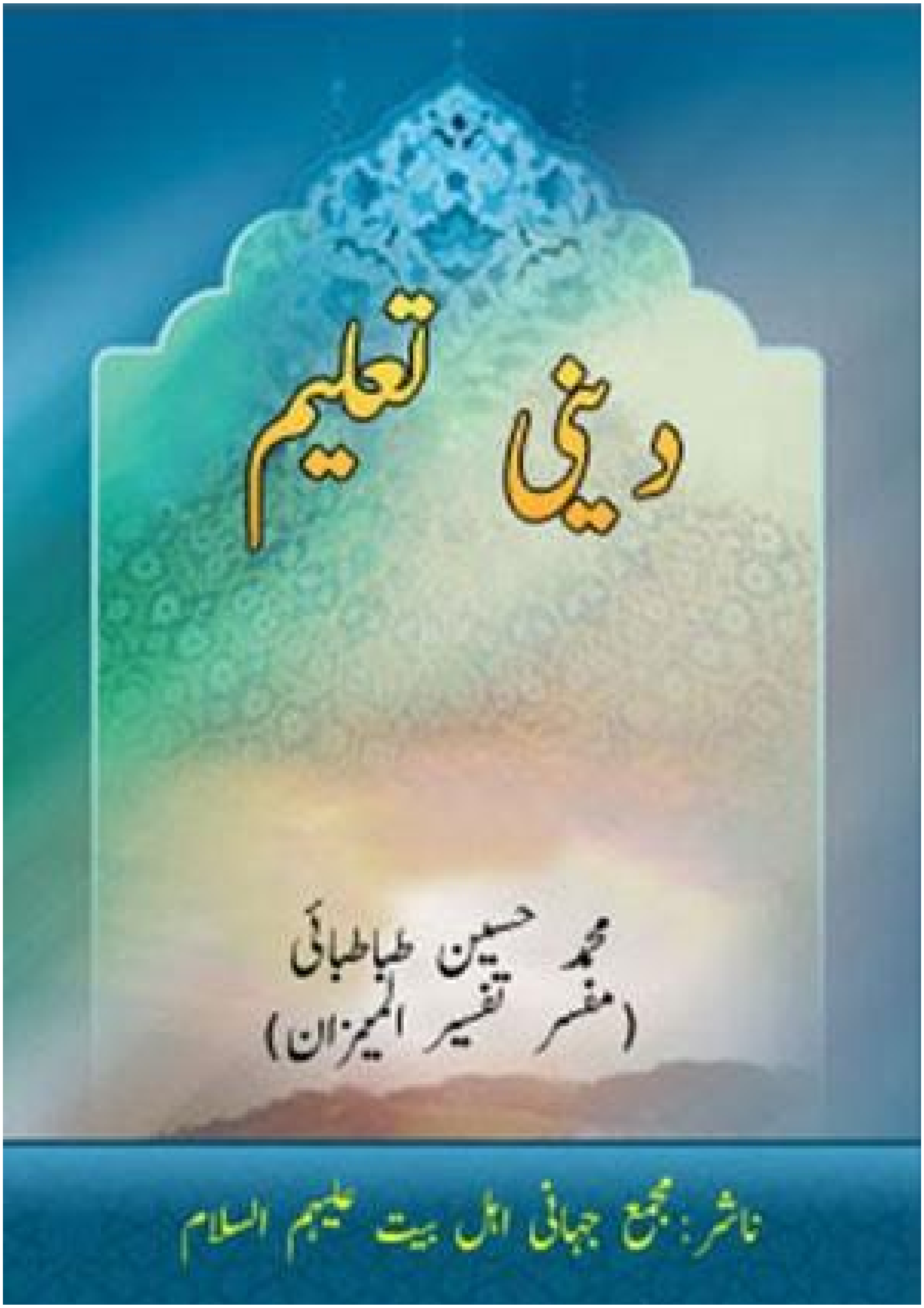
دینی تعلیم
محمد حسین طباطبائی
(مفسر تفسیر المیزان)
ناشر: مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام

یہ کتاب برقی شکل میں نشر ہوئی ہے اور شبکہ الامامین الحسنین (علیہما السلام) کے گروہ علمی کی نگرانی میں تنظیم ہوئی ہے

دینی تعلیم

محمد حسین طباطبائی

(مفسر تفسیر المیزان)

مرتّبہ: سید مہدی آیت اللّٰہی

مترجم: سید قلبی حسین رضوی

ناشر: مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام

پروردگار عالم نے ارشاد فرمایا:

(اِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَ يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْراً)

(سورۂ احزاب : آیت ۳۳)

اے اہلبیت اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ تم سے رجس اور گندگی کو دور رکھے اور تمہیں اسی طرح پاک رکھے جو پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے۔

شیعہ اور اہل سنت کی کتابوں میں رسول خدا ﷺ کی بہت سی احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ آیۂ مبارکہ پنجتن اصحاب کساء کی شان میں نازل ہوئی ہے اور " اہل بیت" سے مراد وہی حضرات ہیں اور وہ: محمد ﷺ ، علی ، فاطمہ، حسن و حسین علیہم السلام ہیں۔ نمونہ کے طور پر ان کتابوں کی طرف رجوع کریں: مسند احمد بن حنبل (وفات ۲۴۱ ھ): ج ۱، ص ۳۳۱، ج ٤، ص ۱۰۷ ، ج ٦، ص ۲۹۲ و ۳۰٤؛ صحیح مسلم (وفات ۲٦۱ ھ) : ج ۷، ص ۱۳۰ ؛ سنن ترمذی (وفات ۲۷۹ ھ): ج ٥، ص ۳٦۱ و ...؛ الذریۃ الطاہرۃ النبویۃ دولابی (وفات: ۳۱۰ ھ): ص ۱۰۸ ؛ السنن الکبریٰ نسائی (وفات ۳۰۳ ھ): ج ٥ ، ص ۱۰۸ و ۱۱۳ ؛ المستدرک علی الصحیحین حاکم نیشاپوری (وفات: ٤۰٥ ھ): ج ۲، ص ٤۱٦، ج ۳، ص ۱۳۳ و ۱٤۷ و ۱۱۳ ؛ البرہان زرکشی (وفات ۷۹٤ ھ) ص ۱۹۷ ؛ فتح الباری شرح صحیح البخاری ابن حجر عسقلانی (وفات ۸٥۲ ھ): ج ۷، ص ۱۰٤ ؛ اصول الکافی کلینی (وفات ۳۲۸ ھ): ج ۱، ص ۲۸۷ ؛ الامامۃ و التبصرۃ ابن بابویہ (وفات ۳۲۹ ھ): ص ٤۷، ح ۲۹؛ دعائم الاسلام مغربی (وفات ۳٦۳ ھ): ص ۳٥ و ۳۷؛ الخصال شیخ صدوق (وفات ۳۸۱ ھ): ص ٤۰۳ و ٥٥۰؛ الامالی شیخ طوسی (وفات ٤٦۰ ھ): ح ٤۳۸، ٤۸۲ و ۷۸۳ نیز مندرجہ ذیل کتابوں میں اس آیت کی تفسیر کی طرف مراجعہ کریں: جامع البیان طبری (وفات ۳۱۰ ھ)؛ احکام القرآن جصاص (وفات ۳۷۰ ھ)؛ اسباب النزول واحدی (وفات ٤٦۸ ھ)؛ زاد المسیر ابن جوزی (وفات ٥۹۷ ھ)؛ الجامع لاحکام القرآن قرطبی (وفات ٦۷۱ ھ)؛ تفسیر ابن کثیر (وفات ۷۷٤ ھ)؛ تفسیر ثعالبی (وفات ۸۲٥ ھ)؛ الدر المنثور سیوطی (وفات ۹۱۱ ھ)؛ فتح القدیر شوکانی (وفات ۱۲٥۰ ھ)؛ تفسیر عیاشی (وفات ۳۲۰ ھ)؛ تفسیر قمی (وفات: ۳۲۹ ھ)؛ تفسیر فرات کوفی (وفات ۳٥۲ ھ) آیۂ اولوا الامر کے ذیل میں ؛ مجمع البیان طبرسی (وفات ٥٦۰ ھ) اور بہت سی دوسری کتابیں۔

حرف اول

جب آفتاب عالم تاب افق پر نمودار ہوتاہے کائنات کی ہر چیز اپنی صلاحیت و ظرفیت کے مطابق اس سے فیضیاب ہوتی ہے حتی ننھے ننھے پودے اس کی کرنوں سے سبزی حاصل کرتے اور غنچہ و کلیاں رنگ ونکھار پیدا کرلیتی ہیں تاریکیاں کا فور اور کوچہ و راہ اجالوں سے پرنور ہوجاتے ہیں، چنانچہ متمدن دنیا سے دور عرب کی سنگلاخ وادیوں میں قدرت کی فیاضیوں سے جس وقت اسلام کا سورج طلوع ہوا، دنیا کی ہر فرد اور ہر قوم نے قوت و قابلیت کے اعتبار سے فیض اٹھایا۔

اسلام کے مبلغ و موسس سرور کائنات حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم غار حراء سے مشعل حق لے کر آئے اور علم و آگہی کی پیاسی اس دنیا کو چشمہ حق و حقیقت سے سیراب کردیا، آپ کے تمام الٰہی پیغامات، ایک ایک عقیدہ اور ایک ایک عمل فطرت انسانی سے ہم آہنگ ارتقائے بشریت کی ضرورت تھا، اس لئے ۲۳ برس کے مختصر عرصے میں ہی اسلام کی عالمتاب شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں اور اس وقت دنیا پر حکمران ایران و روم کی قدیم تہذیبیں اسلامی قدروں کے سامنے ماند پڑگئیں، وہ تہذیبی اصنام جو صرف دیکھنے میں اچھے لگتے ہیں اگر حرکت و عمل سے عاری ہوں اور انسانیت کو سمت دینے کا حوصلہ، ولولہ اور شعور نہ رکھتے تو مذہب عقل و آگہی سے روبرو ہونے کی توانائی کھودیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ایک چوتھائی صدی سے بھی کم مدت میں اسلام نے تمام ادیان و مذاہب اور تہذیب و روایات پر غلبہ حاصل کرلیا۔

اگرچہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی یہ گرانبہا میراث کہ جس کی اہل بیت علیہم السلام اور ان کے پیروؤں نے خود کو طوفانی خطرات سے گزار کر حفاظت و پاسبانی کی ہے، وقت کے ہاتھوں خود فرزندان اسلام کی بے توجہی اورناقدری کے سبب ایک طویل عرصے کے لئے تنگنائیوں کاشکار ہوکراپنی عمومی افادیت کو عام کرنے سے محروم کردئی گئی تھی، پھر بھی حکومت و سیاست کے عتاب کی پروا کئے بغیر مکتب اہل بیت علیہم السلام نے اپنا چشمۂ فیض جاری رکھا اورچودہ سو سال کے عرصے میں بہت سے ایسے جلیل القدر علماء و دانشور دنیائے اسلام کو تقدیم کئے جنھوں نے بیرونی افکارو نظریات سے متاثر اسلام و قرآن مخالف فکری و نظری موجوں کی زدپر اپنی حق آگیں تحریروں اور تقریروں سے مکتب اسلام کی پشت پناہی کی ہے اور ہر دور اور ہر زمانے میں ہر قسم کے شکوک و شبہات کا ازالہ کیاہے، خاص طور پر عصر حاضر میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد ساری دنیا کی نگاہیں ایک بار پھر اسلام و قرآن او رمکتب اہل بیت علیہ السلام کی طرف اٹھی او رگڑی ہوئی ہیں، دشمنان اسلام اس فکر و معنوی قوت و اقتدار کو توڑنے کے لئے اوردوستداران اسلام سے اس مذہبی اور ثقافتی موج کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑنے اور کامیاب و کامران زندگی حاصل کرنے کے لئے بے چین و بے تاب ہیں، یہ زمانہ عملی اور فکری مقابلے کازمانہ ہے اورجو مکتب بھی تبلیغ او رنشر

و اشاعت کے بہتر طریقوں سے فائدہ اٹھا کر انسانی عقل و شعور کو جذب کرنے والے افکار و نظریات دنیاتک پہنچائے گا، وہ اس میدان میں آگے نکل جائے گا۔

(عالمی اہل بیت کونسل) مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام نے بھی مسلمانوں خاص طور پر اہل بیت عصمت و طہارت کے پیروؤں کے درمیان ہم فکری و یکجہتی کو فروغ دینا وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے اس راہ میں قدم اٹھایاہے کہ اس نورانی تحریک میں حصہ لے کر بہتر انداز سے اپنا فریضہ ادا کرے، تا کہ موجود دنیا ئے بشریت جو قرآن و عترت کے صاف وشفاف معارف کی پیاسی ہے زیادہ سے زیادہ عشق و معنویت سے سرشار اسلام کے اس مکتب عرفان و ولایت سے سیراب ہو سکے، ہمیں یقین ہے عقل و خرد پر استوار ماہرانہ انداز میں اگر اہل بیت عصمت و طہارت کی ثقافت کو عام کیا جائے اور حریت و بیداری کے علمبردار خاندان نبوت ﷺ و رسالت کی جاوداں میراث اپنے صحیح خدو خال میں دنیا تک پہنچادی جائے تو اخلاق و انسانیت کے دشمن، انانیت کے شکار، سامراجی خون خواروں کی نام نہاد تہذیب و ثقافت اور عصر حاضر کی ترقی یافتہ جہالت سے تھکی ماندی آدمیت کو امن و نجات کی دعوتوں کے ذریعہ امام عصر (عج) کی عالمی حکومت کے استقبال کے لئے تیار کیا جا سکتا ہے۔

ہم اس راہ میں تمام علمی و تحقیقی کوششوں کے لئے محققین و مصنفین کے شکر گزار ہیں اور خود کو مؤلفین و مترجمین کا ادنی خدمتگار تصور کرتے ہیں، زیر نظر کتاب، مکتب اہل بیت علیہم السلام کی ترویج و اشاعت کے سلسلے کی ایک کڑی ہے، علامہ طباطبائی کی گرانقدر کتاب "دینی تعلیم" کو مولانا سید قلبی حسین رضوی نے اردو زبان میں اپنے ترجمہ سے آراستہ کیا ہے جس کے لئے ہم دونوں کے شکر گزار ہیں اور مزید توفیقات کے آرزومند ہیں، اسی منزل میں ہم اپنے تمام دوستوں او رمعاونیں کا بھی صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ جنھوں نے اس کتاب کے منظر عام تک آنے میں کسی بھی عنوان سے زحمت اٹھائی ہے، خدا کرے کہ ثقافتی میدان میں یہ ادنی جہاد رضائے مولی کا باعث قرار پائے۔

والسلام مع الاکرام

مدیر امور ثقافت، مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام

دینی معلومات

لفظ "دین" کثیر الاستعمال الفاظ میں سے ایک ہے ـ عام طورپر دیندار اسے کہتے ہیں جو کائنات کے لئے ایک خداکا قائل ہو اور اس کی خوشنودی کے لئے خاص قسم کے اعمال بجا لاتا ہو۔

ممکن ہے ہر معاشرے اور ملت میں ، قانون کے مطابق معاشرہ کے ہر فرد کے لئے فرائض معین ہوئے ہوں ، اور ان پر لوگ عمل کرتے ہوں، تو یہ تصور کیا جائے کہ وہاں پھر "دین" کی ضرورت نہیں ہے ، لیکن اسلام کے احکام اور ضوابط پر سنجیدگی سے غور کرنے سے اس معنی کے خلاف ثابت ہوتا ہے ، کیونکہ دین اسلام صرف خدا کی عبادت و ستائش تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس میں انسان کے تمام انفرادی و اجتماعی مسائل کے لئے جامع قواعد و ضوابط اور مخصوص قوانین وضع کئے گئے ہیں اور بشریت کی وسیع دنیا کے بارے میں حیرت انگیز صورت میں تحقیق کی گئی ہے۔ اور انسان کی ہر انفرادی و اجتماعی حرکت و سکون کے لئے مناسب قوانین وضع کئے گئے ہیں ـ ایسے دین کو تکلفاتی اور رسمی دین سے تشبیہ یا نسبت نہیں دی جا سکتی ہے ـ

خدائے متعال نے قرآن مجید میں دین اسلام کو مذکورہ بیان شدہ کیفیت میں توصیف فرمائی ہے اور اس کے علاوہ یہودیت و نصرانیت کوکہ جن کی آسمانی کتابیں توریت و انجیل ہیں اور ان میں اجتماعی احکام وقواعدوضوابط ہیں ـ اسی صورت میں بیان فرمایا ہے، چنانچہ فرماتا ہے:

(وکیف یُحکّمو نکَ وعندھم التّوراۃ فیھا حکم اللہ انّا انزلنا التوراۃ فیھا ھدیً وّ نور یحکم بھا النبیّون الّذین اسلموا للّذین ھادوا والرّبّنیون والاحبار.وقفینا علی أثارھم بعیسیٰ ابن مریم وء اتینہ الانجیل فیہ ھدی وّنور و مصدقاً لما بین یدیہ من التوراۃ و ھدی وّ موعظۃ للمتّقین و لیحکم اھل الانجیل بما انزل اللہ فیہ و انزلنا الیک الکتٰب بالحق مصد قاً لما بین یدیہ من الکتب ومھیمنا علیہ فاحکم بینھم بما انزل اللّہ) (مائدہ۴۳ـ۴۸)

" اوریہ کس طرح آپ سے فیصلہ کرائیں گے جب کہ ان کے پاس توریت موجود ہے جس میں حکم خدا بھی ہے... بیشک ہم نے توریت کو نازل کیاجس میں ہدایت اور نور ہے اور اس کے ذریعہ اطاعت گزار انبیاء یہودیوں کے لئے فیصلہ کرتے ہیں اور اللہ والے علماء یہود... اور ہم نے انھیں انبیاء کے نقش قدم پر عیسی بن مریم کو چلایا۔...اور ہم نے انھیں انجیل دیدی جس میں ہدایت اور نور تھا اور وہ اپنے سامنے کی توریت کی تصدیق کرنے والی اورہدایت تھی اور صاحبان تقوی کے لئے سامان نصیحت تھی... اہل انجیل کو چاہئے کہ خدانے جو حکم نازل کیا ہے اس کے مطابق فیصلہ کریں ـ...اور اے پیغمبر!ہم نے آپ کی طرف کتاب نازل کی ہے جو اپنے پہلے کی توریت اور انجیل کی مصداق اور محافظ ہے لہذا آپ ان کے درمیان تنزیل خدا کے مطابق فیصلہ کریں"

توریت اور انجیل۔ جو اس وقت یہودو نصاری کے ہاتھ میں ہیں۔ بھی اسی مطلب کی تائید کرتی ہیں، کیونکہ توریت میں بہت سے قوانین اور تعزیراتی ضوابط موجودہیں اورظاہری طورپرانجیل بھی توریت کی شریعت کی تائید وتصدیق کرتی ہے۔

نتیجہ

مذکورہ بیان سے واضح ہوتا ہے کہ "قرآن مجید کی اصطلاح میں دین "کہ وہی زندگی کی روش ہے، اور اس سے انسان پہلو تہی نہیںنکر سکتا ۔دین اور ایک اجتماعی قانون کے درمیان جو فرق پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ دین خدا کی طرف سے ہوتا ہے اور اجتماعی قانون لوگوں کے افکار کی پیداوار ہوتا ہے ۔دوسرے الفاظ میں دین لوگوں کی اجتماعی زندگی اور خدائے متعال کی پرستش اور اس کی فرمانبرداری کے درمیان ایک ربط پیدا کرتا ہے ، لیکن اجتماعی قانون میں اس رابط کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی ہے۔

خدا کے قانون سے رابط کا اچھا اثر

"دین"انسان کی اجتماعی زندگی اور خدائے متعال کی پرستش کے درمیان رابطہ پیدا کرنے کے نتیجہ میں انسان کے تمام انفرادی و اجتماعی اعمال کو خدائی ذمہ داری قرار دے کر اس کو خدا کے لئے جواب دہ جانتا ہے ۔چونکہ خدائے متعال اپنی لامحدود قدرت اور بے پناہ علم کی بنا پر ہر جہت سے انسان پر احاطہ رکھتا ہے اور اس کے دل ودماغ کے تمام اسرار و افکار سے مکمل طور پر آگاہ ہے اور اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے، اسی لئے دین نے بشری قانون کی طرح امور کے نظم و نسق کو باقی رکھنے کے لئے محافظ اور نگہبان مقرر کئے ہیں اور مخالفت و سرکشی کرنے والوں کی سزا کے لئے قوانین وضع کر کے بشری قانون کی نسبت ایک اور امتیاز حاصل کیاہے اور وہ یہ کہ :دین، انسان کی حیرت اور ہوشیاری کی باگ ڈور کو ایک باطنی و ابدی محافظ کے ہاتھ میں دیتا ہے۔کیونکہ دین سے نہ غفلت ہوتی ہے اور نہ خطا اور اس کی جزا اور سزا سے کوئی بچ نہیں سکتا ۔خدائے متعال فرماتا ہے:

(وهو معكم اين ما كنتم) (حدید٤)

"اور تم جہاں بھی ہو ،وہ تمہارے ساتھ ہے"

(والله بمايعملون محيط) (انفال٤٧)

"اور اللہ ان کے کام کا احاطہ کئے ہوئے ہے"

(وانكلا لما ليوفينهم ربّك اعمالهم) (ہود١١١)

"اور یقینا تمہارا پروردگار سب کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے گا۔"

اگر ہم قانون کے دائرہ میں زندگی کرنے والے کے حالات کادین کے دائرہ میں زندگی کرنے والے کے حالات سے موازنہ کریں گے تو دین کی برتری واضح اور روشن ہو جائے گی ۔کیونکہ جس معاشرے کے تمام افراد متدین ہوں اور اپنے دینی فرائض کو انجام دیں، ہر حالت میں خدائے متعال کو اپنے کاموں میں حاضر وناظر جانیں ،تو وہ ایک دوسرے سے بد ظن نہیںہوتے ہیں ۔

اس لئے ایسے ماحول میں زندگی کرنے والے عوام الناس، ایک دوسرے کی زبان اور ہاتھ سے محفوظ رہتے ہیں اور نہایت ہی آرام و مسرت کی زندگی گزارتے ہیں اور انھیں کوابدی سعادت نصیب ہوتی ہے۔ لیکن جس ماحول میں صرف بشری قانون کی حکمرانی ہوتی ہے وہاں پر، جب تک لوگ اپنے کام پر کسی کو نگراں محسوس کرتے ہیں اس وقت تک وہ کام میں کوتاہی نہیں کرتے، ورنہ ممکن ہیکہ وہ ہر طرح کی کوتاہی کے مرتکب ہوں۔

جی ہاں، اخلاق کے پابند معاشرے میں، جو دلی سکون پایا جاتا ہے، وہ اسی دین کا مرہون منت ہوتا ہے نہ کہ قانون کا۔

دوسرے الفاظ میں، دین، ایسے عملی و اخلاقی عقائد وضوابط کا مجموعہ ہے، جسے انبیاء خدا کی طرف سے انسان کی راہنمائی اورہدایت کے لئے لائے ہیں۔ ان عقائد کو جاننا اور ان احکام پر عمل کرنا انسان کے لئے دونوں جہانمیں سعادت کا سبب بنتا ہے
۔

اگر ہم دیندار ہوں اور خدا و پیغمبر ﷺ کے احکام کی اطاعت کریں تو اس ناپائدار دنیا میں بھی خوش قسمت اوردوسری دنیا کی ابدی اور لامحدود زندگی میں بھی سعادت مند ہوں گے۔

وضاحت: ہم جانتے ہیں کہ سعادت مند وہ شخص ہے جس نے اپنی زندگی اشتباہ اور گمراہی میں نہ گزاری ہو، اس کے اخلاق پسندیدہ ہوں اور نیک کام انجام دیتا ہو۔ خدا کا دین ہمیں اسی سعادت اور خوش بختی کی طرف ہدایت کرتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ:

اولاً: جن صحیح عقائد کو ہم نے اپنی عقل و شعور سے درک کیا ہے، انھیں مقدس و محترم جانیں۔

ثانیاً: ہم پسندیدہ اخلاق کے مالک ہوںاور حتی الامکان اچھے اور شائستہ کام انجام دیں، اس بناء پر دین تین حصوں میں تقسیم ہو تا ہے:

۱۔ عقائد

۲۔ اخلاق

۳۔ عمل

۱۔ عقائد

اگر ہم اپنی عقل و شعور کی طرف رجوع کریں تودیکھیں گے کہ اس عظیم اور وسیع کائنات کی ہستی، اس حیرت انگیز نظام کے ساتھ، خودبخود وجود میں آنا۔ اور اس کا اول سے آخر تک کانظم و نسق، کسی منتظم کے بغیر ہونا ممکن نہیں ہے۔ یقینا کوئی خالق ہے، جس نے اپنے لامحدود علم وقدرت سے اس عظیم کائنات کوپیدا کیا ہے اور تمام امور میں پائے جانے والے ثابت وناقابل تغیر

قوانین کے ذریعہ کائنات کے نظام کو انتہائی عدل و انصاف کے ساتھ چلایا ہے ۔کوئی بھی چیز عبث خلق نہیں کی گئی ہے اور کوئی بھی مخلوق خدائی قوانین سے مستثنیٰ نہیں ہے ۔

لہذا یہ باور نہیں کیا جاسکتا ہے کہ، ایسا مہربان خدا، جو اپنی مخلوق پر اس قدر مہربان ہے، انسانی معاشرے کو انسان جو زیادہ ترنفسانی خواہشات کا اسیر بن کر، گمراہی اور بدبختی سے دوچار ہوتا ہے ۔کی عقل کے رحم و کرم پر چھوڑدے ۔

اس بناپر، معصوم انبیاء کے ذریعہ بشر کے لئے ایسے قواعد و ضوابط کا بھیجنا ضروری ہے تاکہ ان پر عمل کر کے انسان سعادت و خوش بختی تک پہنچ جائے ۔

چونکہ پروردگار کے احکام کی اطاعت کی جزا اس دنیا کی زندگی میں مکمل طور پر ظاہر نہیں ہو سکتی ، لہذا ایک دددوسرے جہان کا ہونا ضروری ہے کہ جہاں پرلوگوں کا حساب و کتاب ہو، اگر کسی نے نیک کام انجام دیا ہے تو اسے اس کی جزا ملے اور اگر کسی سے کوئی براکام سرزد ہوا ہو تو اسے اس کی سزا ملے ۔

دین ، لوگوں کو ان اعتقادات اوردیگر تمام حقیقی عقائد ۔جن کو ہم بعد میں تفیصل سے بیان کریں گے ۔کی طرف تشویق کرتا ہے اور انھیں جہل وبے خبری سے پرہیز کرنے کی تاکید کرتا ہے۔

۲۔ اخلاق

دین،کا ہم سے مطالبہ یہ ہے کہ زندگی میں پسندیدہ صفات اختیار کریں اور اپنے آپ کو قابل ستائش اورنیک خصلتوں سے آراستہ کریں ۔ہم فرض شناس، خیر خواہ، انسان دوست، مہربان ، خوش اخلاق اور انصاف پسند بن کر حق کا دفاع کریں ۔اپنے حدوداور حقوق سے آگے نہ بڑھیںاور لوگوں کے مال ،عزت ،آبرو اورجان پر تجاوز نہ کریں ۔علم ودانش حاصل کرنے میں کسی بھی قسم کے ایثار اور فداکاری سے دریغ نہ کریں، خلاصہ یہ کہ اپنی زندگی کے تمام امور میں عدل وانصاف اور اعتدال کو اپنا شیوہ قرار دیں ۔

۳۔ عمل

دین ، ہمیں یہ حکم دیتا ہے کہ ہم اپنی زندگی میں وہ کام انجاں دیں جن میں ہماری اپنی اور اپنے معاشرے کی خیر وصلاح ہو ۔اورفساد وتباہی مچانے والے کاموں سے پرہیز کریں۔ اس کے علاوہ دین ہمیں یہ بھی حکم دیتا ہے کہ خدائے متعال کی عبادت وپرستش کے عنوان سے کچھ اعمال جیسے نماز، روزہ وغیرہ ۔جو بندگی اور فرمانبرداری کی نشانی ہے۔کو بجا لائیں۔

یہ وہ قواعد وضوابط اور احکام ہیں ،جنھیں دین لے کر آیا ہے اور ہمیں ان کی طرف دعوت دیتا ہے ۔چنانچہ واضح ہے کہ ان ضوابط اور احکام میں سے کچھ کا تعلق عقیدہ سے کچھ کا اخلاق سے اور کچھ کا عمل سے ہے ، جیسا کہ بیان ہوچکا ہے کہ ان کو قبول کرنا

اور ان پر عمل کرنا ہی انسان کے لئے سعادت و خوش بختی ہے، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ انسان کے لئے سعادت حاصل کرنا ممکن نہیں ہے مگر یہ کہ حقیقت شناس ہو اور پسندیدہ اخلاق و اعمال پر بنی زندگی بسر کرے۔

دین کا فطری ہون

انسان اپنی فطرت اورخداداد طینت کے لحاظ سے دین کا خواہاں ہے، کیونکہ انسان اپنی زندگی کے سفر میں سعادت حاصل کرنے کے لئے مسلسل ہاتھ پائوں مارتا ہے اور اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ان اسباب ووسائل سے استفادہ کرتا ہے جواس کے مقاصد میں مؤثرہیں ،بیشک وہ ہمیشہ ایسے سبب کی تلاش میں ہوتاہے جو مؤثر ہو اور وہ ناکام نہ ہو۔دوسری طرف ہم عالم طبیعت میں کوئی ایسا سبب نہیں پاتے ہیں جس کا اثر دائمی ہو اور وہ کبھی رکاوٹوں کے مقابلہ میں ناکام نہ ہو۔

انسان فطرت کے مطابق اپنی سعادت کے لئے ایک ایسا سبب چاہتا ہے جو ناکام نہ ہو اور ایک ایسا پشت پناہ بھی چاہتا ہے کہ جو کبھی ساتھ نہ چھوڑے تاکہ اپنی زندگی کو اس سے منسلک کردے اور باطنی آرام وسکون حاصل کرسکے، حقیقت میں دین بھی یہی چاہتاہے۔ کیونکہ صرف خدائے متعال ہے جو اپنے ارادہ میں ہرگز مغلوب وناکام نہیں ہوتا ہے اور عذر و قصور اس کے لئے قابل تصور نہیں ہے، اور خدائے متعال سے مربوط زندگی کے طریقوں کا نام ہی "دین اسلام ہے"۔

اس بناء پریہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان کی فطری خواہش ،دین کے تین بنیادی اصولوں توحید، نبوت اور معاد کو ثابت کرنے کے بہترین دلائل میں سے ایک ہے، کیونکہ فطری ادراک دوستی اور دشمنی کے مفہوم کو مخلوط نہیں کرتا ہے اور تشنگی کو سیراب نہیں سمجھتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ بعض اوقات انسان یہ تمنا کرتا ہے کہ پرندے کے مانند اس کے بھی پر ہوتے تاکہ پرواز کرتا یا ایک ستارہ کے مانند آسمان پر ہوتا اور طلوع وغروب کرتا ، لیکن ان کی حقیقت محض ایک تصور ہے یہ اور بات ہے کہ انسان دل کی گہرائیوں سے اپنی سعادت، مطلق راحت وسکون یا انسانی تقاضوں کی بناپر وہ سنجیدہ زندگی کی خاطر ایک پناہ گاہ کی تلاش میں ہے اور ہرگز اس سے منہ نہیں موڑتا ہے۔

اگر کائنات میں ناقابل مغلوب سبب (خدا)نہ ہوتا تو انسان اپنی بے آلائش طبیعت سے اس کی فکر میں نہیں پڑتا اور اگر مطلق وآرام (جو آخرت کا سکون وآرام ہے)کا وجود نہ ہوتاتو انسان فطری طورپر اس کو پانے کی فکر ہی نہ کرتا اور اگر دینی طریقہ(جو نبوت کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے) حق نہ ہوتا ،تو انسان کے باطن میں اس کی تصویر بھی نہ ہوتی ۔

انسان مختلف قسم کی جسمانی و روحانی ،مادی ومعنوی ضرورتیں رکھتا ہے کہ جس کو اجتماعی زندگی کے ذریعہ دور کیا جا سکتا ہے اور انسانی معاشرے کا ہر فرد عام وسائل کو استعمال کرکے، کسی رکاوٹ کے بغیر، اس دنیا کی چند روزہ زندگی کو آرام وآسائش میں گزارتا ہے اور دوسری دنیا کے لئے زاد راہ حاصل کرتا ہے،پس انسانی معاشرے میں ایک ایسا قانون نافذ ہونا چاہئے جو خالق کائنات کے ارادہ کے مطابق اور فطرت و خلقت سے ہم آہنگ ہو۔ اس قانون کے مطابق ہر ایک کو اپنی جگہ پر قرار پانا چاہئے اور معاشرے میں اپنی قدرو منزلت کے مطابق اس سے استفادہ کرے اور دوسروں کے حقوق پر تجاوز کرنے سے پرہیز کرے آخر کار معاشرے کے

تمام لوگ خدائے متعال کے ارادہ کے سامنے تسلیم ہو جائیں اور سب آپس میں بھائی بھائی اور حق وانصاف کے مقابلہ میں برابر ہو جائیں ۔

دین کے فائدے

مذکورہ بیانات سے ثابت ہوگیا کہ فرداور معاشرے کی اصلاح میں دین ایک گہرا اثر رکھتاہے بلکہ یہ سعادت ونیک بختی کا منفرد وسیلہ ہے ۔جو معاشرہ دین کا پابند نہ ہو وہ حقیقت پسندی اورجدت فکرسے محروم ہے ، ایسے معاشرے کے لوگ اپنی قیمتی زندگی کو گمراہی اور ظاہرداری میں گزارتے ہیں ، عقل کو پامال کر کے حیوانوں کی طرح تنگ نظری اور بیوقوفی میں زندگی گزارتے ہیں اور اخلاقی انحطاط اورکردار کی پستی کا شکار ہوتے ہیں اور اس طرح انسانی خصوصیات و امتیازات سے محروم ہوجاتے ہیں ۔

اس قسم کا معاشرہ ،علاوہ اس کے کہ ابدی اور انتہائی کمال وسعادت تک نہیں پہنچتا ہے،اس دنیا کی ، اپنی مختصر اورناپائدار زندگی میں بھی انحرافات اورگمراہیوں کے منحوس نتائج سے دوچار ہوتا ہے اور کسی نہ کسی وقت اپنی غفلت کے برے نتائج کو بھگتے گا اور واضح طورپر اسے معلوم ہو گا کہ سعادت کا راستہ دین ہی تھا اورسرانجام اپنے کردارسے پشیمان ہو گا۔ خدائے متعال قرآن مجید میں فرماتا ہے:

(قد افلح من زکّھٰاوقد خاب من دسّھا) (شمس۹۔۱۰)

"بیشک وہ کامیاب ہو گیا جس نے نفس کو پاکیزہ بنالیا.اوروہ نامرادرہا جس نے اسے آلودہ کرلیا "

البتہ جاننا چاہئے کہ جس چیز سے انسان کی سعادت اورفردو معاشرے کی خوش بختی وابستہ ہے ،وہ دینی ضوابط پر عمل کرنا ہے ۔صرف نام سے کام نہیں چلتا،کیونکہ جس چیزکی اہمیت و قیمت ہے وہ خود حقیقت ہے نہ حقیقت کا دعویٰ۔جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے لیکن اس کا باطن تاریک ہے اوروہ اخلاقی طورپر گراہوا اور بدکردار ہے،اس کے باوجود سعادت کے فرشتہ کا منتظر ہے،تو اسکی مثال اس بیماری کی جیسی ہے جو طبیب کے نسخہ کو جیب میں رکھ کر صحت یابی کی توقع رکھتا ہے، یقینا ایسا انسان اس فکرکے ساتھ منزل مقصودتک نہیں پہنچ سکتا ہے ۔خدائے متعال اپنے کلام میں فرماتا ہے:

(انّ الذّین ء امنوا والّذین ھادوا والنّصٰارٰی والصّٰائبین من اٰمن باللہ و الیوم الاخر و عمل صٰالحاً فلھم اجرھم عند ربّھم) (بقرہ٦٢)

"جو لوگ بظاہر ایمان لائے یا یہودی ،نصاریٰ اور صابیئن[1] ہیں ان میں سے جو واقعی اللہ اور آخرت پر ایمان لائے گا اس کے لئے پروردگار کے یہاں اجر وثواب ہے..."

ممکن ہے اس آیہ شریفہ کے مضمون سے یہ تصور کیا جائے کہ جو لوگ خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال انجام دئے ہوں، اگرچہ انہوں نے تمام پیغمبروں یا بعض پیغمبرونکو قبول بھی نہ کیا ہو، تب بھی وہ نجات پائیں گے۔ لیکن جاننا چاہیئے کہ سورہ نساء کی آیت نمبر ۱۵۰ اور ۱۵۱ میں پروردگار عالم ان لوگوں کو کافر جانتا ہے جو تمام پیغمبروں یا بعض پیغمبروں پر ایمان نہ رکھتے ہوں۔

تاریخ ادیان کا ایک خلاصہ

ادیان کے وجود میں آنے کے بارے میں اجمالی تحقیق، مطمئن ترین راہ۔ جس پر دینی نقطہ نگاہ سے اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ قرآن مجید ہی کا بیان ہے، کیونکہ یہ ہر قسم کی خطا، اشتباہ، تعصب اور خود غرضی سے منزہ و پاک ہے۔

(انّ الدّین عند اللہ الا سلام ...) (آل عمران ۱۹)

"دین خدا، دین اسلام ہی ہے"

جو انسان کی پیدائش کے پہلے ہی دن سے اس کے ساتھ تھا، جیسا کہ قرآن مجید میں تاکید ہوئی ہے کہ، بشر کی موجودہ نسل کی ابتداء میں دو شخص ایک مرد اور ایک عورت تھے۔ مرد کا نام "آدم" اور اس کی بیوی کا نام "حوا" تھا۔ حضرت آدم پیغمبر تھے اور ان پر وحی نازل ہوتی تھی۔ حضرت آدم کا دین بہت سادہ اور چند کلیات پر مشتمل تھا، جیسے، لوگوں کو خدا کو یاد کرنا چاہیئے اور آپس میں، خاص کر اپنے والدین کے ساتھ احسان و نیکی کرنا چاہیئے، فساد، قتل اور برے کاموں سے پرہیز کرنا چاہے۔

آدم اور اُن کی بیوی کے بعد، ان کی اولاد انتہائی سادگی اور اتفاق و اتحاد کے ساتھ زندگی گزارتی تھی، چونکہ دن بدن ان کی آبادی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا، لہذا رفتہ رفتہ انہوں نے اجتماعی زندگی اختیار کرلی۔

اس طرح وہ بتدریج زندگی کے طور طریقوں کو سیکھتے تھے اور تہذیب و تمدن سے قریب ہوتے تھے۔ چونکہ آبادی بڑھتی گئی اس لئے وہ مختلف قبیلوں میں تقسیم ہو گئے اور ہر قبیلہ میں کوئی نہ کوئی بزرگ پیدا ہوتا تھا اور قبیلہ کے لوگ اس کا احترام کرتے تھے، یہاں تک کہ اس کے مرنے کے بعد اس کا مجسمہ بنا کر اس کا احترام و ستائش کرتے تھے۔ اسی زمانہ سے لوگوں میں بت پرستی کا رواج پیدا ہوا، چنانچہ ائمہ علیہم السلام کی روایتوں میں آیا ہے کہ بت پرستی اسی طرح شروع ہوئی ہے اور بت پرستی کی تاریخ بھی اسی بات کی تائید کرتی ہے۔ رفتہ رفتہ طاقتور افراد کمزوروں اور ضعیفوں پر زیادتی کرنے لگے اور اسطرح لوگوں میں اختلاف پیدا ہوتا چلا گیا۔ اور یہ اتفاقی طور پر پیدا ہونے والے اختلافات ان کی زندگی میں گوناگوں کشمکش اور لڑائی جھگڑے پیدا کرنے کا سبب بنے۔

یہ اختلافات ۔جو انسان کو سعادت کی راہ سے منحرف کر کے بد بختی اور ہلاکت کی طرف لے جاتے تھے ۔اس امر کا سبب بنے کہ خدائے مہربان نے کچھ انبیاء کو منتخب کرکے آسمانی کتاب کے ساتھ بھیجا تا کہ انسان کے اختلافات کو دور کریں ،چنانچہ خدائے متعال اپنے کلام میں فرماتا ہے:

(كان النّاس امّة واحدة فبعث الله النبيّن مبشّرين و منذرين وانزل معهم الكتٰب بالحق ليحكم بين النّاس فيما اختلفوا فيه) (بقرہ۲۱۳)

"(فطری اعتبار سے)سارے انسان ایک قوم تھے ۔پھر اللہ نے بشارت دینے والے اور ڈرانے والے انبیاء بھیجے اور ان کے ساتھ برحق کتاب نازل کی تاکہ لوگوں کے اختلافات کا فیصلہ کریں"

دین اسلام اور اس کی آسمانی کتاب

دین اسلام ، ایک عالمی اور ابدی دین ہے۔اس میں اعتقادی ، اخلاقی اور عملی ضوابط کے امور کا ایک سلسلہ ہے جن پر عمل پیرا ہونے سے انسان دنیا وآخرت کی سعادت وخوش بختی حاصل کرتا ہے ۔

دین اسلام کے قواعد وضوابط ۔جو خالق کائنات کی طرف سے بھیجے گئے ہیں ۔ایسے ہیں کہ اگر انسانی معاشرے کا کوئی فرد یا انسانی معاشروں میں سے کوئی معاشرہ ان پر عمل کرے تو اس کے لئے زندگی کے بہترین شرائط اور ترقی یافتہ ترین انسانی کمال حاصل ہو سکتے ہیں ۔

دین اسلام،کے نیک آثار ہر فرد اور ہر معاشرے کے لئے مساوی ہیں اور چھوٹے بڑے، عالم و جاہل،مرد وعورت، سفید فام و سیاہ فام اور مشرقی و مغربی، بلا استثناء اس مقدس دین کے فوائد اور خوبیوں سے فیضیاب ہو سکتا ہے ، اور اپنی ضرورتونکو اچھی طرح پورا کر سکتا ہے ۔

دین اسلام نے اپنے معارف و ضوابط کو فطرت کی بنیاد پر استوار کیا ہے اور انسان کی ضرورتوں کو مد نظر رکھا ہے ، اور ان کو پورا کرتا ہے اور انسان کی فطرت اور ساخت بھی مختلف افراد، نسلوں اور متعدد زمانوں میں یکساں ہے ، اس لحاظ سے واضح ہے کہ انسانی معاشرہ مشرق سے لے کر مغرب تک ایک ہی قسم کا خاندان ہے اور وہ انسانی ساخت کے اصول وارکان میں آپس میں شریک ہیں اور مختلف افراد اور نسلوں کی ضرورتیںبھی مشابہ ہیں اور بشر کی آنے والے نسلیں بھی اسی خاندان کی اولاد ہیں اور یقینا انہی کے وارث بنیںگےاوراُن کی ضرورتیںانہی کی ضرورتیں جیسی ہونگی۔

نتیجہ کے طور پر، اسلام ایک ایسا دین ہے جو انسان کی واقعی اور فطری ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اور سبھی کے لئے کافی اور ابدی ہے۔

اسی لئے خدائے متعال نے اسلام کودین فطرت کا نام دیا ہے اور لوگوں کو انسانی فطرت کو زندہ رکھنے کی دعوت دیتا ہے اور دین کے بزرگوں نے فرمایا ہے:

"اسلام ایک آسان دین ہے جو انسان پر میں سختی نہیں کرتا۔"

خدائے متعال نے دین اسلام کوفطرت کی بنیادپر بنایا ہے لہذا اس کی کلیات سبھی کے لئے قابل فہم ودرک ہیں، لیکن پھر بھی اس نے اس کے اصلی معارف وضوابط کی بنیادوں کو پیغمبرا کرم حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پرنازل ہونے والی آسمانی کتاب "قرآن مجید" میں فرمایاہے۔ دین مقدس اسلام، آخری آسمانی دین ہے اس لئے یہ مکمل ترین دین ہے۔ اس دین کے آنے کے بعدگذشتہ دین منسوخ ہوگئے، کیونکہ کامل دین کے ہوتے ہوئے ناقص دین کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دین اسلام ہمارے پیغمبرحضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ بشر کے لئے بھیجا گیا ہے۔ نجات اورسعادت کا یہ دروازہ دنیا کے لوگوں کے لئے اس وقت کھولاگیا جب انسانی معاشرہ اپنی فکری ناتوانی کے دور سے گزر رہاتھااور انسانیت کے کمال کو حاصل کرنے کے لئے مکمل طورپرآمادہ ہوچکا تھا اور الٰہی معارف اور اس کے بلند مطالب کو حاصل کرنے کی لیاقت پیدا کر چکا تھا۔ اسی لئے اسلام حقیقت پسندانسان کے لئے قابل فہم حقائق ومعارف اورپسندیدہ اخلاق لیکرآیا۔ جو انسان کا امتیاز ہے، اور انسان کی زندگی کے انفرادی و اجتماعی کاموں کو منظم کرنے والے ضوابط، لائے اور ان پر عمل کرنیکی نصیحت کی۔

ہم سب جانتے ہیں کہ دین اسلام کے معارف کلی طورپرتین حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں: "اصول دین، اخلاق اورفروع فقہی" نیزواضح رہے کہ اصول دین، یعنی دین کی اصلی بنیادیں، تین ہیںاور اگرانسان میں ان میں سے کوئی ایک نہ پائی جائے تو وہ دین سے خارج ہو جاتا ہے:

۱۔ توحید، یعنی خداکی وحدانیت پر عقیدہ رکھنا۔

۲۔ انبیاء کی نبوت پر عقیدہ رکھنا، جن کے آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ ۳۔ معادپر ایمان، یعنی یہ عقیدہ ہوکہ، خدائے متعال مرنے کے بعد سبھی کوزندہ کرے گاان کے اعمال کاحساب لے گا۔ نیک لوگوں کو نیکی کی جزااوربرے لوگوں کوسزادے گا۔ مذکورہ تین اصولوں میں مزیددواصول اضافہ کئے جاتے ہیںجو مذہب شیعہ کے مخصوص عقائدہیں کہ جن کے نہ پائے جانے پر انسان شیعہ مذہب سے خارج ہوتا ہے، اگرچہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا اور وہ دو یہ ہیں:

۱۔ امامت

۲۔ عدل

۱۔ جنہوں نے مجوسی مذہب سے یہودی مذہب کی طرف تمائل پیدا کر کے مجوسیت اوریہودیت سے ایک درمیانی دین ایجاد کیا، انھیں صابئین کہتے ہیں۔

دین، قرآن مجید کی نظر میں

(ان الدّین عند اللہ الاسلام وماختلف الّذین اوتوا الکتاب الاّ من بعد ما جآ ء ھم العلم بغیاً بینھم و من یکفر بایٰات اللہ فا ن اللہ سریع الحساب) (آل عمران۱۹)

"دین، اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے اور اہل کتاب نے علم آنے کے بعد ہی جھگڑا شروع کیا صرف آپس کی شرارتوں کی بناپر اور جو بھی آیات الٰہی کا انکار کرے گاتو خدابہت جلد حساب کرنے والا ہے۔"

انبیاء نے جس دین کی طرف لوگوں کودعوت دی ہے وہ خداپرستی اور اس کے احکام کے مقابلہ میں تسلیم ہونا ہے۔ادیان کے علمائ،باوجود اس کے کہ حق کی راہ کو باطل سے تشخیص دیتے تھے، تعصب ودشمنی کی وجہ سے حق سے منحرف ہوکرہر ایک نے ایک الگ راستہ اختیار کیا ،اور نتیجہ کے طورپر دنیا میں مختلف ادیان وجود میں آگئے ۔حقیقت میں لوگوں کے اس گروہ نے آیات الٰہی کی نسبت کفر اختیار کیا ہے اور خدائے متعال ان کے اعمال کی جلد ہی سزا دے گا:

(ومن یبتغ غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منہ وھو فی الاخرۃ من الخٰاسرین) (آل عمران ۸۵)

"اور جو اسلام کے علاوہ کوئی بھی دین تلاش کرے گاتو وہ دین اس سے قبول نہ کیا جائے گا اور وہ قیامت کے دن خسارہ والوں میں ہوگا۔"

(یا ایّھا الذین ء آمنوا ادخلوا فی السّلم کافّۃً ولا تتّبعوا خطوات الشیطان انہ لکم عدوّمّبین) (بقرہ۲۰۸)

"ایمان والو!تم سب مکمل طریقہ سے اسلام میں داخل ہو جائو اور شیطانی اقدامات کا اتباع نہ کرو وہ تمہاراکھلا ہوا دشمن ہے۔"

(واوفوا بعھد اللہ اذاعٰاھد تمّ ولا تنقضوا الایمٰان بعد توکیدھٰا وقد جعلتم اللہ علیکم کفیلا ان اللہ یعلم ماتفعلون) (نحل ۹۱)

" اور جب کوئی عہد کرو تو اللہ کے عہد کوپورا کرو اور اپنی قسموں کوان کے استحکام کے بعدہر گز مت توڑو جب کہ تم اللہ کو کفیل اور نگران بنا چکے ہو کہ یقینا اللہ تمہارے افعال کو خوب جانتا ہے۔"

اس آیۂ شریفہ کا مقصد یہ ہے کہ، مسلمان جو بھی عہد وپیمان خدایا بندوں سے کریں ،انھیں اس پر عمل کرنا چاہئے اور اسے نہ توڑیں ۔

(ادع الی سبیل ربّک بالحکمۃوالموعظۃ الحسنۃ وجٰادلھم بالّتی ھی احسن ان ربّک ھو اعلم بمن ضلّ عن سبیلہ وھو اعلم بالمھتدین) (نحل ۱۲۵)

"آپ اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ دعوت دیں اور ان سے اس طریقہ سے بحث کریں جو بہترین طریقہ ہے کہ آپ کا پروردگار بہتر جانتا ہے کہ کون اس کے راستہ سے بہک گیا ہے اور کون لوگ ہدایت پانے والے ہیں ۔"

مقصد یہ ہے کہ،دین کی ترقی کیلئے مسلمان کوہر ایک کے ساتھ اس کی عقل و فہم کے مطابق اس کے لئے مفید ہو ، اور اگر دلیل و برہان اور نصیحت سے کسی کی راہنمائی نہ کر سکا ،تو جدل (جو کہ مطلب کو ثابت کرنے کا ایک طریقہ ہے) کے ذریعہ اس کو حق کی طرف دعوت دے۔

(واذا قری القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلّکم ترحمون)

(اعراف۲۰٤)

"اور جب قرآن کی تلاوت کی جائے تو خاموش ہو کر غور سے سنو شاید تم پر رحمت نازل ہوجائے ۔"

(یا ایّها الّذینء امنوا اطیعوا الله و اطیعوا الرّسول و اولی الامرمنکم فان تنٰازعتم فی شی ءٍ فرُدّوه الی الله و الرّسول ان کنتم تومنون بالله و الیوم الأخر ذلک خیر واحسن تاویلا) (نسائ۵۹)

"ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اور صاحبان امر کی اطاعت کرو جو تمھیںمیں سے ہیں ،پھر اگر آپس میں کسی بات میں اختلاف ہوجائے تو اسے خدا اور رسول کی طرف پلٹادو اگر تم اللہ اورروزآخرت پر ایمان رکھنے والے ہو ،یہی تمہارے حق میں خیر اورانجام کے اعتبار سے بہترین بات ہے۔"

مقصد یہ ہے کہ اسلامی معاشروں میں ، اختلاف دور کرنے کا وسیلہ ،قرآن مجید اور پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے، اور ان دودلیلوں کے ذریعہ ہر اختلاف کو حل کرنا چاہئے اوراگر کسی مسلمان نے عقل سے اختلاف دور کیا، تووہ بھی اس لئے ہے کہ قرآن مجید نے عقل کے حکم کو قبول کیا ہے ۔

(فبما رحمةٍ من الله لنت لهم ولو کنت فظّاً غلیظ القلب لانفضّوا من حولک فاعف عنهم واستغفر لهم و شاورهم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی الله ان الله یحبّ المتوکّلین)

(آل عمران ۱۵۹)

"پیغمبر!یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے نرم ہو ورنہ اگر تم بدمزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے ، لہٰذ تم انھیں معاف کردو ۔ان کے لئے استغفار کرو اور ان سے جنگ کے امورمیں مشورہ کرو اور جب ارادہ کرو تو اللہ پر بھروسہ کرو کہ وہ بھروسہ کرنے والوں کو دوست رکھتاہے"

کیونکہ نیک برتائو ،خیر خواہی اور امورمیں مشورہ کرنا ، انس ومحبت کا وسیلہ ہے اورمعاشرہ کے افراد کو اپنے سرپرست سے محبت کرنی چاہئے تاکہ وہ ان کے دلوں میں نفوذ کرسکے۔ خدائے متعال مسلمانوں کے سرپرست کو خوش اخلاقی اور مشورہ کا حکم دیتا ہے،اوریہ حکم اس لئے ہے کہ ممکن ہے لوگ اپنی سوچ میں غلطی کریں لہذا حکم دیتا ہے کہ مشورت کے بعد اپنے فیصلہ میں آزاد ہو اور اس لئے کہ خدا کے ارادہ سے کوئی مخالفت نہیں کر سکتا ہے ، اپنے امورمیں خداپر توکل کر کے اپنے کام اسی کے سپرد کرے ۔

معاشرے میں دین کا کردار

دین، ایک بہترین روش ہے،جس سے انسانی معاشرہ کو منظم کیا جا سکتا ہے اوریہ دوسری تمام روشوںسے زیادہ لوگوں کو اجتماعی قوانین کی رعایت کرنے پر ابھارتاہے، اور جب ہم ان اسباب و علل کا مطالعہ کرتے ہیں جو ماضی میں انسانی معاشرے کے وجود میں آنے کا سبب بنے ہیں تو یہ حقیقت مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے ۔

انسان زندگی میں اپنی سعادت و کامرانی کے علاوہ کسی چیز کو نہیں چاہتا ہے اور اس کے لئے کوشش کرتا ہے ۔ البتہ یہ سعادت زندگی کے تمام وسائل کی فراہمی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ دوسری طرف انسان اپنے خداداد فہم و شعور سے درک کرتاہے کہ وہ ان تمام ضرورتوںکوتنِ تنہاپورا نہیں کرسکتا کہ جن سے وہ اپنی من پسند سعادت کو حاصل کر سکے۔ واضح ہے کہ زندگی کی تمام ضرورتوں کوپورا کرنا ایک شخص کے بس کی بات نہیں ہے ، خواہ وہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو ۔اس لحاظ سے انسان اپنی ضرورتوں کوپورا کرنے کے لئے اپنے ہی جیسے لوگوںسے مدد لینے پر مجبور ہے تا کہ اپنے ضروری اورحیات آفرین وسائل کو حاصل کر سکے،اس صورت میں کہ ہرایک ان وسایل میں سے کسی ایک کو حاصل کرنے کی ذمہ داری کوقبول کرتاہے اورا سے فراہم کرتا ہے ، اس کے بعد تمام افراد اپنی فعالیتوں کے ماحصل کو ایک جگہ جمع کرتے ہیںاوران میں سے ہر شخص اپنی فعالیت اور حیثیت کے مطابق حصہ لیتا ہے اور اس سے اپنی زندگی کو چلاتا ہے ۔

اس طرح ، انسان اپنی سعادت کوپورا کرنے کے لئے اپنے ہم نوع انسانوں کاتعاون کرتاہے اوراُن سے تعاون لیتاہے ،یعنی مختصریہ کہ تمام لوگ ایک دوسرے کے لئے کام کرتے ہیں اور اس کام کے نتیجہ کوجمع کرتے ہیں اورمعاشرے کاہر فرد اپنی حیثیت اور فعالیت کے مطابق اپنا حصہ لے لیتا ہے ۔

معاشرے کو قوانین کی ضرورت

لوگوں کی محنت و مشقت کا ماحصل چونکہ ایک ہوتا ہے اورسب اس سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں اس لئے معاشرے کوکچھ قوانین کی ضرورت ہے تاکہ ان کی رعایت سے بغاوت اور لاقانونیت کو روکا جا سکے ۔ واضح ہے کہ اگر معاشرے کانظام چلانے کے لئے کچھ ضوابط وقوانین نہ ہوں تو افراتفری پھیلتی ہے اور انسانی معاشرہ اپنی زندگی کوایک دن بھی جاری نہیں رکھ سکتا ۔

البتہ یہ قوانین معاشرے اقوام ، لوگوںکی فکری سطح اور حکومتی دفاتر کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں ۔ بہر حال کوئی بھی ایسا معاشرہ نہیں پایا جاسکتا جوایسے قوانین سے بے نیاز ہو کہ جن کا اکثر افراداحترام کرتے ہوں۔تاریخ بشریت میں ہرگز ایسا کوئی معاشرہ نہیں پایاگیا جس میں کسی قسم کے مشترک آداب ورسوم و قوانین وضوابط نہیں تھے۔

قوانین کے مقابلہ میں انسان کا آزاد ہونا

چونکہ انسان اپنے تمام کام اپنے اختیار سے انجام دیتا ہے ، اس لئے وہ ایک طرح کی آزادی محسوس کرتا ہے اور وہ اس آزادی کو "مطلق "یعنی بدون قیدوشرط تصور کر کے ، مکمل آزادی چاہتا ہے اور ہر قسم کی پابندی سے بھاگتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ ہر طرح کی رکاوٹ و محرومیت سے رنجیدہ ہوتا ہے اور مختصر یہ کہ وہ ہر دھمکی سے اپنے اندر دباؤ اور خاص ناکامی کا احساس کرتا ہے ، اس لحاظ سے اجتماعی قوانین چاہے کتنے ہی کم کیوں نہ ہوں ،چونکہ وہ ایک حدتک انسان کوپابند کرتے ہیں ، لہذا وہ اسکی حریت پسندی کے خلاف ہوں گے۔

دوسری طرف انسان یہ سوچتا ہے کہ اگر معاشر اور اس کے نظم و نسق کے تحفظ کے لئے وضع کئے گئے قوانین کے مقابلہ میں اپنی آزادی سے کسی حدتک دستبردار نہ ہو جائے تو افراتفری پھیل کر اس کی پوری آزادی و آسائش ختم ہو جائے گی ،چنانچہ اگر وہ کسی کے ہاتھ سے ایک لقمہ لے گا تو دوسرے لوگ اس کے ہاتھ سے پورا کھانا چھین لیں گے اور اگر وہ کسی پر ظلم کرے گا تودوسرے بھی اس پر ظلم کریں گے۔

اس لحاظ سے اسے چاہیے کہ اپنی آزادی کے ایک حصہ کو محفوظ رکھے ، اور اس کے دوسرے حصہ سے صرف نظر کرے تو اس طرح وہ اجتماعی قوانین وضوابط کا احترام کرے گا۔

قوانین کی ترقی میں کمزوریاں

مذکورہ مطالب کے پیش نظر، انسان کی آزادپسند ذہنیت اور اجتماعی ضوابط کے درمیان ایک قسم کا ٹکراﺋواورتضاد موجود ہے ۔یعنی قوانین ایک قسم کی زنجیر ہے جو اس کے پاﺋوں میں پڑی ہے اور وہ ہمیشہ اس زنجیر کو توڑنا چاہتا ہے تاکہ اس پھندے سے رہائی پائے اور یہ اجتماعی قوانین کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے جو اس کی بنیادوں کو متزلزل کر دیتا ہے ۔

اسی لئے ہمیشہ قوانین اور عملی فرائض کی خلاف ورزی کرنے والوں کی سزا کے لئے کچھ اور قواعدوضوابط بنائے جاتے ہیں تاکہ لوگوں کو قوانین کی خلاف ورزی کرنے سے روکا جا سکے ، اس سلسلہ میں کبھی لوگوں کو قوانین کی اطاعت کرنے کی تشویق کے لئے انعامات کی امید دلائی جاتی ہے ۔ البتہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ یہ مسئلہ (یعنی سزا کا خوف اور جزا کا شوق) قوانین کے نفاذ میں کسی حدتک مدد کرتا ہے ۔ لیکن یہ خلاف ورزی کے راستہ کو سو فیصد بند کر کے قانون کے اثر و تسلط کو مکمل طور پر تحفظ نہیں بخش سکتا، کیونکہ تعزیراتی قوانیں بھی دوسرے کارآمد قوانین کے محتاج ہونے کی وجہ سے خلاف ورزی سے محفوظ نہیں ہیں اور انسان کی آزادپسند طبیعت کی طرف سے انہیںہمیشہ خطرہ لاحق رہتا ہے ۔چونکہ جو لوگ مکمل طور پر نفوذ اورطاقت رکھتے ہیں وہ کسی

خوف وہراس کے بغیر کھلم کھلا مخالفت کرسکتے ہیں یا نفوذ کے ذریعہ ،عدلیہ اور انتظامی محکموں کو اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں ۔

جو لوگ نفوذ وطاقت نہیں رکھتے ہیں ،وہ بھی معاشرے کی ہدایت کرنے والوں کی غفلت یا کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مخفیانہ طور پر خلاف ورزی کر سکتے ہیں ،یا رشوت اور سفارش کے ذریعہ یا معاشرے کے بااثر اشخاص کے ساتھ دوستی اور رشتہ داری کے ذریعہ اپنے مقصد تک پہنچ سکتے ہیں اور اس طرح معاشرے کے نظم کو عام حالات سے خارج کرکے ناکارہ بنا سکتے ہیں ۔

اس بات کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ ہم مختلف انسانی معاشروں میں اس قسم کی مخالفتوں اور قانونشکنی کے ہزاروں نمونے روزانہ مشاہدہ کرتے ہیں ۔

قانون میں خامی کا اصلی سرچشمہ

اب دیکھنا چاہئے کہ اس خطرہ کا سرچشمہ کہاں ہے اورانسان کی سرکش اورآزادی پسند طبیعت کو کیسے قابو میں کیا جائے اور نتیجہ میں قانون کی مخالفت کو روکا جائے؟

اس خطرہ کا سرچشمہ۔ جو معاشرے میں فسادبرپاکرنے کا سب سے بڑا سبب ہےیہاں تک کہ قوانین بھی اسے روک نہیں سکتے ۔یہ ہے کہ عام اجتماعی طریقے ،جو قوانین کو وجود میں لاتے ہیں ،کہ جن کا تعلق افراد کے مادی مراحل سے ہے ،وہ ان کی معنویات اور باطنی فطرتوں کی کوئی اعتنا نہیں کرتے اور ان کا مقصد صرف ہما ھنگی اور نظم و نسق کا تحفظ اور لوگوں کے اعمال کے درمیان توازن بر قرار رکھنا ہوتا ہے تاکہ اختلاف اور کشمکش کی نوبت نہ آئے ۔

اجتماعی قانون کا تقاضایہ ہے کہ قانون کی شقوں پر عمل کیا جائے اور معاشرے کے امور کو کنٹرول کیا جائے ۔اس قانون کا انسان کے داخلی صفات اور باطنی جذبات سے کوئی تعلق نہیں ہے ،جو ان اعمال کے محرک اور قوانین کے داخلی دشمن ہیں ۔

اس کے باوجود اگر انسان کی آزادی پسند فطرت اور دوسرے سیکڑوں جبلتوں (جیسے خودخواہی اورشہوت پرستی جومفاسد کے اصلی سبب ہیں)کی طرف توجہ نہ کی جائے تو معاشرے میں افراتفری اورلاقانونیت رائج ہوجائے گی اوراختلافات کادامن روزبروز پھیلتا جائے گا ،کیونکہ تمام قوانین کو ہمیشہ قوی باغیوں اور سرکشوں کے حملہ کا خطرہ لاحق ہوتا ہے جوانہی جبلتوں سے پیدا ہوتے ہیں اور کوئی قانون بُرے کو کنٹرول کرکے اختلافات کو نہیں روک سکتا ہے۔

تمام قوانین پر دین کی ترجیح

قانون کے تحفظ کے لئے آخری طریقہ ،تعزیراتی قوانین وضع کرنا اور محافظ مقرر کرنا ہے لیکن جیسا کہ بیان کیا گیا ، تعزیراتی قوانین اور محافظ انسان کی سرکشی اور دیگر جبلتوں کو روک نہیں سکتے تاکہ اجتماعی قوانین پر عمل ہو سکے۔

دین کے پاس مذکورہ وسائل کے علاوہ مزید دو طاقتور وسیلے بھی موجود ہیں ،جن سے وہ ہر مخالف طاقت کو مغلوب کر کے اسے تہس نہس کر سکتا ہے :

۱۔ہر دین دار فرد دین کی راہنمائی سے اس حقیقت تک پہنچتا ہے کہ اس کی زندگی اس ناپائدار اور گزرجانے والی دنیا کی چند روزہ زندگی تک محدود نہیں ہے ،بلکہ اس کے سامنے ایک ابدی اور لامحدود زندگی ہے ،جو موت سے نابود نہیں ہوتی ۔اس کی ابدی سعادت اورآسائش صرف اس میں ہے کہ وہ پروردگار عالم کی طرف سے اس کے پیغمبروں کے توسط سے بھیجے گئے قوانین کی پیروی کرے ،کیونکہ وہ جانتا ہے کہ دینی قوانین ، ایک ایسے دانا اور بینا پروردگار کی طرف سے بھیجے گئے ہیں ،جو انسان کے باطن وظاہر سے آگاہ ہے اوراپنی مخلوق سے ایک لمحہ بھی غافل نہیں رہتا ۔ایک ایسادن آنے والا ہے جس دن وہ اسی انسان کو اپنے پاس بلائے گا،اس کے پنہاں اور آشکار اعمال کا حساب و کتاب لے گا اور نیک اعمال کی پاداش اور برے اعمال کی سزادے گا ۔

۲۔ہر دیندار شخص اپنے دینی عقائد کے مطابق جانتا ہے کہ جب دینی حکم کو بجا لاتا ہے تووہ اپنے پروردگار کی اطاعت کرتا ہے ،اس کے باوجودوہ بندگی کی رسم کے مطابق کسی اجرپاداش کا مستحق نہیں ہے ، لیکن پروردگار کے فضل وکرم سے اس کو نیک پاداش ملے گی ،اس لحاظ سے ہر اطاعت کو انجام دے کر اس نے حقیقت میں اپنے اختیار سے ایک معاملہ اور ایک لین دین کیا ہے ۔چونکہ وہ اپنی مرضی سے اپنی آزادی کے ایک حصہ سے دست بردار ہوا ہے اور اس کے مقابلہ میں اپنے پروردگار کی خوشنودی و مہربانی حاصل کی ہے ،اس لئے اسے اپنی نیکیوں کی پاداش ملے گی۔

دیندار شخص، دینی قوانین وضوابط کی پیروی کر کے اپنی پوری خوشی سے معاملہ کرنے میں مشغول ہو جاتا ہے اور جو کچھ اپنے اختیار سے دیتا ہے اس کے کئی گنا نفع کماتا ہے ۔وہ ایک چیز کو بیچ کر اس کے بدلے میں اس سے بہتر مال خرید لیتا ہے ۔لیکن جو شخص دین کا پابند نہیں ہوتا ،چونکہ وہ ضوابط کی رعایت اور قانون کی پیروی کو اپنے لئے ایک نقصان تصور کرتا ہے اور اس کی آزادی پسند طبیعت اس کی آزادی کے ایک حصہ کو کھو دینے سے ناراض ہوتی ہے ۔وہ اس موقع کی تلاش میں ہوتا ہے کہ اس زنجیر کو توڑ کر اپنی آزادی حاصل کرے ۔

نتیجہ

مذکورہ بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ معاشرے کی زندگی کے تحفظ کے لئے دین کا اثر غیر دینی طریقوں کی نسبت زیادہ قوی اور عمیق ہے ۔

دوسروں کی کوشش

دنیا کے پسماندہ ممالک ،جو قرن اخیر میں ترقی وپیش رفت کی فکر میں ہیں ،اگرچہ انہوں نے اجتماعی حکومت کو قبول کیا ہے ، لیکن قانون کی ضعیف شقوں کی طرف توجہ نہیں کی ہے اور دین کی طاقت سے استفادہ نہیں کیا ہے ،اس لئے ان کی دنیا تاریک ہوئی ہے اوران کی زندگی کا ماحول جنگل کے قانون میں تبدیل ہوا ہے ۔

ان کے مقابلہ میں ،دنیا کی ترقی یافتہ اور ہوشیار قوموں نے ،قوانین کی کمزوری سے آگاہ ہو کر ،قانون کو حتمی ناکامی سے نجات دلانے کے لئے ، کچھ کوششیں کر کے ایک دوسرا راستہ اختیار کیا ہے۔

ان قوموں نے تعلیم و تربیت کے نظام کو ایسے منظم کیا ہے کہ لوگوں میں خود بخود صحیح اخلاق پید ہوتااور جب وہ عملی میدان میں قدم رکھیں ، تو قانون کو مقدس اور ناقابل مخالفت سمجھیں ۔

اس قسم کی تربیت قانون کے عام طور پر نافذ ہونے کا سبب بنتیہے اور نتیجہ میں قابل توجہ حد تک معاشرے کی سعادت کو پورا کر کے قانون کو ناکامی سے نجات دلائی جاتی ہے۔ لیکن جاننا چاہئے کہ ایسے معاشروں میں پرورش پانے والے افکار دو قسم کے ہوتے ہیں :

۱۔انسان دوستی جیسے عقائد و افکار، اپنے ماتحتوں کے ساتھ خیر خواہی اور رحم دلی ،جو حقیقت پسندی پر استوار ہوں ،بیشک ان کو آسمانی ادیان سے لیا گیا ہے اور قدیم زمانے سے (جبکہ ترقی یافتہ معاشرے وجود میں نہیں آئے تھے)دین، لوگوں کو ان افکار کی طرف دعوت دیتا رہا ہے ۔

لہذا، جو خوش بختی اور سعادت ان افکار کے ذریعہ ترقی یافتہ معاشروں میں نظر آرہی ہے، وہ دین کے برکات میں شمار ہوتی ہے ۔

۲۔بیہودہ اور افسانوی عقائد وافکار ، جن کی خرافات کے بازار کے علاوہ کہیں کوئی اہمیت نہیں ہے ،مثال کے طور پر افراد کو تلقین کی جاتی ہے کہ اگر وطن کی نجات کی راہ میں کوئی تکلیف اٹھائی یا قتل کئے گئے تو،تمہارا نام تاریخ کے صفحات میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گااگرچہ ،اس قسم کے خرافاتی تصورات کا ایک عملی نتیجہ ہوتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کوئی شخص اس پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر میدان جنگ میں جان نثاری کا ثبوت دے اور بہت سے دشمنوں کو قتل کردے، لیکن وہ فائدے کے بجائے قوم کو بہت بڑا نقصان پہنچاتا ہے ،کیونکہ یہ تفکر انسان کو خرافاتی بنا کر اس کی حقیقت پسندانہ فطرت کو بیکار بنادیتی ہے ،جو لوگ خدااور قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اور موت کو نابودی اورفنا سمجھتے ہیں ، ان کی نظر میں موت کے بعد ابدی اور کامیاب زندگی کامفہوم ومعنی نہیں ہے ۔

انسان کے آرام وآسائش میں اسلام کی اہمیت

جیسا کہ ہم نے بیان کیا ،دینی قوانین ،دوسرے اجتماعی طریقوں کی بہ نسبت ممتاز ہیں۔ تمام ادیان میں اسلام کو برتری حاصل ہے۔اس لحاظ سے انسانی معاشروں کے لئے اسلام دوسرے تمام روشوں سے زیادہ مفید ہے۔اوراسلام اوردوسرے ادیان اور اجتماعی طریقوں کے موازنہ سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے ۔

اسلام کا دوسرے ادیان سے موازنہ

اسلام ،تمام ادیان کے درمیان منفرددین ہے جوسو فیصد اجتماعی ہے۔اسلام کی تعلیمات آج کل کے عیسائی دین کے مانند نہیںنہیں جو صرف لوگوں کی اضروی سعادت کو مدنظر کھتا ہے اور ان کی دینوی سعادت کے بارے میں خاموش ہے اورنہ ہی یہودیوں کے موجودہ دین کے مانندہیں جو صرف ایک ملت کی تعلیم و تربیت کی مقبولیت کو مدنظر رکھتاہے ۔اسلام کی تعلیمات مجوس اوردیگر مذاہب کے مانندصرف اخلاق واعمال سے مربوط چند موضوعات تک محدود نہیں ہیں ،بلکہ اسلام میں تمام لوگوں کے لئے دنیاوآخرت کی تعلیم و تربیت کو ہمیشہ کے لئے اور ہرزمان و مکان میں ،مدنظر رکھا گیا ہے بدیہی ہے کہ اس کے علاوہ معاشرے کی اصلاح اور لوگوں کی دنیاوآخرت کی سعادت کے لئے کوئی اور راستہ نہیں ہے :

اوّلاً:تمام انسانی معاشروں میں ۔جو اچھے روابط سے روزبروزنزدیک اور محکم تر ہو رہے ہیں ۔صرف ایک معاشرہ یا ایک ملت کی اصلاح کرنا حقیقت میں ایک فضول کوشش ہے اور ایک بڑے آلودہ تالاب یانہر کے ایک قطرہ پانی کو تصیفہ کرنے کے مانند ہے ۔

ثانیا: دوسرے معاشروں کے بارے میں غفلت کرتے ہوئے صرف ایک معاشرے کی اصلاح کرنا ایک ایسا امرہے جو اصلاح طلبی کی حقیقت کے خلاف ہے۔ اسلامی تعلیمات میں کائنات اور انسان کی خلقت کے بارے میں انسان کے ذہن میں پیداہونے والے افکار،اخلاق اورانسانی زندگی میں پائی جانے والی تمام سرگرمیاں ،کی تحقیق کی گئی ۔

لیکن اسلام میں افکارکے بارے میں ،جو عقائد حقیقت پسندانہ پہلوؤں پر مشتمل ہیں اوران میں سرفہرست خدائے متعال کی وحدانیت ہے ،وہ اصل اوربنیاد قرارپائے ہیں۔ اوراخلاق اسلامی میں ،وہ حقیقت جسے عقل سلیم قبول کرتی ہے ،وہ توحید کی بنیادپر استوار ہوئی ہے پھر اس کے بعد اخلاق کی بنیادپر، قواعد وضوابط اور عملی قوانین بیان کئے گئے ہیں،جس کے نتیجہ میں ہرکالے گورے،شہری و دیہاتی ،مردوعورت،چھوٹے بڑے،غلام و آقا،حاکم ورعایا،امیروغریب اورعام وخاص کے لئے انفرادی واجتماعی فرائض بیان کئے گئے ہیں :

(... كلمةً طيبةً كشجرة طيبةٍ اصلها ثابت وفرعها فى السّمائ) (ابراہیم۲٤)

"... کلمہ طیبہ کی مثال شجرہ طیبہ سے بیان کی ہے جس کی اصل ثابت ہے اوراس کی شاخ آسمان تک پہنچی ہوئی ہے۔"

جو شخص اسلام کے بنیادی معارف، اخلاقی تعلیمات اور فقہ اسلامی پر محققانہ نظر ڈالے، گاتو وہ ایک ایسے بے کرانسمندر کا مشاہدہ کرے گا جس کی حدوداور گہرائیوںتک پہنچنے میں انسانی عقل و شعور قاصر ہے اس کے باوجوداس کا ہر جزء و دوسرے اجزا سے متصل اور متناسب ہے اور یہ سب اجزاء مل کرخدا پرستی اور انسان پروری کو تشکیل دیتے ہیں ، جیسا کہ خدا ئے متعال نے اپنے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی کی ہے ۔

سماج کے رسم ورواج سے اسلام کا موازنہ

جب ہم دنیا کے ترقی یافتہ معاشرونکے طور طریقوں پر سنجیدگی سے نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ ان معاشروں کی سائنسی اور صنعتی ترقی نے عقلمندوں کو متحیر کر دیا ہے، وہ طاقت وترقی کے بل بوتے پرمریخ اور چاند پر کمندڈال رہے ہیں ، ان کی ملکی تشکیلات نے انسان کوحیرت میں ڈال دیا ہے ، لیکن یہی ترقی کے راستے اپنی قابل ستائش ترقی کے باوجود ، عالم بشریت پر بد بختی وبد نصیبی ایسے مصائب کا سبب بنے ہیں ۔ پچیس سال سے کم عرصہ میں دنیا کو دوبار خاک وخون میں غرق کرکے لاکھوں انسانوں کو نابود کردیا ہے اور اس وقت بھی تیسری عالمی جنگ کا فرمان ہاتھ میں لیئے ہوئے عالم بشریت کو نابود کرنے کی دھمکی دے رہے ہیں ۔ انہی طریقوں نے اپنی پیدائش کے پہلے ہی دن سے "انسان دوستی اور آزادی دلانے"کے نام پر دنیا کے دیگر ممالک اور ملتوں کے ماتھے پر غلامی کے داغ لگا کردنیا کے چار بڑے براعظموں کو اپنی استعماری زنجیروں میں جکڑ کرکسی قید و شرط کے بغیر براعظم یورپ کا غلام بنادیا ہے اورایک حقیر اقلیت کو کروڑوں بے گناہ انسانوں کے مال،جان ور عزت پر مسلط کر دیا ہے ۔

البتہ یہ بات ناقابل انکار ہے کہ ترقی یافتہ ملتیں اپنے ماحول میں مادی نعمتوں اور لذتوں سے سرشارہیں اور بہت سے انسانی آرزؤں جیسے اجتماعی انصاف اور ثقافتی و صنعتی ترقی تک پہنچ چکے ہیں۔ لیکن وہ اس کے ساتھ ہی بے پناہ بد بختیوں اور بے شمار تاریکیوں سے دوچار ہوئے ہیں کہ ان میں سے اہم ترین یہ ہے کہ بین الاقوامی کشمکش اور خون ریزیاں دنیا کے مستقبل کو عوامی سطح پر اور ہر لمحہ ماضی سے بدتر وحوادث کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں ۔

واضح رہے کہ یہ سب تلخ وشرین نتائج ، ان ملتوں ومعاشروں کی تہذیب وتمدن اور زندگی کے طور طریقونکے درخت کا پھل ہیں جو بظاہر ترقی کی راہ پر گامزن ہیں ۔

لیکن جاننا چاہیئے کہ اس کے میٹھے پھل جن سے انسان نے بہرہ مند ہوکر معاشرے کوباسعادت بنادیا ہے، ان ملتونکے بہت سے پسندیدہ اخلاق جیسے سچائی، صحیح کام، فرض شناسی، خیر خواہی اور فداکاری کا نتیجہ ہے ، نہ صرف قانون کا! کیونکہ یہی قوانین پسماندہ ملتوں ، جیسے ایشیا اور افریقہ میں بھی موجود ہیں حالانکہ ان کی پستی اور بد بختی میں دن بدن اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

لیکن اس درخت کا تلخ پھل ۔جس سے انسان آج تک کو تلخ کام ہے وہ انسان کے لئے تاریکی اوربد بختی کا سبب بنا ہے اور خود ان ترقی یافتہ ملتوں کو بھی دوسروں کی طرح نابودی کی طرف کھینچ رہا ہے۔ کچھ ناپسندیدہ اخلاق ہیں،جن کا سرچشمہ:حرص، طمع، بے انصافی،بے رحمی،غرور،تکبر،ضد،اورہٹ دھرمی ہے۔

اگرہم دین مقدس اسلام کے قوانین پر سنجیدگی سے غور کریں ،توہم متوجہ ہوں گے کہ اسلام مذکورہ صفات کے پہلے حصہ کا حکم دیتا ہے اوردوسرے حصہ سے روکتا ہے ، مختصریہ کہ کلی طورپر تمام حق اور نیک انسان کی مصلحت کے امورکی دعوت دیتا ہے اور انھیں اپنی تربیت کی بنیاد قرار دیتا ہے اورہر اس ناحق اوربرے کام سے روکتا ہے جو انسان کی زندگی کے آرام میں خلل ڈالتا ہے (خواہ کسی خاص قوم وملت سے مربوط ہو)

نتیجہ

مذکورہ بیانات کے نتیجہ کے طورپر مندرجہ ذیل چند نکات ذکر کئے جاتے ہیں :

۱۔اسلام کا طریقہ دوسرے تمام اجتماعی طریقوں سے زیادہ پسندیدہ اورانسانیت کے لئے زیادہ مفید ہے:

(ذلک دین القیّم ولکن اکثر النّاس لا یعلمون) (روم۳۰)

"...یقینا یہی سیدھا اور مستحکم دین ہے مگر لوگوں کی اکثریت اس بات سے بالکل بے خبر ہے"

۲۔موجودہ دنیا کی تہذیب وتمدن کے واضح نقوش اورمیٹھے پھل سبھی دین مقدس اسلام کی برکتیں اور اس کے آثار کی زندہ شقیں اور اصول ہیں جو مغرب والوں کے ہاتھ لگ گئے ہیں ،کیونکہ اسلام ،مغربی تمدن کے آثار کے رونما ہونے سے صدیوں پہلے لوگوں کو انہی اخلاقی اصولوں کی طرف دعوت دے رہا تھا کہ یورپ والوں نے ان پر عمل کرنے میں ہم سے پیش قدمی کی ۔

امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام زندگی کے آخری لمحات میں لوگوں سے فرماتے تھے:

"تمہارا برتائو ایسا نہ ہو کہ دوسرے لوگ قرآن مجید پر عمل کرنے میں تم سے آگے بڑھ جائیں" ۔[1]

۳۔اسلام کے حکم کے مطابق "اخلاق"کو اصلی مقصد قرار دینا چاہئے اور قوانین کو اس کی بنیادپر مرتب کرنا چاہئے ،کیونکہ پسندیدہ اخلاق کو فراموش کرنا(جو انسان کو حیوان سے ممتاز کرنے کا سبب ہے)انسان کو معنویت سے مادیت کی طرف ڈھکیل دیتا ہے اور اس کو بھیڑیئے،چیتے اور گائے جیسا درندہ بنادیتا ہے نیز اس میں گوسفند کے صفات پیدا کر دیتا ہے ۔

اسی وجہ سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

"بُعِثتُ لاتّمِم مکارم الاخلاق"[2]

"میری بعثت کا اصلی مقصد ،لوگوں کی اخلاقی تربیت ہے"

طبیعی وسائل سے اسلام کی ترقی

غیر طبیعی وسائل ، کہ جن کا کوئی مادی وجود نہیں ہے، ناکام ہوتے ہیں اور جلد یا کچھ مدت بعد نا بود ہوجا تے ہیں، اسلام جیسے دین میں جو کہ بشریت پر ہمیشہ حکو مت کرنا چاہتا ہے، ان غیر طبیعی وسائل سے استفادہ کرنا صحیح نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اپنی ترقی میں طاقت کا سہارا نہیں لیا ہے .یہ جو بعض لوگ کہتے ہیں کہ"اسلام تلوار کا دین ہے" حقیقت میں یہ لوگ صدر اسلام کی جنگوںکو ظاہری طور پر دیکھتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ غلط فہمی کا شکار ہوجاتے ہیں اور آنکھیں بند کر کے فیصلہ کر دیتے ہیں ۔جودین علم و ایمان کی بنیادپر وجود میں آیا ہو ، اس کے لئے بعید ہے کہ وہ اپنی ترقی اور لوگوں کے دلوں میں ایمان پیدا کرنے کے لئے تلوار کا سہارا لے لے (اسلام میں جہاد کے فلسفہ کا مطالعہ فرمائیں)اسی لئے اسلام نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے نیرنگ ،جھوٹ اورسیاسی شعبدہ بازی کا سہارا نہیں لیاہے اورانہیں صحیح نہیں جاناہے ،کیونکہ اسلام صرف یہ چاہتا ہے کہ حق زندہ ہواور باطل نابود ہو اور حق تک پہنچنے کے لئے باطل کی راہ پر گامزن ہونا ، حق کی نابودی کا سبب بنتا ہے۔

خدائے متعال اپنے کلام میں فرماتا ہے:

" خداظالموں ،بدکاروں اور حق کو چھپانے والوں کو اپنے مقصد میں کامیاب ہونے نہیں دیتا " (3)

تبلیغ اوردعوت اسلام

اسلام نے لوگوں کی ہدایت اور حق کو پھیلانے کے لئے ایک ایسے راستہ کا انتخاب کیا ہے جو انسان کی فطرت اور خلقت کے عین مطابق ہے اور وہ"تبلیغ اوردعوت کا راستہ "ہے ،جو انسان کے لئے حقائق، حقیقت پسندانہ فطرت اور سعادت طلبی کو واضح کر کے اسے بیدار کر دیتا ہے اور آسانی کے ساتھ اسے حق کے حوالے کرتا ہے ۔

یہ روش،یعنی تبلیغ ودعوت، ایک ایسی روش ہے جسے تمام انبیاء علیہم السلام نے اختیار کیاہے۔ اسلام ،جو خاتم ادیان اوربھر پور صلاحیتوں کا حامل دین، میں اس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا گیا ہے اور اس راستہ کا اپنا نا مسلمانوں پر واجب کیا گیا ہے، تاکہ دین کی نشر و اشاعت میں کوتاہی نہ کریں۔

خدائے متعال اپنے پیغمبر ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

" میرا اور میرے پیرؤں کا راستہ یہ ہے کہ وہ مکمل بصیرت کے ساتھ لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں "(4)

تبلیغ کا طریقہ

مذکورہ آیہ شریفہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت و تبلیغ کا کام مکمل بصیرت سے انجام پانا چاہئے، مختصر یہ کہ مبلغ کو تبلیغ سے مربوط دینی مسائل سے آگاہ ہونا چاہئے، اور تبلیغ کے طریقہ کار، شرائط اور اس کے آداب سے پوری طرح باخبر ہونا چاہئے۔ البتہ تبلیغ کے شرائط و آداب بہت زیادہ ہیں، جیسے: خوش اخلاقی، خندہ پیشانی، وقار و بردباری اور حق و انصاف کا احترام وغیرہ لیکن ان میں سب سے اہم علم و عمل ہے۔ کیونکہ جو شخص علم کے بغیر تبلیغ کرتا ہے، چونکہ وہ حقیقت سے آگاہ نہیں ہے اس لئے باطل کی تبلیغ کرنے والوں کی طرح، لوگوں کی حق تلفی کرنے اور انھیں گمراہ کرنے میں پروا نہیں کرتا ہے اور جو اپنے علم پر عمل نہیں کرتا، حقیقت میں وہ جو کچھ کہتا ہے، اس کی اپنے عمل سے تردید کرتا ہے اور جس چیز کی اپنی زبان سے تعریف کرتا ہے، اس کی اپنے کردار سے، مذمت کرتا ہے جو شخص کسی چیز کی طرف دوسروں کو دعوت دیتا ہے، لیکن خود اس پر عمل نہیں کرتا، اس کی مثال اس شخص کی سی ہے، جو ایک ہاتھ سے کسی چیز کو کھینچتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے اسے ڈھکیلتا ہے۔

خدائے متعال اپنے کلام میں فرماتا ہے:

"کیا تم، لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟"[5]

ہمارے آٹھویں امام حضرت امام رضا علیہ السلام نے فرمایا ہے:

"لوگوں کو اپنے گفتار و کردار سے دعوت دو، نہ صرف گفتار سے "[6]

۱۔ نہج البلاغہ، صبحی صالح، ص۴۲۲۔

2۔ بحار الانوار، ج ۷۱، ص۳۷۳۔

3۔ بقرہ۱۵۹و۱۷۴۔

4۔ یوسف۱۰۸۔

5۔ (اتامرون النّاس بالبرّ و تنسون انفسکم...) (بقرہ/ ٤٤)۔

6۔ بحار الانوار، ج، ص ۳۰۸۔

اسلام میں تعلیم و تربیت

اسلام، جہل و نادانی کی سرزنش کرتے ہوئے علم و دانش کی مدح کرتا ہے، اور اپنے پیروؤں کو علم و فضیلت حاصل کرنے کی تشویق کرتا ہے، جبکہ دوسرے ادیان کی کتابیں آزادانہ غور و فکر اور مخالفوں کی باتوں کی تحقیق کرنے سے منع کرتی ہیں۔ اسلام کی آسمانی کتاب (قرآن مجید) حق کو قبول کرنے، کا حکم دیتی ہے خواہ وہ مخالف ہی کی طرف سے کیوں نہ ہو اور انسان کے ساتھ استدلال اور آزادانہ طریقہ سے گفتگو کرتی ہے اور لوگوں کو آسمان و زمین اور ان میں موجود ہر چیز کی پیدائش، انسان کی خلقت ، اسلاف کی تاریخ اور کائنات کی فطری گردش کے بارے میں غور و فکر کرنے کی تاکید کرتی ہے ، بلکہ اس کے علاوہ محسوسات کے دائرہ سے آگے بڑھ کر اور ماوراء طبیعت کے بارے میں غور و فکر کی تاکید کرتی ہے ۔

اس موضوع کے بارے میں جو آیات اور روایات پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے جانشینوں سے ہم تک پہنچی ہیں ، وہ بے شمار ہیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم علم حاصل کرنے کو اس قدر اہمیت دیتے تھے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے"[1]۔

اسلامی تعلیمات کے دو اہم شاہکار

مختلف انسانی معاشروں میں موجود ہر روش میں کچھ اسرار پوشیدہ ہوتے ہیں، اگر وہ اسرار عام لوگوں پر ظاہر ہوجائیں، تو معاشرے کو چلانے والے حکام اور ان کی شہوانی خواہشات متاثر ہوتی ہیں، اس لئے وہ ہمیشہ کچھ حقائق کو لوگوں سے پوشیدہ رکھتے ہیں اور اس مطلب کا سبب یہ ہے کہ بہت سے مطالب اور ضوابط ان کے دماغ کی اپج ہوتے ہیں، چونکہ انھیں اپنی عقل اور معاشرے کی مصلحت کے خلاف پاتے ہیں، اس لئے ڈرتے ہیں کہ اگر یہ اسرار فاش ہوگئے تو ان پر اعتراضات کی بوچھار ہوجائے گی اور ان کے مفاد خطرہ میں پڑجائیں گے۔

اسی وجہ سے عیسائیوں کے کلیسا اور دوسرے ادیان کے روحانی مراکز انسان کو آزادانہ غور و فکر کرنے کی اجازت نہیں دیتے ، بلکہ دینی معارف او رمذہبی کتابوں کی توضیح و تفسیر کا حق صرف اپنے سے مخصوص کرتے ہیں اور لوگوں کو ان کی ہر بات چون وچرا اور بحث ومباحثہ کے بغیر قبول کرنا ہوتی ہے۔ اسی روش نے بہت سی دینی روشوں کو نقصان پہنچایا ہے اور عیسائیوں کی موجودہ روش اس بیان کی سچائی کی گواہ ہے۔ لیکن اسلام اپنی حقانیت پر اطمینان و اعتماد رکھتا ہے اور اپنی راہ میں کسی قسم کے مبہم اور تاریک گوشہ کو نہیں پاتا اس لئے دوسرے تمام مذہبی اور غیر مذہبی طریقوں کے برخلاف حسب ذیل دو مسائل پر زیادہ توجہ دیتا ہے:

۱۔ اسلام کسی بھی حقیقت کو پوشیدہ نہیں رکھتا اور نہ ہی اپنے پیرؤں کو اس بات کی اجازت دیتاہے کہ کسی حقیقت کو چھپائیں، کیونکہ اس مقدس دین کے قوانین فطرت اور خلقت کے قانون کے مطابق مرتّب ہوئے ہیں اور حق و حقیقت کی رو سے اس کی کوئی چیز قابل تردید نہیں ہے۔

اسلام میں، حقائق کو چھپانا گناہان کبیرہ میں شمار ہوتاہے اور خدائے متعال نے سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۵۹ میں حق کو چھپانے والوں پر لعنت کی ہے۔

۲۔ اسلام اپنے پیرؤں کو حکم دیتاہے کہ حقائق اور معارف کے بارے میں آزادانہ طور پر غور و فکر کریں اور جہاں پر بھی معمولی سا ابہام نظر آئے، وہیں رک جائیں اور آگے نہ بڑھیں تاکہ ان کا روشن ایمان شک و شبہہ کی تاریکی سے ہمیشہ کے لئے محفوظ رہے اور اگر شک و شبہہ سے دوچار ہوجائیں تو نہایت انصاف اور حق پسندی سے اس کو رفع کرنے کی کوشش کریں اور آزادانہ طور پر ان کو حل کریں۔ خدائے متعال فرماتاہے:

"جس چیز کا تمھیں علم نہیں ہے اس کے پیچھے مت جاؤ۔[2]"

آزادی فکر اور حق پوشی

غور و خوض کے ذریعہ حقائق کو درک کرکے انھیں قبول کرنا انسان کے ذہن و دماغ کی گراں قیمت پیداوار ہے اور انسان کو حیوان پر امتیاز، فضیلت، شرف اور فخر بخشنے کا واحد سبب ہے، اور انسان دوستی و حقیقت پسندی کی فطرت کردیا جائے، تقلیدی افکار کو تھوپ کر انسان کی آزادی فکر کو سلب کرلیا جائے یا حقائق کو چھپا کر اس کی عقل کو گمراہ کردیا جائے۔ مختصر یہ کہ اسبابات کی اجازت نہیں دیتی کہ خدا پسند افکار کو ناکارہ بنادیا جائے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی غافل نہیں رہنا چاہئے کہ جہاں پر انسان کسی حقیقت کو سمجھنے کی طاقت نہیں رکھتا یا مد مقابل کی ہٹ دھرمی اور سخت رویہ کی وجہ سے ومنزلت کے لئے،

انسان کے ذہن ودماغ کی گمراہی اوردوسرے مالی، جانی اور عزت کو پہنچنے والے خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے حقائق کی پردہ پوشی کو جائز سمجھتی ہے۔

ائمہ اطہار علیہم السلام نے اپنی بہت سی حدیثوں میں لوگوں کو بعض ایسے حقائق کے بارے میں غور و فکر کرنے سے منع کیا ہے جن کو سمجھنے کی انسان میں استعداد نہیں ہوتی۔ خدائے متعال نے بھی اپنے کلام میں دوموقعوں پر تقیہ کے طور پر حق چھپانے کو جائز جاناہے۔[3]

نتیجہ

اسلام چند مواقع پر حق و حقیقت کے چھپانے کو بلامانع بلکہ ضروری سمجھتا ہے:

۱۔ تقیہ کے موقع پر: یہ ایسی جگہ ہے کہ جہاں حق کے آگے بڑھنے کی کوئی امید نہیں ہو، بلکہ اس کے اظہار سے مال، جان اور عزت کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔

۲۔ ایسے موقع پر جہاں حق کسی کے لئے قابل فہم نہ ہو بلکہ اس کا اظہار گمراہی کا سبب بنے یا خود حق کی بے حرمتی کا باعث ہو۔

۳۔ ایسے مواقع پر جہاں آزاد فکر، استعداد کے فقدان کی وجہ سے، حق کو بر عکس دکھاتے اور گمراہی کا سبب بنے۔

۱۔ "طلب العلم فریضةعلی کل مسلم" (بحار الانوار، ج ۱، ۱۷۲)۔

2 (ولا تقف مالیس لک بہ علم...)(اسرائ/۳۶)

3۔ سورہ آل عمران، آیت ۲۸ اور سورہ نحل آیت ۱۰۶۔

سماجی زندگی میں اسلام کی خدمات

افراد کے منافع کا تحفظ اور رفع اختلاف

گزشتہ بحثوں سے واضح ہوا کہ دین مقدس اسلام، ایک مکمل اجتماعی طریقہ ہے، اور واضح ہے کہ ایک معاشرے کی مکمل سعادت اور سب سے بڑی آرزو یہ ہوتی ہے کہ اس کی ضروریات زندگی پوری ہوں اور زندگی کو لاحق کشمکش اوران زیادتیوں کا حتی الامکان سدّ باب کیا جائے جن سے زندگی اور اس کے امن و امان کو خطرہ لاحق ہے تاکہ معاشرہ آرام اور تکامل کی طرف بڑھ سکے۔

البتہ ایک انسان کی فطری آرزو یہ ہوتی ہے کہ یہ اپنی زندگی میں حقیقت پسندی کے ساتھ ساتھ جسم وروح کے لحاظ سے سالم ہو اور اس کے شایان شان روٹی، کپڑا، مکان اس کے پاس ہو۔ اوروہ خاندان کو تشکیل دے کر اپنی جوانی اور بوڑھاپے کی آرزئوں کو پا سکے، اور امن وامان کے ماحول میں آرام کی زندگی گزارے، اس طرح انسانیت کی شاہراہ پر کسی مزاحمت اور روکاوٹ کے بغیر اپنی تلاش وکوشش کو جاری رکھے اور تکامل تک پہنچ جائے۔

ایک انسانی معاشرہ بھی اپنے افراد کے لئے، اس سے بڑھ کر آرزو نہیں رکھتا ہے اسلام نے اس انفرادی اور اجتماعی آرزو کو عملی جامہ پہنایا ہے، کیونکہ اس نے معاشرے کو ایک ایسا نہج دے دیا ہے کہ اگر اس کو حقیقت بینی کی روشنی میں قبول کیا جائے تو انسان کی زندگی کے مفادات محفوظ رہیں گے اور ان کے اختلافات دور ہوجائیں گے۔

اسلام کا طریقہ کار اور اس کی بنیاد

اسلام نے اپنی پہلی توجہ انسان کی حقیقت پسندی کے نہج پر مرکوز ہے، کیونکہ یہ مقدس نہج انسان کی تربیت کرناچاہتا ہے اور ایسے بے زبان حیوان نہیں پالنا چاہتا کہ جس کا مقصد پیٹ بھرنا اور جنسی خواہشات کو پورا کرنا ہو۔ انسان ایک ایسی زندہ مخلوق ہے، جو جذبات اورہمدردیوں کے علاوہ عقل اور حقیقت پسندی کی توانائی سے بھی مسلح ہے۔

انسان اپنی فطرت، یعنی اپنی خالص حقیقت پسندانہ فطرت کے مطابق، درک کرتا ہے کہ وہ عالم ہستی کا ایک جزو ہے اور عالم ہستی کے دیگر اجزاء کے مانند ماورائے طبیعت، یعنی ایک لامتناہی زندگی، قدرت اور علم سے وابستہ ہے، عقل بھی اسی (خدا) کی مخلوق ہے۔ اسی لئے اسلام نے اپنی روش کو "توحید" کی بنیاد پر استوار کیا ہے اور جو شخص خداپرست نہ ہو، وہ اسے انسان نہیں جانتا۔

یہاں پر "توحید" سے مراد خدا کی یکتائی پر عقیدہ رکھنا ہے، جو اپنے دین کے ذریعہ انسان کو سعادت کی دعوت دیتا ہے اور ایک دن اسکے اعمال کا حساب لیکر اسے مناسب جزا دے گا۔

خدائے متعال اپنے کلام میں فرماتا ہے :

"یہ سب (یعنی توحید سے بے خبر لوگ) جانوروں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی کچھ زیادہ گمراہ ہیں "۔[1]

توحید کے جو معنی بیان کئے گئے ہیں ان کے مطابق وہ اسلام کی پہلی اصل اور اس کا بنیادی ستون ہے۔

اسلام کا دوسرا ستون "پسندیدہ اخلاق" ہے ،جو توحید پر استوار ہے ،کیونکہ اگرا انسان توحید کے مطابق اخلاق نہ رکھتا ہو ،تو اس کا مقدس ایمان محفوظ نہیں رہے گا ۔

اور اسی طرح ،جیسا کہ بیان کیا گیا ،قوانین اور ضوابط خواہ کتنے ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہوں ،ہرگز ایک ایسے معاشرے کو نہیں چلا سکتے جس میں اخلاقی انحطاط پایا جاتا ہو۔

اس لحاظ سے ،اسلام میں عقیدۂ توحید کے مطابق اخلاقیات کا ایک طویل سلسلہ جیسے :انسان دوستی ،رحم دلی ،عفت اور عدالت کے جیسے دوسرے امور انسانی معاشرے کے لئے مرتب کئے گئے ہیں جو توحید کے عقیدہ کے نفاذ کے ضامن اور قوانین و ضوابط کے محافظ ہیں ۔

معاشرے کی سعادت میں مفید و مؤثر ہونے کی وجہ سے اخلاق کا دوسرا درجہ ہے ،چوں کہ توحید پہلے درجہ پر ہے ۔

توحید اور اخلاق کے اصولوں کو مستحکم اور استوار کرنے کے بعد اسلام نے قوانین کا ایک طویل سلسلہ وضع کیا ہے ،جن کا تعلق اخلاق سے رابطہ ہے ،یعنی مذکورہ قوانین کا سرچشمہ پسندیدہ اخلاق ہے اور پسندیدہ اخلاق بھی اپنے قوانین کے ذریعہ مستحکم ہوتا ہے۔ اور یہی قوانین و ضوابط ہیں جو معاشرے کے حیات بخش مفاد کا تحفظ کرتے ہیں اور لوگوں کے اختلافات کو دور کرتے ہیں۔

سماجی اختلافات

انسان کے اختلافات ،جو اتحاد و اتفاق کے رشتہ کو توڑ دیتے ہیں اور اجتماعی نظام کو درہم برہم کر دیتے ہیں ،دو قسم کے ہیں :

۱۔ وہ اختلافات جو اتفاقی طور پر دو افراد کی ذاتی چپقلش کے نتیجہ میں رونما ہوتے ہیں ،جیسے دو افراد کے درمیان کسی موضوع پر ہونے والا جھگڑا اور ایسے اختلافات کو عدلیہ رفع کرتی ہے ۔

۲۔ وہ اختلافات جو طبیعی طور پر معاشرے کو دو مختلف گروہوں میں تقسیم کردیتے ہیں ،اور اجتماعی انصاف کی طرف کسی قسم کی توجہ کئے بغیر ،ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر مسلط کیا جاتا ہے اور کمزور طبقہ کی سعی و کوشش کے ماحصل کو طاقتور گروہ کے نام مخصوص کیا جاتا ہے ،جیسے :حاکم و محکوم ،دولت مند و فقیر ،عورت و مرد اور ملازم و افسر کے طبقے ترقی یافتہ اور بے دین معاشروں میں اسی صورت میں زندگی کرتے ہیں اور ہمیشہ طاقتور لوگ کمزوروں اور اپنے ماتحتوں کا استحصال کرتے ہیں ۔

منافع کی حفاظت اور رفع اختلافات کے بارے میں اسلام کا عام نظریہ اسلام کلی طور پر، معاشرے کی سعادت، جو کہ لوگوں کے مفاد کی حفاظت اور ان کے اختلافات کے سدِّباب کی مرہون منت ہے، کو دو چیزوں کے ذریعہ فراہم کرتا ہے:

۱۔ طبقاتی امتیاز کو کلی طور پر لغو کر کے اس کی اہمیت کو ختم کردیتا ہے، اس معنی میں کہ اسلامی معاشرے میں لوگ آپس میں بھائی بھائی ہیں اور کسی کو ہرگز یہ حق نہیں ہے کہ دولت یا اجتماعی طاقت کے بل بوتے پر دوسروں پر برتری جتائے اور انھیں حقیر و خوار سمجھے اور ان سے فروتنی اختیار کرنے اور تسلیم ہونے کا تقاضا کرے، یا اپنے مخصوص عہدہ کی بنا پر خود کو بعض اجتماعی ذمہ داریوں سے مستثنیٰ قرار دے یا کسی جرم کے مرتکب ہونے پر خود کو معاف اور سزا سے بری سمجھے۔ قوانین و ضوابط کے نفاذ میں معاشرے کے سرپرست کا حکم نافذ ہے اور سب کو اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا چاہئے اور اس کا احترام کرنا چاہئے، لیکن اس کو اپنے ذاتی اغراض و مقاصد میں یہ توقع نہیں رکھنی چاہئے کہ دوسرے لوگ اس کے سامنے سر تسلیم خم کریں یا جو کچھ وہ انجام دے اس کے بارے میں انھیں اعتراض و تنقید کرنے کا حق نہیں ہے کیونکہ وہ معاشرے کا فرمانروا ہے، اس لئے اسے بعض عام اور سماجی ذمہ داریوں اور فرائض سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ اسی طرح ایک دولت مند شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنی دولت کو اپنے لئے فخر و مباہات کا سبب قرار دیکر غریبوں، محتاجوں اور اپنے ماتحتوں کی سرکوبی کرے۔ اس کے علاوہ معاشرے کے فرمانرواؤں کو یہ توقع نہیں کرنی چاہئے کہ لوگ ان کی اطاعت کرتے ہوئے ان کی ہر فضول بات کو معاشرہ کے پسماندہ اور ناداروں کے مسلم حق کے مقابلہ میں فوقیت دیں۔

نیز اسلام ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا ہے کہ کسی بھی طبقہ میں ایک طاقتور لوگ ناحق کمزوروں پر مطلق حکمرانی کریں۔ خدائے متعال اپنے کلام میں فرماتا ہے:

"اسلام کے پیرو آپس میں بھائی اور مساوی ہیں"۔[2]

نیز فرماتا ہے:

"خدا کا دین تمہاری (اہل کتاب اور مسلمان) آرزؤں اور خواہشوں کا تابع نہیں ہے، جو بھی برا کام انجام دے گا، اسے سزا ملے گی"۔[3]

البتہ دین اسلام میں کچھ خصوصیات، جیسے: دین کے پیشواؤں کی اطاعت اور والدین کا احترام، ہیں کہ اس میں مساوات نہیں ہے بلکہ صرف ایک طبقہ کے لئے دوسرے طبقہ کی نسبت کچھ فرائض ہیں، لیکن اس سلسلہ میں بھی جس کے حق میں یہ حکم ہے، وہ دوسروں پر برتری نہیں جتلا سکتا، یعنی وہ دوسروں کے مقابلہ میں اپنے مقام پر فخر نہیں کر سکتا ہے۔

جی ہاں، چونکہ انسان فطری طور پر امتیاز و فضیلت طلبی کی جبلّت رکھتا ہے، اسلام نے اس کی اس فطری جبلّت کو سرکوب کئے بغیر اس کے لئے ایک عمل معین فرمایا ہے اور وہ "تقویٰ" ہے۔

اسلام میں حقیقی قدر و قیمت پرہیزگاری کے لئے ہے اور چونکہ تقویٰ کا حساب چکانے والا خدائے متعال ہے، اس لئے یہ امتیاز جس قدر زیادہ ہوجائے ،کوئی رکاوٹ ایجاد نہیں کرتا، اس کے برعکس طبقاتی امتیاز معاشرے میں فسادپھیلانے کا سب سے بڑا سبب اور افراد کے آپس میں ایک دوسرے کے لئے رکاوٹ کا باعث بنتا ہے۔

اسلام کی نظر میں ، ایک پر ہیزگارفقیر، بے تقوی سرمایہ داروں کے ایک گروہ پر فضیلت رکھتا ہے اور ایک پر ہیزگا عورت سیکڑوں لا ابالی مردوں سے بہتر ہے۔

خدائے متعال فرماتا ہے :

"انسانو!ہم نے تم کو ایک مرد اورعورت سے پیدا کیا ہے اور پھر تم میں شاخیں اور قبیلے قرار دئیے ہیں تاکہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچان سکو ،بیشک تم میں سے خدا کے نزدیک زیادہ محترم وہی ہے جو زیادہ پر ہیزگار ہے ۔"[(4)]

نیز فرماتا ہے :

"میں تم میں سے کسی بھی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا ،چاہے وہ مردہو یاعورت ،سب ایک نوع سے ہیں اور انسان ہیں ۔"[(5)]

۲۔چوں کہ تمام افراد، انسانیت اور معاشرے کے رکن ہونے کے لحاظ سے شریک ہیں اور تمام لوگوں کا کام اوران کی کوشش محترم ہے، لہذاکچھ قوانین بنائے گئے ہیں تاکہ ان کی روشنی میں ہر فرد کے مفادات کا تعین ہو سکے اور اجتماعی تجاوز اور کشمکش کا راستہ خود بخود بند ہو جائے۔

ابتدائی اصول کومدنظر رکھتے ہوئے یہ قوانین کچھ اس طرح بنائے گئے ہیں کہ معاشرے کے مختلف طبقاتی فاصلے بالکل ختم ہو جائیں ،دوریوں کو نزدیکیوں میں بدل دیا جائے۔ ان بیانات کی روشنی میں مفادات کے تحفظ اور معاشرے کے اختلافات کودور کرنے کے سلسلہ میں اسلام کا خاص طریقہ اجمالی طورپر واضح ہوجاتا ہے۔

عداوت و اختلاف سے اسلام کا مقابلہ

معاشرے کے مختلف طبقات میں طبیعی طورپرپیدا ہونے والے اختلافات، جیسے رعایا اورحاکم کا طبقہ ،غلام و مالک اورکام لینے والے و مزدور کے درمیان اختلا فات دو طریقوں سے وجود میں آتے ہیں :

۱۔ایک شخص کا دوسرے شخص کے حقوق پر تجاوز کرنے سے:مثلاً کام لینے والا، مزدورکی مزدوری ادانہ کرے ،ایک مالک اپنے نوکرکی پوری اجرت نہ دے اس کے حق میں ظلم اورناانصافی کرے یاحاکم اپنی رعایامیں سے کسی کے حق میں ظالمانہ حکم جاری کرے۔

اسلام نے اس مشکل کو حل کرنے کے لئے بہت سے قوانین مقرر کئے ہیں، کہ ان کو نافذ کرنے سے ہر ایک کے حقوق محفوظ رہ سکتے ہیں اور ہر شخص اپنے کھوئے ہوئے حقوق کو پا سکتا ہے ۔ اسلام نے اس کام کے لئے معاشرے کی ہر فرد کو اجازت دی ہے کہ اگر کوئی شخص اس کے ساتھ ظلم کرے (چاہے وہ حاکم وقت ہی کیوں نہ ہو) تو قاضی کے پاس شکایت کرنی چاہئے۔

امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کے زمانہ میں ایک مسلمان کا حضرت کے ساتھ کچھ اختلاف ہوگیا، اس نے قاضی کے پاس جاکر استغاثہ کیا۔ حضرت ایک عام شخص کی طرح اس قاضی (جسے خود آپ نے منصوب فرمایا تھا) کے پاس حاضر ہوئے اور فیصلہ ہوا۔ تعجب کا مقام یہ ہے کہ حضرت نے قاضی سے فرمایا کہ شکایت کرنے والے اور میرے درمیان برتاؤ میں کسی قسم کا فرق نہ کرے۔

۲ ۔ ایک طاقتور شخص کا کمزور اور اپنے ماتحت کے اوپر دھونس جمانا اور اس کے ساتھ زیادتی کرنا ، جیسے ایک کام لینے والا اپنے مزدوروں کو ذلیل و خوار سمجھے ، کوئی مالک اپنے سامنے کھڑا رکھے ، اور اسے اپنے سامنے جھک کر تعظیم کرنے پر مجبور کرے یا حاکم اپنی رعایا سے اعتراض اور استغاثہ کا حق چھین لے، کیونکہ اس قسم کے برتاؤ میں غیر خدا کی پرستش کا پہلو پایا جاتا ہے، اس لئے اسلام نے ان چیزوں سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے۔ اسلام میں کوئی بھی شخص اپنے ماتحت سے انجام فریضہ کے علاوہ کسی قسم کی توقع نہیں رکھ سکتا ہے اور ان پر اپنی بزرگی و عظمت کا مظاہرہ نہیں کر سکتا ہے۔ اسلام میں بہت سے ایسے اخلاقی احکام موجود ہیں جو لوگوں کو سچائی، انصاف اور حسن اخلاق کی دعوت دیتے ہیں اور عہد و پیمان کی رعایت کرتے ہیں، نیکی اور خدمت کرنے والوں کی تشویق کرتے ہیں اور ، بد کرداروں ، نا اہلوں او ربرے لوگوں کو سزا دیتے ہیں۔

یہ ایسے پسندیدہ اخلاق ہیں کہ اگر معاشرے میں یہ نہ ہوں تو معاشرہ بدبختی سے دوچار ہوجائے گا اور دنیا و آخرت میں ناکامی و بدبختی میں مبتلا ہوگا۔

ممکن ہے کہ کسی کو ان قوانین سے بے اعتنائی اور ان پر عمل نہ کرنا اس کے لئے بظاہر معمولی فائدہ ہو، لیکن دوسری طرف یہ ایک ناپاک او رخطرناک ماحول کو پیدا کرتا ہے کہ جو اس کو اس معمولی فائدہ سے محروم کرنے کے علاوہ اور بھی بہت سے فائدوں سے اس کو محروم کرتا ہے اور اس شخص کی مثال اس آدمی کی سی ہے جو ایک عمارت کے سنگ بنیاد کو باہر نکال کر اس پر ایک نئی عمارت تعمیر کرتا ہے اور اس طرح اس عمارت کی ویرانی کا سبب بنتا ہے۔

رفع اختلاف کے لئے ایک عام وسیلہ

اسلام نے اپنے پیروؤں کو حکم دیا ہے کہ وہ معاشرے کے فائدے کے بارے میں سوچیں اور خود خواہی سے پرہیز کرکے اپنے ذاتی مفاد کو اسلامی معاشرے کے فائدہ میں دیکھیں اور معاشرے کے نقصان کو اپنا نقصان سمجھیں۔

ایک مسلمان کو پہلے حقیقی مسلمان ہونا چاہئے، اس کے بعد وہ ایک تاجر، کسان، صنعت گر یا مزدور بنے اور جو شخص خاندان کو تشکیل دینا چاہتا ہے، اسے پہلے مسلمان ہونا چاہئے اس کے بعد اپنے فیصلہ پر عمل کرے۔ مختصر یہ کہ وہ جو بھی کام انجام دینا چاہے اور جو بھی مقام اور عہدہ سنبھالنا چاہے، اس کے لئے صحیح دین و ایمان کی ضرورت ہے۔

ایسا شخص ہر کام اور ہر فیصلہ کے سلسلہ میں سب سے پہلے اسلام و مسلمین کی مصلحتوں اور فائدوں کو مدنظر رکھتا ہے، اس کے بعد اپنی ذاتی مصلحت کو مدنظر رکھتا ہے اور وہ ہرگز کوئی ایسا کام انجام نہیں دیتا جس میں اسلام و مسلمین کے لئے نقصان ہو اگرچہ اس کام میں اس کا ذاتی فائدہ بھی نہ ہو۔

البتہ معلوم ہے اگر کسی معاشرے میں اس قسم کی فکر پیدا ہو جائے تو اس معاشرے کے افراد میں کبھی اختلاف پیدا نہیں ہوگا ۔خدائے متعال فرماتا ہے:

(واعتصموا بحبل اللّٰہ جمیعاً ولا تفرقوا) ۔)

(آل عمران۱۰۳)

"اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور آپس میں تفرقہ نہ پیدا کرو"

نیز فرماتاہے:

(و انّ ھذا صراطی مستقیماً فاتّبعوہ ولاتتّبعوا السّبل فتفرق بکم عن سبیلہ) (انعام۱۵۳)

"اور یہ ہمارا سیدھا راستہ ہے اس کا اتباع کرو اور دوسرے راستوں کے پیچھے نہ جاؤ کہ راہ خدا سے الگ ہو جاؤ گے..."۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی ہونا چاہئے تاکہ اغیار کے مقابلہ میں ایک طاقت کی صورت میں آئیں۔"[6]

نماز، روزہ اور حج یا رفع اختلافات کا وسیلہ

اسلام کے فخر و مباہات میں سے ایک مسئلہ "عبادت" ہے اور وہ یہ ہے کہ دوسرے ادیان کے لوگ، جیسے یہود و نصاری اپنے دینی احکام کے مطابق عمومی عبادت خانوں کے علاوہ عبادت سے محروم ہیں اور ان کے مذہبی قانون کی نظر میں وہ کلیسا اور اپنے عبادت خانوں کے علاوہ کہیں عبادت انجام نہیں دے سکتے اور نماز نہیں پڑھ سکتے ہیں۔ لیکن اسلام میں اِن پابندیوں کو ختم کردیا گیا ہے اور ہر مسلمان پر واجب ہے کہ اپنی عبادت کو جہاں چاہے انجام دے، مسجد میں ہو یا کہیں اور، مسلمان معاشرے میں ہو یا کفر کے معاشرے میں، لوگوں کے درمیان ہو یا تنہا، صحت مندی کی حالت میں ہو یا بیماری کی حالت میں۔

۱۔والمسلمون تتکافأ دماؤھم وھم ید علی من سواھم...(اصول کافی،ج۱،ص۴۰۳)۔

بہر حال اپنی عبادت کو انجام دینا چاہئے ، اور یہ بذات خود اسلام کی کامیابی کے اسرار میں سے ایک ہے ۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

"میرے لئے تمام روئے زمین عبادت خانہ اور پرستش گاہ ہے ۔"(7)

اسی لئے شریعت اسلام نے نماز، روزہ اور حج کو پہلے مرحلہ میں انفرادی قرار دیا ہے ، اس معنی میں کہ ہر فرد سے اس کی انجام دہی کا مطالبہ کیا ہے اور جماعت میں شریک ہونے کو لازم نہیں کیا ہے ۔ لیکن دوسرے مرحلہ میں ان عبادتوں کے اجتماعی فوائد کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے اور انھیں اجتماعی اہمیت دی ہے مثلا انسان اس کے ذریعہ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں اپنی بندگی ونیاز مندی کا اظہار کرتا ہے لہذا جماعت میں حاضر ہونا مستحب قرار دیا ہے ۔

اسی طرح روزہ جو انفرادی ریاضت کے لئے قرار دیا گیا ہے اور مسلمانوں کو سال میں ایک مہینہ دن کے میں کھانے پینے اور جنسی آمیزش سے پرہیز کرنا چاہئے اور اس کے ذریعہ اپنے اندر پرہیزگاری اور تقویٰ پیدا کرے، اس کے باوجود اس کے کہ یہ ایک انفرادی فریضہ ہے اور اس میں اجتماعی پہلو نہیں پایا جاتا، لیکن شوال کی پہلی تاریخ کو ماہ مبارک رمضان میں فریضہ کے انجام کے شکرانہ میں مسلمان عید منائیں اور ان پر فرض ہے کہ نماز عید فطر کو باجماعت پڑھیں ۔

اسی طرح حج میں جس کے ذریعہ ،خدا کی دعوت پر لبیک اور مادی میلانات سے دوری اور پروردگار کی ذات کی طرف توجہ کرنا ہوتا ہے ، باوجودیکہ یہ ایک انفرادی عبادت ہے،

لیکن چونکہ عبادت کی ایک خاص ومعین جگہ ہے ، لہذا دنیا کے مسلمان مجبورا ایک جگہ پر جمع ہو تے ہیںاورایک دوسرے کے حالات سے آگاہ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو ۔ جس دن حج کے بعض اعمال انجام دئیے جاتے ہیں ۔ اسلامی عید قرار دیا گیا ہے اور مسلمانوں پر واجب ہے کہ ایک جگہ جمع ہو کر نماز عید پڑھیں ۔

اسلام میں جو یہ اجتماعات مقرر ہوئے ہیں ، یہ لوگوں کے طبقاتی اختلافات کو دور کرنے کا بہترین وسیلہ ہے ، کیونکہ طبقاتی اختلافات کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دینے کے لئے موثرترین طریقہ ایک دوسرے کے درمیان موجود غلط فہمی کو دور کرنا ہے اور یہ خاصیت اجتماعی عبادت میں مکمل طور پر موجود ہے کیونکہ جو خدا کی عبادت کو اخلاص کے ساتھ انجام دیتا ہے ، اس کا خدا کے سوا کسی اور کے ساتھ سروکار نہیں ہوتا ہے اور خدا کی رحمتو نکے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے ہیں اور اس کی ابدی نعمتوں کا خزانہ کبھی ختم ہو نیوالا نہیں ہے اور اس کی ذات اقدس رکاوٹ کے بغیر ہر ایک کو قبول کرتی ہے، جس کے نتیجہ میں اجتماعی عبادت کے دوران جو انس ، اور الفت ومحبت لوگوں میں پیدا ہوتی ہے وہ اختلافات اور کدورتوں کو دور کرنے کا بہترین وسیلہ ہے۔

چنانچہ پہلے بھی اشارہ کیا جاچکا ہے ، کہ ہم سب جانتے ہیں کہ دین مقدس اسلام کے معارف کلی طور پر تین حصوں میں تقسیم ہوئے ہیں : "اصول دین ، اخلاق اور فقہی فروع ۔"

واضح ہے کہ اس کے علاوہ اصول دین ،یعنی دین کی بنیاد،تین اصولوں پر مشتمل ہے کہ انسان ان میں سے ایک کے نہ ہونے پر دین سے خارج ہوجاتا ہے:

۱۔توحید،یعنی کائنات کے پروردگار کی یکتائی کا اعتقاد۔

۲۔خدائے متعال کے انبیاء علیہم السلام پر عقیدہ رکھنا ہے جن کے آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفٰیؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں ۔

۳۔معاد پر ایمان ،یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ خدائے متعال موت کے بعد سب کو زندہ کرے گا اور ان کے اعمال کا حساب وکتاب لیا جائے گا ،نیک لوگوں کو ان کی نیکی کی جزا دی جائے گی اور برے لوگوں کو انکی برائی کی سزادی جائے گی ۔

مذکورہ تین اصولوں میں دو اصولوں کا اور اضافہ کیا جاتا ہے،جو شیعہ عقائد کا حصہ اور مسلمات میں سے ہیں ،اورانسان ان میں سے کسی ایک پر عقیدہ نہ رکھنے کی وجہ سے شیعہ مذہب سے خارج ہوجاتا ہے،اگرچہ اسلام کے دائرہ سے خارج نہیں ہوتا ،یہ دو اصول حسب ذیل ہیں :

۱۔عدل

۲۔امامت

1۔(ان هم الا کا لانعام بل هم اضل سبیلا) (فرقان٤٤)

2۔ (انّما المؤمنون اخوه...)(حجرات / ۱۰)۔

3۔(لیس باما نیکم ولا امانی اهل الکتاب من یعمل سو ء ایجز به)(نساء ۱۲۲)۔

4۔(یاایّها النّاس انّا خلقنکم من ذکرٍ و انثی وجعلنکم شعوباً وقبائل لتعارفوا انّ اکرمکم عندالله اتقٰکم)(حجرات ۱۳)۔

5۔انّی لااضیع عمل عاملٍ منکم من ذکرٍاو انثی بعضکم من بعض۔(العمران ۱۹۵)۔

6۔ سفینہ البحار، ج ۱، ص ۱۹۔

عقائد

۱۔توحید

۲۔نبوت

۳۔معاد

٤۔عدل

۵۔امامت

۱۔توحید

اثبات صانع

انسان جب حقیقت بینی کی فطرت سے کام لیتا ہے تو عالم ھستی کے ہر گوشہ و کنار پر نظر ڈالنے سے اسے پروردگار عالم او رخالق کائنات کے وجود کی بہت سی دلیلیں نظر آتی ہیں، کیونکہ انسان اپنی حقیقت پسندانہ فطرت سے محسوس کرتا ہے کہ مخلوقات میں سے ہر ایک،وجود کی نعمت سے مالامال ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنے وجود میں ، قہری طور پر ایک معین راستہ کو طے کررہا ہے اورایک مدت کے بعدوہ اپنی جگہ کو دوسرے کے لئے چھوڑتاہے، اس نے ہر گز اپنے اس وجود کو خودہی اپنے لئے فراہم نہیں کیا ہے او رجس منظم راہ پر گامزن ہے ، اسے خودہی اپنے لئے نہیں بنایا ہے اوراپنے سفر کے راستہ کی ایجاد اور اس کے نظم و نسق میں کسی قسم کی مداخلت نہیں رکھتا، کیونکہ انسان نے، انسانیت اور انسانی خصوصیات کو اپنے لئے خود اختیار نہیں کیا ہے، بلکہ انسان کو پیدا کیا گیا ہے اور انسانی خصوصیات اسے عطا کی گئی ہیں۔

اسی طرح حقیقت پسندانہ انسانی فطرت اس بات کو قبول نہیں کرتی ہے کہ یہ سب اشیاء خودبخود وجود میں آئی ہوں گی اور کائنات میں موجود نظام یوں ہی کسی حساب و کتاب کے بغیر وجود میں آگئے ہوں گے، جبکہ انسان کا ضمیر اس قسم کے اتفاق کو منظم طور پر ایک دوسرے کے اوپر چنی گئی چند اینٹوں کے بارے میں قبول نہیں کرتا۔یہاں پر انسان کی حقیقت پسندانہ فطرت اعلان کرتی ہے کہ عالم ھستی کی ضرور کوئی پناہ گاہ ہے ،جو ھستی کا سرچشمہ ، اور کائنات کو پیدا کرنے اوراسے باقی رکھنے کے لئے اس کی حفاظت کرنے والا ہے ، اور وہ لامحدودوجود اور علم و قدرت کا سرچشمہ، خدائے متعال کی ذات ہے ، اور اس کائنات کے وجود کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے ،چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے :

(الّذی اعطی کل شی ء خلقه ثم هدی) (طہ۵۰)

"(خالق کائنات)وہ ہے جس نے ہرشے کو اس کی مناسب خلقت عطا کی ہے اور پھرہدایت بھی دی ہے ۔"

اسی فطرت کی وجہ سے،جہاں تک تاریخ بتاتی ہے ، انسانی معاشرہ کی اکثریت ،کائنات کیلئے ایک خدا کے قائل رہے ہیں اور اسلام کے علاوہ دوسرے تمام ادیان جیسے نصرانیت، یہودیت ، مجوسیت اور بدھ مت اس سلسلہ میں ہم عقیدہ ہیں اور جو پروردگار کے وجود کے مخالف ہیں ، ان کے پاس اسکے وجود کے انکار کے سلسلہ میں ہرگز کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ حقیقت میں وہ کہتے ہیں کہ:ہم پروردگار کے وجود کی کوئی دلیل نہیں رکھتے یہ نہیں کہتے ہیں کہ ہمارے پاس اس کے عدم وجود کی کوئی دلیل ہے ۔

مادہ پرست انسان کہتاہے :"میں نہیں جانتا"یہ نہیں کہتاہے"نہیں ہے"دوسرے الفاظ میں مادہ پرست انسان مذبزب ہے نہ منکر۔

خدائے متعال اپنے کلام میں اس مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے :

(وقالوا ما ھی الّا حیاتنا الدّنیا نموت ونحیا وما یھلکنا الّا الدّھر وما لھم بذلک من علم ان ھم الا یظنون)

(جاثیہ۲٤)

"اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ صرف زندگانی دنیا ہے اس میں مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور زمانہ ہی ہم کو ہلاک کر دیتا ہے اور انھیں اس بات کا کوئی علم نہیں ہے کہ یہ صرف ان کے خیالات ہیں اور بس۔"

ابتدائے خلقت کی بحث

انسان اپنی خداداد فطرت سے ہر مظہر وحادثہ کا مشاہدہ کرنے کے بعد اس کے وجود میں آنے کی علت تلاش کرتا ہے اور ہرگز احتمال نہیں دیتا ہے کہ کوئی چیز خود بخوداور کسی سبب کے بغیر وجودمیں آئی ہوگی ۔ اگرکسی ڈرائیور کی گاڑی خراب ہوجاتی ہے تو وہ گاڑی سے اتر کرگاڑی میں اس جگہ کو دیکھتا ہے جہاں خراب ہونے کا احتمال ہوتاہے تاکہ گاڑی کے رکنے کا سبب معلوم کر سکے اوراسے ہرگزیقین نہیں ہوتا ہے کہ گاڑی خرابی کے بغیر رک گئی، اور گاڑی کو پھر چلانے کے لئے اس کے تمام وسائل سے استفادہ کرتا ہے اور ہرگز اس اتفاق کا منتظر نہیں رہتا ہے کہ گاڑی خود بخود چلے گی۔

انسان کو اگر بھوک لگ جائے تو وہ روٹی کی فکر میں پڑتاہے اورجب اسے پیاس لگتی ہے تو پانی تلاش کرتا ہے اور اگر سردی محسوس کرتاہے تولباس اور آگ ڈھونڈتا ہے ۔وہ کبھی کسی اتفاق کے ذریعہ ان ضرورتوں کو دور کرنے کا انتظار نہیں کرتا اور اس خوش فہمی میں آرام سے نہیں بیٹھتا۔

جو شخص کسی عمارت کو تعمیر کرنا چاہتا ہے وہ لامحالہ اس کے سازوسامان ، معماراور مزدور وغیرہ کا انتظام کرتا ہے اوروہ بالکل یہ امید نہیں رکھتا کہ اس کی آرزو خود بخودپوری ہوجائے۔ انسان جب سے ہے اسی وقت زمین پرپہاڑ،جنگل ، وسیع دریا اور سمندر

موجود ہیں۔ اور اس وقت سے سورج ،چاند اور چمکنے ہوئے ستاروں کو آسمان پر منظم اور مسلسل متحرک دیکھ رہا ہے ۔اس کے باوجود دنیا کے سائنسدان اپنی انتھک علمی کوشش اور تگ دو سے مخلوقات اور حیرت انگیز مظاہر کے وجود میں آنے کے اسباب وعلل کے بارے میں بحث کررہے ہیں اور وہ ہر گز یہ نہیں کہتے کہ جب سے ہم ہیں اسی وقت سے ان کو اسی طرح دیکھ رہے ہیں، لہذا یہ خود بخود پیدا ہوئے ہیں۔

اسی جستجو کی فطرت اور اسباب وعلل کی بحث و تحقیق نے انسان کو مجبور کردیا ہے کہ وہ عالم ہستی اور اس کے حیرت انگیز نظام کی پیدائش کے بارے میں کھوج کرے کہ کیا یہ وسیع کائنات ،جس کے اجزاایک دوسرے سے مربوط ہیں اور حقیقت میں ایک عظیم مظہر ہے ، خود بخود وجود میں آیا ہے یا اس کا سرچشمہ کہیں اور ہے ؟اور کیا یہ حیرت انگیز نظام ،جو ثابت اور بلا استثناء قوانین کے مطابق کائنات کے گوشہ وکنار میں جاری ہے اور ہرچیز کو اس کے خاص مقصد کی طرف راہنمائی کرتا ہے ، ایک بے انتہا قدرت اور علم کی طرف سے جاری اور اس کا نظام چلایا جاتا ہے، یا کسی حادثہ اور اتفاق کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے ؟

معرفت خدا اور ملتیں

ہم جانتے ہیں کہ عہد حاضر میں روئے زمین پر دین داروں کی اکثریت ہے، اور وہ خالق کائنات پر اعتقاد رکھتے ہیں اور اس کی پرستش کرتے ہیں ۔کل کے انسان کی حالت بھی آج کے انسان کی سی تھی ،جہاں تک تاریخ بتاتی ہے ،وہ یہ کہ انسانوں کی اکثریت دین دار تھی اور وہ کائنات کے لئے ایک خدا کے قائل تھے ۔

اگر چہ خدا شناس اور دین دار معاشروں میں ،فکری اختلاف بھی تھا اور ہر قوم چشمہ تخلیق کو مخصوص اوصاف سے متصف کرتی تھی ، لیکن اصل مقصد میں وہ اتفاق نظر رکھتے تھے ، حتی قدیم ترین تمدن کے آثار جنھیں انسان نے کشف کیا ہے ، ان میں دین اور خداشناسی کی علامتیں پائی جاتی ہیںاور ایسی علامتیں بھی ملی ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ماورائے طبیعت پر بھی اعتقاد وایمان رکھتے تھے ۔ حتی جدید براعظموںجیسے امریکہ اورآسٹریلیا اور قدیمی براعظموں کے دور دراز جزائر جو آخری صدیوں میں کشف ہوئے ہیں ،ان کے اصل باشندے بھی خدا کے معتقد تھے، اور وہ تصور کائنات کے سلسلہ میں اختلافات نظر کے باوجود کائنات کا ایک سرچشمہ تسلیم کرتے تھے اگر چہ قدیم دنیا سے ان کے رابطہ کی تاریخ معلوم نہ ہو سکی ۔

اس بات پر غور کرنا کہ خدا کا اعتقاد انسانوں کے درمیان ہمیشہ سے موجود تھا ، اس مطلب کو واضح کرتا ہے کہ خدا کو پہچاننا انسان کی فطرت ہے اور انسان اپنی خداداد فطرت سے ،کائنات کی تخلیق کے لئے ایک خدا کو ثابت کرتا ہے۔ خدائے متعال نے انسان کی اس فطری خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

(ولئن سأ لتهم من خلقهم ليقو لن الله) (زخرف۷۸)

"اگر ان سے پوچھ لوگے کہ انھیں کس نے پیدا کیا ہے؟ تو یقینا کہیں گے خدا نے"

نیز فرماتا ہے:

(و لئن سالتهم من خلق السمٰوات و الارض ليقولن الله)

(لقمان ۲۵)

"اگر ان سے پوچھ لوگے کہ انھیں کس نے پیدا کیا ہے؟ تو یقینا کہینگے : خدا"

انسان کی زندگی میں تجسس کا اثر

اگر انسان نے خالق کائنات اور اس کے نظام کے پیدا کرنے والے ۔جو کہ اس کی فطرت کا اقتضاء ہے ۔کے بارے میں مثبت جواب دیا ،تو اس نے کائنات اور اس کے حیرت انگیز نظام کی پیدائش کے لافانی مبداء کو ثابت کیا اوراس نے تمام چیزوں کو خدا کے محکم ارادہ سے جو اسکی لامحدود قدرت و علم پر مبنی ہے ۔اور نتیجہ میں وہ پورے وجود میں ایک قسم کے اطمینا ن واعتماد کو محسوس کرتا ہے۔ اوروہ اپنی زندگی میں رونما ہونے والی ہر قسم کی مشکلات اور سختیوں سے دوچار ہونے پر ہرگزنا امید نہیں ہوتا ہے بلکہ ان سے نپٹنے کے لئے ہر قسم کی تدبیر سے کام لیتا ہے ،کیونکہ وہ جانتا ہے کہ کوئی بھی علت و سبب۔ خواہ وہ کتنا قوی ہو۔ اس کی باگ ڈور خدا کے ہاتھ میں ہے اور ہر چیز اس کے زیر فرمان ہے ۔

ایسا شخص کبھی اسباب و علل کے سامنے سراپا تسلیم نہیں ہوتا اور جب کبھی دنیا کے حالات اس کے مطابق ہوتے ہیں تو غرور و تکبر سے اس کادماغ خراب نہیں ہوتا اوروہ اپنی اورکائنات کی حقیقی حیثیت کوفراموش نہیں کرتا ،کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ظاہری اسباب و علل خود مختار نہیں ہیں بلکہ ان کا تعلق حکم خدا سے ہے ۔آخر کار ایسا انسان یہ جان لیتا ہے کہ عالم ہستی میں خدائے متعال کے علاوہ کسی اور کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرنا چاہئے اور خدا کے فرمان کے علاوہ کسی بھی فرمان کے سامنے مطلق طورپر تسلیم نہیں ہونا چاہئے ۔ لیکن جس نے مذکورہ سوالات کا منفی جواب دیا ،وہ اس امید اور حقیقت پسندی عالی منشی اور فطری شجاعت کا حامل نہیں ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ جن ملتوں میں مادیت کا غلبہ ہے وہاں روز بروز خود کشی کے واقعات زیادہ رونما ہوتے ہیں ،اور جن کا اعتقاد حسی اسباب و علل تک محدود ہو وہ چھوٹے سے چھوٹے نامناسب حالات کے رونما ہونے پراپنی سعادت و کامیابی سے نا امید ہو کر اپنی زندگی کا خاتمہ کردیتے ہیں، لیکن جو لوگ خدا شناسی کی نعمت سے مالامال ہیں،وہ موت کے دہانے پر بھی نا امید نہیں ہوتے ،کیونکہ وہ خدائے قادر وبینا پر ایمان رکھتے ہیں ،اس لئے مطمئن و امید وار ہوتے ہیں ۔

حضرت امام حسین علیہ السلام اپنی زندگی کے آخری لمحات میں جبکہ چاروں طرف سے دشمن کے تیر وتلوار کا نشانہ بنے ہوئے تھے ،فرماتے ہیں :

"تنہا جو چیز اس ناگوار مصیبت کو میرے لئے آسان بنا رہی ہے ،وہ یہ ہے کہ میں خدائے متعال کو مستقل اپنے اعمال پر ناظر دیکھتا ہوں ۔"

توحید کے بارے میں قرآن مجید کا اسلوب

اگر انسان پاک طبیعت اور مطمئن دل سے ،کائنات پر نظر ڈالے تو اس کے ہر گوشہ وکنار میں وجود خدا کے آثار ودلائل کا مشاہدہ کرے گا اور اس حقیقت کے ثبوت میں ہر در و دیوار سے گواہی سن لے گا ۔ اس دنیا میں جو چیز بھی انسان کے سامنے آتی ہے وہ خدا کی پیدا کی ہوئی اور مظہر ہے،یا کوئی خاصیت خدا نے اس میں پیدا کردی ہے ،یا ایک ایسا نظام ہے جو خدا کے حکم سے ہر چیز میں جاری ہے اورانسان بھی انہی میں سے ایک ہے اوراس کا پورا وجود اس حقیقت کی گواہی دیتا ہے ،کیونکہ نہ اس کا اپنا وجود اپنے آپ سے ہے اورنہ ہی اس سے ظاہر ہونے والی خاصیتیں اس کے اختیار میں ہیں اورنہ اس نے اپنی زندگی کی اس نظام کو خود بنایا ہے جو اس کی پیدائش سے ابھی تک جاری ہے اوروہ یہ فرض کرسکتا ہے کہ اس کائنات کا نظام اتفاقی طورپر وجود میں آگیا ہے ،اورنہ ہی وہ اپنے وجود اور اپنے وجود کے نظام کو اس ماحول کی طرف نسبت دے سکتا ہے جس میں وہ پیدا ہوا ہے ،کیونکہ مذکورہ وجوداور یہ نظام خود اس ماحول کی پیداوار نہیں ہے اورنہ وہ اتفاقاً وجود میں آیا ہے۔

یہاں پر انسان کو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ عالم ھستی کے لئے ایک سرچشمہ تسلیم کرے جو اشیا کو خلق کرنے والا اور ان کی پرورش کرنے والا ہے ۔وہی ہر مخلوق کو پیدا کرتا ہے اوراس کے بعد بقا اورایک خاص نظام کی شاہراہ پراس کے مخصوص کمال کی طرف ہدایت کرتا ہے ،چونکہ انسان عالم ھستی میں اشیاء کو آپس میں ایک دوسرے سے مربوط اور ایک خاص نظام سے منسلک پاتا ہے ،اس لئے مجبورا فیصلہ کرتا ہے کہ خلقت کا سرچشمہ اور اس کے نظام کو چلانے والا ایک ہی ہے۔

انسان پر یہ حقیقت معمولی توجہ سے واضح ہوجاتی ہے، اوراس میں کسی قسم کا ابہام نہیں پایاجاتا۔ سوائے اس کے کہ انسان کبھی زندگی کی کشمکشوں میں ایسا گرفتار ہوتاہے کہ اپنی عقل و شعور کی تمام توانائیوں کو حیاتی مبارزوں کی راہ میں استعمال کرتاہے اور اپنے تمام وقت کو زندگی کی دوڑ دھوپ میں صرف کرتاہے، اوراس قسم کی چیزوں کے بارے میں غور کرنے کی تھوڑی سی بھی فرصت نہیں نکال پاتا اور نتیجہ میں اس حقیقت سے غافل رہتاہے، یا یہ کہ طبیعت کے دل فریب مظاہر سے متاثر ہوکر ہوس رانیوں اور عیاشیوں میں سرگرم ہوتاہے۔ چونکہ ان حقائق کی پابندی انسان کو بہت سی مادی لاابالیوں سے روکتی ہے، اس لئے وہ فطری طورپر ان حقائق کی تحقیق کے سلسلہ میں پہلوتہی کرتا ہے اور اس ذمہ داری کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا۔

اس لئے قرآن مجید میں مخلوقات کی پیدائش اور ان میں جاری نظام کے بارے میں گوناگون طریقوں سے بہت زیادہ توجہ دلائی گئی ہے اور برہان و دلائل پیش کئے گئے ہیں، کیونکہ اکثر لوگ خاص کروہ لوگ جو فطرت کے دل فریب مظاہر کے شیفتہ ہو چکے ہیں اوروہ اپنی زندگی کی سعادت و کامیابی کو عیاشیوں و خوش گزرانیوںمیں پاتے ہیں، اور مادیات و محسوسات سے انس و محبت کی وجہ سے فلسفی فکر او رنظریات کی عقلی تحقیق سے محروم ہیں۔

لیکن انسان ہر حالت میں عالم ھستی کا ایک جزو ہے اور کائنات کے دیگر اجزاء اور اس میں جاری جزئی او رکلی نظاموں سے ایک لمحہ بھی بے نیاز نہیں ہے، اور ہر لمحہ اپنے ذہن کو عالم ھستی اور اس میں جاری نظام کی طرف متوجہ کر سکتا ہے، اور کائنات کے خالق کے وجود کو پاسکتا ہے۔ خدائے متعال اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے:

(اِنَّ فی السمٰوات و الارض لَاٰیٰتٍ للمومنین، و فی خلقکم و ما یبثُّ من دابّة آیت لقوم یوقنون و اختلاف الّیل و النّھار و ما انزل اللہ من السمآء من رزق فاحیا به الارض بعد موتھا و تصریف الریح ء اٰیٰت لقوم یعقلون)

(جاثیہ۳۔۵)

"بیشک آسمانوں او رزمینوں میں صاحبان ایمان کے لئے بہت سی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔ اور خود تمہاری خلقت میں بھی او رجن جانوروں کو وہ پھیلاتا رہتا ہے ان میں بھی صاحبان یقین کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔اور رات دن کی رفت و آمدہیں او رجو رزق خدانے آسمان سے نازل کیا ہے، جس کے ذریعہ سے مردہ زمینوں کو زندہ بنایاہے اور ہواؤں کے چلنے میں اس قوم کے لئے نشانیاں پائی جاتی ہیں جو عقل رکھنے والی ہے۔"

مثال اوروضاحت

قرآن مجیدمیں آیتیں ہیں،جن میں انسان کو چاند، ستاروں،زمین، آسمان، سورج ،پہاڑوں، دریاؤں،نباتات، حیوانات او رخودانسان کی خلقت کے بارے میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے، اور ان میں سے ہر ایک کا جو حیرت انگیزنظام ہے اس کی یاددہانی کرائی گئی ہے۔

حقیقت میں کائنات کا نظام ، جو کائنات کی گوناگون سرگرمیوں کو خلقت کے مقاصد اور کائنات کے اہداف کی طرف بڑھاتاہے، وہ نہایت ہی حیرت انگیز او رتعجب خیز ہے۔ گیہوںکا ایک دانہ یا بادام کی ایک گٹھلی زمین سے اگنے کے بعد ایک پودے یا میوہ داردرخت میں تبدیل ہوجاتاہے۔ اوریہ دانہ یا گٹھلی مٹی میں قرار پانے کے بعد شگافتہ ہو کراس کی سبز نوک باہر نکلتی ہے اور اس میں جاتی ہے، جب یہ پودا اپنے مقصد کی منزل تک پہنچتا ہے تو اس دوران مختلف اور عظیم نظام سرگرم ہوتے ہیں کہ جن کی عظمت و وسعت کا مشاہدہ کرکے عقل متحیر رہ جاتی ہے۔

ستارے، آسمان اور چمکتا ہوا سورج او ردرخشان اور زمیں ہر ایک اپنی وضعی و انتقالی گردشوں او راپنے اندر پوشیدہ توانائیوں سے اور اسی طرح اس دانہ یا گٹھلی میں قرار دی گئی ، پر اسرار طاقتیں ، اور سال کے موسم، اور ان کے حالات، ابرو ہوا اور بارش ، اور شب و روز، گندم کے ایک پودے کے اگنے میں مدد کرتے ہیں ، اس نئے پودے کو پرورش کے لئے اپنے گہوارہ میں سلاتے ہیں ،دایا اور نرسوں کے مانند ایک دوسرے کا تعاون کرتے ہوئے کوشش کرتے ہیئںیہاں تک کہ یہ دانہ اپنی بالیدگی و رشد کے آخری مرحلہ تک پہنچ جائے۔

یہی مثال انسان کے ایک نو مولود بچے کی ہے کہ جس کا نظام پیدائش ایک پودے یا کسی دوسری چیز کی پیدائش سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے ۔یہ خلقت کے منظم وپیچیدہ نظام کے لاکھوں بلکہ کروڑوں سال کی سرگرمیوں کا ماحصل ہے ۔

ایک انسان کی روزمرہ کی زندگی کی گردش۔ اپنے وجود سے باہر عالم ھستی سے رکھنے والے رابطہ کے علاوہ ۔اپنے وجود کے اندر ایک حیرت انگیزنظام سے نشاط سے مربوط ہے کہ دور اندیش سائنسدانوں کی فکریں صدیوں سے مسلسل ان کے ظاہر کا مشاہدہ کرنے میں سرگرم عمل رہی ہیں اور ہر روز ان اسرار سے پردہ اٹھایا جاتا ہے اور ابھی بھی ان کی معلومات مجہولات کی نسبت بہت کم ہیں ۔

قرآن مجید کی نظر میں خدا شناسی کا طریقہ

جس شیر خوار بچہ نے دودھ پینے کے لئے ماں کا پستان پکڑرکھا ہے اور دودھ پی رہا ہے، حقیقت میں وہ دودھ چاہتا ہے، اس کے علاوہ اگر کسی چیز کو ہاتھ میں اٹھاتا ہے تو اسے کھانے کے لئے اپنے منہ تک لے جاتا ہے ،در اصل اس چیز کو اس نے کھانے کے لئے اٹھا یا تھا اور جوں ہی احساس کرتا ہے کہ اس نے غلطی کی ہے اور اٹھائی ہوئی چیز کھانے کی نہیں ہے ،تو اسے پھینک دیتا ہے ۔

اسی ترتیب سے ،انسان جس مقصد کے پیچھے دوڑتا ہے ،اصل میں وہ حقیقت کو چاہتا ہے، اگر اس کے لئے واضح ہو جائے کہ اس نے غلطی کی ہے اور غلط راہ پر چلا ہے ،تو اپنی غلطی اور خطا سے ناراض ہوتا ہے اورغلط مقصد کی راہ کی محنت پر افسوس کرتا ہے اور مختصر یہ کہ انسان ہمیشہ اشتباہ اور خطا سے پرہیز کرتا ہے اور حتی الامکان حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے ۔

یہاں پر معلوم ہوتا ہے کہ انسان فطرت اور جبلت کی رو سے حقیقت پسند ہے ،یعنی لامحالہ ہمیشہ حقیقت کی جستجو اور حق کی پیروی کرنے والا ہوتا ہے ،اس نے اس فطری عادت کو کسی سے یاد اور کہیں سے نہیں سیکھا ہے ۔

انسان اگر کبھی سخت رویہ اختیار کر کے حق کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالتا ہے ،وہ اس لئے ہے کہ وہ خطا واشتباہ سے دو چار ہوتا ہے اور حق و حقیقت اس کے لئے واضح نہیں ہوتی ہے اگر اس کے لئے حق واضح ہوتا تو غلط راستہ پر نہ چلتا ۔

کبھی انسان نفسانی خواہشات کی پیروی میں ایک قسم کی دماغی بیماری سے دوچار ہوتا ہے اور حق کی شیرینی کا مزہ اس کے منہ میں کڑوا بن جاتا ہے ،اس وقت حق کو جانتے ہوئے بھی اس کی پیروی نہیں کرتا ہے ۔اس کے باوجود کہ وہ حق کی حقانیت اور یہ کہ اسے اس کی پیروی کرنی چاہئے ،کااعتراف کرتا ہے ،لیکن اسکی اطاعت کرنے سے سرکشی کرتا ہے۔چنانچہ بہت سے ایسے اتفاقات بھی ہوتے ہیں کہ انسان مضر اورنقصان دہ چیزوں کا عادی ہو کر ،اپنی انسانی فطرت ،جوکہ خطرہ اورضرر سے محفوظ رکھتی ہے ،کو پامال کرتا ہے ،اور ایک ایسے کام کو انجام دیتا ہے ،جس کے بارے میں جانتا ہے کہ وہ نقصان دہ ہے۔ (جیسے :سگریٹ ،شراب اور نشہ آور چیزوں کے عادی لوگ)قرآن مجید انسان کو حق پسندی اور حق کی پیروی کرنے کی دعوت دیتا ہے اور اس سلسلہ میں زیادہ تاکید کرتا ہے اور گوناگون بیانات کے ذریعہ انسان سے درخواست کرتا ہے کہ حق پسندی اور حق کی پیروی کی فطرت کو اپنے اندر زندہ رکھے۔

خدائے متعال فرماتا ہے:

(فماذا بعد الحق الا الضلل) ۔(یونس۳۲)

"اورحق کے بعد ضلالت کے سوا کچھ نہیں ہے ۔"

(والعصر انّ الانسان لفی خسر الّا الذین ء آمنوا وعٰملوا الصّٰلحت وتواصوا بالحق وتواصوا بالصّبر) (عصر ۱۔۳)

"قسم ہے عصر کی ،بیشک انسان خسارہ میں ہے ۔علاوہ ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کئے اور ایک دوسرے کو حق اور صبر کی وصیت و نصیحت کی ۔"

واضح ہے کہ خداوند عالم کی یہ ساری تاکیدیں اس لئے ہیں کہ اگر انسان اپنی حقیقت پسندی کی فطرت کو زندہ نہ رکھے اور حق و حقیقت کی پیروی کی کوشش نہ کرے تو اپنی سعادت و کامیابی کا پابند نہ ہو گا اور وہ نفسانی خواہشات اوراپنی مرضی کے مطابق جوچاہے گا کہے گا اور جو چاہے گا کرے گا۔ اور غلط تصورات اور خرافی افکار میں گرفتار ہو گا اور اس وقت ایک چوپایہ کی طرح اپنی راہ (جو انسانی سرمایہ ہے) سے بھٹک کر، ہوا و ہوس ،لا ابالی اور اپنی نادانی کی بھینٹ چڑھ جائیگا ۔خدائے متعال فرماتا ہے :

(ارء یت من اتّخذ الٰھہ ھوٰہ افانت تکون علیہ وکیلا٭ ام تحسب ان اکثر ھم یسمعون او یعقلون اِنْ ھم الّا کالانعام بل ھم اضلّ سبیلا) (فرقان ۴۳،۴۴)

"کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہشات ہی کو اپنا خدا بنا لیا ہے،کیاآپ اس کی بھی ذمہ داری لینے کے لئے تیار ہیں ؟کیاآپ کاخیال یہ ہے ان کی اکثریت کچھ سنتی اور سمجھتی ہے؟ ہرگز نہیں یہ سب جانوروں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی کچھ زیادہ گم کردہ راہ ہیں ۔"

البتہ جب انسان کی حقیقت پسندانہ فطرت زندہ ہوتی ہے اور حق کی پیروی کرنے کی عادت اس میں کارفرما رہتی ہے ،تو یکے بعد دیگرے اس کے لئے حقائق واضح ہوتے چلے جاتے ہیں اور وہ جس حق و حقیقت کو پالے گا اسے دل سے قبول کرے گا اور سعادت و خوشبختی کی راہ میں روزبروز آگے بڑھتا چلاجائے گا ۔

خداوندمتعال تمام صفات کمالیہ کا مالک ہے

کمال کیا ہے؟

ایک گھر کو اس وقت کامل گھر کہہ سکتے ہیں ،جب ایک گھرانے کی ضروریات زندگی کے تمام چیزیں اس میں موجود ہوں ،چنانچہ اس میں مہمان خانہ،باورچی خانہ ، غسل خانہ وغیرہ کے لئے کافی کمرے موجود ہوں ،جس گھر میں جس قدر یہ وسائل کم ہوں اسی قدر اسے ناقص سمجھا جائے گا ۔

اسی طرح ایک انسان میں اس کی فطری خلقت کے مطابق جن چیزوں کا موجود ہونا ضروری ہے ،اگر وہ سب اس میں پائی جاتی ہوں تو وہ کامل ہے ،اگر ان میں سے کسی ایک کی کمی ہو، یعنی وہ ہاتھ ،پائوں یا آنکھ سے محروم ہو تو اسی اعتبار سے ناقص سمجھا جائے گا ۔

لہذا مذکورہ بیان سے معلوم ہوا کہ صفت کمال وہ چیز ہے کہ جو خلقت کی ضرور تونکو پیدا کرتی ہے اور اس کے نقص کو دور کرتی ہے، علم کی صفت کے مانند کہ جہل کی تاریکی کو دور کر کے عالم کے لئے معلوم کو واضح کردیتا ہے اور "قدرت" کہ صاحب قدرت شخص کے مقاصد اور اغراض کو ممکن بنادیتی ہے اور اسے ان پر مسلط کر دیتی ہے ایسے ہی دوسرے صفات ہیں جیسے صفت حیات وغیرہ۔

ہمارا ضمیر فیصلہ کرتا ہے کہ خالق کائنات (جو ھستی عالم اور مخلوقات عالم کا سرچشمہ ہے، ہر فرض کی گئی ضرورت کو پورا کرتا ہے اور ہر نعمت وکمال کو فراہم کرتا ہے) تمام صفات کمال کا مالک ہے، کیونکہ ایک حقیقت پسند نظر کے مطابق یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ کوئی شخص ایسی نعمت کسی کو بخش دے جو خود نہ رکھتا ہویا جس عیب میں وہ خود بتلا ہو دوسروں سے اس کو دور کرے۔ خدائے متعال اپنے کلام پاک میں اپنے تمام صفات کمال کی ستائش کرتا ہے اور خود کو ہر قسم کے عیب ونقص سے پاک ومنزہ قرار دیتا ہے:

(وربّک الغنیّ ذوالرّحمۃ) (انعام ۱۳۳)

"تیرا پروردگار بے نیاز اور مہربان ہے"

(اللہ لا الہ الّاالہ ھولہ الاسما ء الحسنی) (طہ ۸)

"وہ اللہ ہے جس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے، اس کے لئے بہترین نام ہیں۔"

وہ زندہ، عالم، دیکھنے والا، سننے والا، قادر، خالق اور بے نیاز ہے، پس خدائے متعال کو تمام صفات کمال کا مالک اور اس کی ذات اقدس کو ہر صفت نقص سے پاک و منزہ جاننا چاہیئے، کیونکہ اگر اس میں نقص ہوتا تو اسی لحاظ سے نیاز مند ہوتا اور اس اعتبار سے اس سے بالاتر کسی اور خدا کو ہونا چاہیئے تھا جو اس کی نیاز مندی کو دور کر سکتا۔

(سبحانہ وتعالی عمّا یشرکون) (یونس ۵)

"وہ پاک و پاکیزہ ہے اور ان کے شرک سے بلند وبرتر ہے"

توحید اور یکتائی

(لوکان فیھما آلھۃ الّا اللہ لفسد تا) (انبیاء ۲۲)

"یاد رکھو اگر زمین وآسمان میں اللہ کے علاوہ اور خدا بھی ہوتے تو زمین و آسمان دونوں برباد ہو جاتے۔"

وضاحت

اگر کائنات پر کئی خدائوںکی حکومت ہوتی ،جیسا کہ بت پرست کہتے ہیںکہ کائنات کے ہر شعبہ کا ایک الگ خدا ہے ۔زمین وآسمان اور دریا و جنگل کا الگ الگ خدا ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو کائنات کی ہر جگہ پر خدائوں کے درمیان اختلاف کی وجہ سے الگ الگ انتظام بر قرار ہوتا اور اس صورت میں کائنات کا کام لامحالہ تباہی وبربادی سے دوچار ہوتا ،چونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات کے تمام اجزاء آپس میں ھم آہنگ اور مکمل طورپر موافق ہیں اور سب مل کر ایک نظام کو تشکیل دیتے ہیں ،اس بناپر، کہنا چاہئے کہ خالقِ کائنات ایک سے زیادہ نہیں ہے۔

یہاں پر یہ تصور نہیں کرنا چاہئے کہ فرض کئے گئے خدا، چونکہ عاقل ہوں گے اور وہ جانتے ہوں گے کہ ان کا اختلاف کائنات کو تباہی وبربادی کی طرف لے جائے گا، لہذا وہ ہرگز آپس میں اختلاف نہیں کریں گے ،کیونکہ اس صورت میں وہ ایک دوسرے کے کام میں مؤثر ہوں گے اور ہر ایک دوسرے کی موافقت اور اجازت کا محتاج ہو گا اور اکیلے ہی کوئی کام انجام نہیں دے سکتا ۔جب کہ خدائے تعالی کو احتیاج سے منزہ وپاک ہونا چاہئے ۔

خدائے متعال کا وجود،قدرت اور علم

اس وسیع وعریض کائنات کے آپس میں ملے ہوئے اجزاء ،اور اس کی عام اورحیرت انگیز گردش، اور کائنات کے گوشہ وکنار میں جاری، آپس میں مرتبط اور آنکھوں کو خیرہ دینے والے جزئی نظام اور نتیجہ کے طورپر مختلف انواع کے مظاہر اپنے خاص مقصد کی طرف، انتہائی نظم وترتیب کے ساتھ حرکت میں ہیں ،یہ نظم ہر عقلمند انساں کے لئے واضح کردیتا ہے کہ عالم ھستی اور جو کچھ اس میں ہے اپنے وجود وبقا کے لئے ایک لا فانی وجود سے متصل ہیں ،جس نے اپنی لا محدود قدرت و علم سے کائنات اور کائنات میں موجود ہر شئے کو خلق کیا ہے اوراپنی ہر مخلوق کو پرورش کے گہوارہ میں قرار دیا ہے اور اپنی خاص عنایتوں سے ان کے مطلوب کمال کی طرف ابھارتا ہے،یہ وہی ہے جس کی ھستی لافانی ہے اور ہر چیز کو جانتا ہے اور اس پر قادر ہے،خدائے متعال فرماتا ہے :

(له ملک السمٰوات والارض یحی ویمیت وهو علی کل شیء قدیرٌهوالاوّل والأخر والظّاهر والباطن وهو بکل شی ء علیم) (حدید۳۲)

"آسمان وزمین کا کل اختیار اسی کے پاس ہے اور وہی حیات وموت کا دینے والا ہے اور ہر شے پر اختیار رکھنے والا ہے ۔وہی اول ہے وہی آخر وہی ظاہر ہے وہی باطن اور وہی ہر شے کا جاننے والا ہے۔"

خدا کی قدرت

(وللّٰہ ملک السمٰوات والارض وما بینھما یخلق ما یشآء واللّٰہ علی کل شی ء قدیر) (مائدہ۱۷)

"اور اللہ ہی کے لئے زمین وآسمان اور ان کے درمیان کی کل حکومت ہے۔وہ جیسے بھی چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے"

وضاحت

جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص موٹر کار خریدنے کی قدرت رکھتا ہے ،تو ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے ،کہ جو موٹر کار خریدنے کا محتاج ہے اس کے پاس اس کے خریدنے کی مالی طاقت ہے، اور اگر ہم یہ کہیں کہ فلاں شخص بیس کلو گرام وزنی پتھر اٹھانے کی طاقت رکھتا ہے ،تو ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس میں بیس کلو گرام پتھر اٹھانے کی طاقت موجود ہے ۔
حقیقت میں ، کسی چیز پر توانائی و قدرت رکھنے کے یہ معنیٰ ہیں کہ اس کے تمام ضروری وسائل اس کے پاس ہیں،اور چونکہ عالم ھستی میں جس وجود کو بھی فرض کیاجائے ،اس کی نیاز مندی اور زندگی کی گردش کی ضرورت خدا کے وجود سے پوری ہوتی ہے ،یہ کہنا چاہئے کہ خدائے متعال ہر چیز کی قدرت و توانائی رکھتا ہے اور اسی کی ذات پاک کائنات کا سر چشمہ ہے۔

خدا کا علم

((لا یعلم مَن خلق) ۔(ملک۱٤)

"کیاپیدا کرنے والا نہیں جانتا ہے؟"

وضاحت

چونکہ ہر مخلوق اپنی پیدائش و ھستی میں خدائے متعال کی لا محدود ذات کی محتاج ہے،اس لئے اس مخلوق اور خدا کے درمیان پردے اور رکاوٹ کا تصور نہیں کیا جاسکتا ہے یا اس کا خدا سے پو شیدہ ہونا تصور نہیں کیا جاسکتا،بلکہ اس کے لئے ہر چیز آشکار ہے اور ہر چیز کے داخل وخارج پر تسلّط اور احاطہ کرتا ہے۔

خدا کی رحمت

جب ہم ایک ناتوان محتاج کو دیکھتے ہیں ،تو اپنی توانائی کے مطابق اس کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں ،یا کسی مصیبت زدہ بے چارہ کی مدد کرتے ہیں یا ایک نابینا کا ہاتھ پکڑ کر اسے اس کی منزل مقصود تک پہنچاتے ہیں ۔ایسے کاموں کو ہم مہربانی اور رحمت شمار کر کے پسندیدہ اور قابل ستائش جانتے ہیں ۔

جن کاموں کو کارساز اور بے نیاز خدا انجام دیتا ہے ،وہ رحمت کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتے، کیونکہ وہ اپنی بے شمار نعمتوں کو بخش کر سبھی کو بہرہ مند کرتا ہے اور ہر بخشش سے۔ خود کسی کا نیاز مند ہوئے بغیر۔ مخلوقات کی ضرورتوں کے ایک حصہ کو پورا کرتا ہے ،چنانچہ فرماتا ہے:

(وإ ن تعدوا نعمت الله لا تحصوھا) ۔(ابراھیم ٣٤)

"اگر تم اس کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو گے تو ہرگز شمار نہیں کر سکتے۔"

(ورحمتی وسعت کلّ شیئ) ۔(اعراف١٥٦)

"اور میری رحمت نے تمام چیزوں کا احاطہ کیا ہے۔"

تمام صفات کمالیہ

(وربّک الغنیّ ذوالرّ حمة) ۔(انعام١٣٤)

"تمہارے پروردگار بے نیاز اور صاحب رحمت ہے"

وضاحت

کائنات میں موجود ہر خوبی اور زیبائی ،جس کمال کی صفت کے بارے میں تصور کریں ،وہ ایک نعمت ہے جسے خدائے متعال نے اپنی مخلوقات کو عطا کیا ہے اور اس کے ذریعہ خلقت کی ضرورتوں میں سے کسی ایک کو پورا کیا ہے ،البتہ اگر وہ خود اس کمال کا مالک نہ ہوتا ،تو اس کمال کو دوسروں کو بخشنے میں عاجز ہوتا اور خود بھی ضرورتوں میں دوسروں کا شریک بن جاتا ،پس خداوند عالم کے تمام صفات کمال خود اسی کے ہیں اور اس نے کوئی کمال کسی دوسرے سے حاصل نہیں کیا ہے اور اس نے کسی کے سامنے دست نیاز دراز نہیں کیا ہے، بلکہ خود تمام صفات کمال ، جیسے:حیات، علم ،قدرت وغیرہ کا مالک ہے اور تمام صفات عیب اور نیاز مندی واحتیاج کے اسباب جیسے:ناتوانی ،نادانی ،موت، گرفتاری وغیرہ سے پاک ومنزہ ہے ۔

۲۔نبوت

انسان کوپیغمبر کی ضرورت

خدائے متعال نے اپنی کامل قدرت سے جو کہ ہر اعتبار سے بے نیاز ہے کائنات اور کائنات میں گوناگوں مخلوقات کو خلق کیا اور انھیں بیشمار نعمتوں سے نوازا ہے۔

انسان اور تمام دوسری جان دار و غیر جان دار مخلوقات کی پرورش پیدائش کے دن سے لیکر کائنات کے آخری دن تک ، خدا ہی کرتا ہے ، اور ان میں سے ہر ایک ، خاص نظم و نسق اور خاص تربیت سے ایک معلوم و معین مقصد کی طرف ہدایت پاتے ہیں اور اسی کی طرف بڑھتے ہیں جبکہ تمام لمحات میں وہ اپنی شایان شان عنایتوں سے نوازے جاتے ہیں ۔

اگر ہم صرف اپنی زندگی کے بارے میں غور وخوض کریں ، یعنی شیر خوارگی ، بچپن ، جوانی اور بوڑھاپے کے دور پر نظر ڈالیں ، تو خدائے متعال کا وہ کامل لطف و کرم جو ہمارے شامل حال ہے، کے بارے میں ہمارا ضمیر گواہی دے گا ، اور جب یہ مسئلہ ہمارے لئے واضح ہو جائے گا تو یقینا ہماری عقل فیصلہ دے گی کہ خالق کائنات ، اپنی مخلوق کے لئے سب سے زیادہ مہربان ہے ۔اسی مہربانی کی وجہ سے ہمیشہ ان کے حالات کے مطابق مصلحت کی رعایت کرتا ہے اور حکمت و مصلحت کے بغیر ہر گز ان کے فساد و تباہی کے کاموں سے راضی نہیں ہوتا ۔ انسان، خدا کی ایک ایسی مخلوق ہے ۔کہ جس کی فلاح و بہبود اور سعادت اس میں ہے کہ حقیقت پسند اور نیک منش ہو ، یعنی اس میں صحیح عقائد ، پسندیدہ اخلاق اور نیک کردار ہونا چاہئے۔

ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ انسان اپنی خدا داد عقل سے اچھے اور برے کو پہچان سکتا ہے اور چاہ کو راہ سے تشخیص دے سکتا ہے ، لیکن یہ جاننا چاہئے کہ عقل اکیلے ہی اس گرہ کو کھول کر انسان کی حقیقت پسندی اور نیکی کی طرف رہنمائی نہیں کر سکتی ، کیونکہ انسانی معاشرے میں جو مشاہدہ کیا جارہا ہے وہ یہ ہے کہ زیادہ تر برائیاں ان لوگوں سے انجام پارہے ہیں ، جو عقل و شعور اور برے بھلے کی تمیز رکھتے ہیں ، لیکن خودپرستی ، منافع پرستی اور ہوس رانی کے نتیجہ میں ان کی عقل اس کے جذبات اور ہوا وہوس کی تابع ہو کر گمراہی سے دوچار ہو تی ہے ۔ لہذا خدائے متعال کو ایک دوسرے راستہ سے یا ایک ایسے وسیلہ سے سعادت کی طرف ہماری راہنمائی کرنا چاہئے جو کبھی ہوا وہوس سے مغلوب نہ ہو اور اپنی رہبری میں کبھی اشتباہ و غلطی کا شکار نہ ہو ، ایسا راستہ صرف نبوت کا ہے۔

انبیاء کی تبلیغ

ہماری عقل جو فیصلہ کرتی ہے اوراس کے مطابق حکم دیتی ہے کہ انسان کے لئے "نبوت" کے نام کا ایک راستہ کھلا ہونا چاہئے ۔ یہ چیز عملاً بھی موردتاکید قرار پاکر انجام پایا ہے۔ انسانوں میں سے (انبیائ)نامی کا ایک گروہ خدائے متعال کی طرف سے منتخب ہوا ہے ۔ جنہوںنے لوگونکی ہدایت کے لئے اعتقادی کچھ عملی قوانین وضوابط پیش کئے اور ان کو صحیح راستے پر چلنے کی دعوت دی ہے ان پیغمبروں نے اپنے دعوی کے صحیح ہونے اوراپنے دین کے سچے ہونے کو معقول طریقوں سے لوگوں کے لئے ثابت کیا ،اور اپنے تربیتی مکتب میں کچھ شائستہ افرادکی پرورش کی ۔

عقل معاش، جسے ہم عقل علمی بھی کہتے ہیں (وہ شعور جس سے ہم اپنی زندگی کو چلاتے ہیں)ہمیں یہ اجازت دیتی ہے کہ ہم اپنی زندگی کے فائدے کے لئے ہر قابل استفادہ چیز سے استفادہ کریں، جیسے:فضا،ہوا،درختوں،ان کے پھل،پتوںاور لکڑیوں حیوانات،ان کے گوشت،دودھ ،اون اورکھال سے استفادہ کریں ۔اسی طرح ہم اپنی بے شمار ضرورتوں کے پیش نظر اپنے ہم نوع انسانوں کی سرگرمیوں سے بھی اپنے نفع میں استفادہ کرتے ہیں ۔

ان چیزوں کے مصرف اور استفادہ کا حکم ہمیں ہماری عقل و شعورنے دیا ہے اور اسی نے ان کے جائز ہونے کی تصدیق کی ہے ،اس لئے ہے کہ اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ بھوک کے وقت تم کیوں کھانا کھاتے ہو ؟ پیاس کے وقت کیوں پانی پیتے ہو؟یا ہوا میں کیوں سانس لیتے ہو؟تو اس کے یہ سوالات مضحکہ خیز ہوں گے۔

لیکن جب ہم اپنے ہم نوع انسان کے کام وکوشش سے استفادہ کرنے کے لئے ان سے پہلی بار رابطہ برقرار کرتے ہیں تو معلوم ہوتاہے کہ وہ بھی ہماری طرح ہیں جس طرح ہم ان کی سرگرمیوں کے نتیجہ سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں ،اسی طرح وہ بھی ہماری سر گرمیوں کے نتیجہ سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں ۔کیونکہ ہم اپنی سرگرمیوں کے نتیجہ کو انھیں مفت میں دینے کے لئے تیار نہیں ہیں،لہٰذا ان کے پاس بھی جو کچھ ہے وہ اسے مفت میں دینے کے لئے تیار نہیں ہیں ۔

یہی وجہ ہے کہ ہم اجتماعی طورپر ایک دوسرے کا تعاون کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور اپنے ہم نوع انسان کی زندگی کی ضرورتونکو پورا کرنے میں ان کی مدد کرتے ہیں تاکہ اس کے مقابلہ میں وہ بھی ہماری مدد کریں ۔

اسی احتیاج وضرورت کے پیش نظر، مختلف انسان آپس میں جمع ہو گئے اور ایک دوسرے کی مدد اور کام سے استفادہ کرتے ہیں ،حقیقت میں مختلف افراد کے کام اور ان کی کوششیں ایک دوسرے پر بٹ جاتی ہیں ،اور اس کے بعدہر ایک اپنی حیثیت اور اجتماعی سرگرمی کے مطابق اس سے استفادہ کرتا ہے ۔

معاشرے میں قوانین و قواعد کی ضرورت

جیسا کہ بیان کیا جاچکا کہ انسان مجبور ہو کر اجتماعی تعاون پر آمادہ ہوتا ہے ورنہ فطری طور پر وہ صرف اپنی زندگی کے نفع کا خواہان ہے ، لہذا جب بھی اسے موقع ملتا ہے وہ دوسروں کے منافع پر تجاوز کرتا ہے جبکہ اس نے اپنے منافع سے کوئی چیزدوسروں کو انہیں دی ہے کہ تعادل برقراررہے ۔اسی لئے ہر معاشرے میں کچھ قوانین و مقررات کا ہونا ضروری ہے تاکہ ان کی رعایت کرنے سے ،انسان کی اجتماعی قدرو قیمت محفوظ رہے،اور ان کو تجاوز کرنے سے روکا جا سکے۔ قوانین وضوابط کو لوگوں کے اتفاق نظریا ان کی اکثریت کی رائے سے منظور کیا جانا چاہیئے تاکہ ہر فرد اپنے انفرادی واجتماعی فرائض سے آگاہ ہو جائے۔

قواعد وضوابط کی تکوینی بنیاد

قوانین وضوابط ایسے فرائض ہیں جو انسانی زندگی کی مصلحتوں کی حفاظت کے لئے وضع ہوئے ہیں ۔اس لحاظ سے ان کی قدروقیمت اجتماعی ہے نہ فطری وتکوینی ۔یعنی فطرت میں حکم فرماقوانین کا خودبخود کوئی اثر نہیں ہے ،بلکہ جب معاشرے کے لوگ انھیں جاری کرتے ہیں تو یہ جاری ہوتے ہیں ورنہ یہ ایک بے اثر افسانہ کے علاوہ کچھ نہیں ہوتے۔

اس کے باوجود یہ قوانین وضوابط ،فطرت وتکوین سے بے ربط بھی نہیںہیں،بلکہ ان میں تکوین کی اصل موجود ہے ۔ فطرت اورانسان کی فطری ضرورت ان کا سرچشمہ ہے .یعنی خدائے متعال نے انسان کی خلقت کچھ اس طرح کی ہے کہ خواہ نخواہ اجتماعی افکار کے ایک سلسلہ کو وجودمیں لاکر انھیں قابل استفادہ قرار دیتا ہے اور اپنی تکوینی زندگی کو ان پر تطبیق کرتا ہے اور اپنے وجودی مقاصدتک پہنچتا ہے۔

زندگی کے قوانین کی طرف تکوینی ہدایت

ہم جانتے ہیں کہ خدائے متعال اپنی عنایت کاملہ اور بے پناہ محبت کی بدولت اپنی ہر مخلوق کواس کے وجودی مقصدتک پہنچاتا ہے اور انسان بھی اس قانون سے مستثنی نہیں ہے ،پس خدائے متعال کے لئے ضروری ہے کہ انسان کے لئے کچھ ایسے قوانین وضوابط وضع کرے جو اس کی زندگی کی راہ ورسم کو تشکیل دے اور ان پر عمل کے ذریعہ انسان کی مصلحتیں اور منافع پورے ہو سکیں اوران کو حاصل کرنے کے لئے صرف عقل کافی نہیں ہے ۔کیونکہ کبھی خودعقل بھی درک کرنے میں خطا کرتی ہے اور اکثر اوقات عقل عادت ،تقلید اور وراثت میں ملی صفات سے متاثر ہو کر ہواوہوس سے مغلوب ہو کر انسان کو ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے ۔جیسا کہ ہم جان چکے کہ، عقل انسان کو منافع طلبی کے قانون کی طرف رہنمائی کرتی ہے ، اور اگر انسان کبھی دوسروں کے لئے حق کا قائل ہوتا ہے اور عام قانون کی پیروی کرتا ہے،تو وہ بنابر مجبوری اور اپنے شخصی منافع کو حاصل کرنے کے لئے ہوتا

ہے ، اسی وجہ سے اکثر لوگ جب قدرت و توانائی کے عروج پر پہنچتے ہیں تو اپنے مقابلہ میں کسی حریف اور مخالف کو کچھ نہیںسمجھتے ،ہر قانون وحکم کی سرکشی کرتے ہیں اور دوسروں کے منافع کو اپنے لئے مخصوص کراتے ہیں اور ان کے حقوق کو پامال کرتے ہیں ۔

لہذا خدائے متعال کو چاہئے کہ لوگوں کو ان کی زندگی کی راہ و رسم کے بارے میں ایک ایسے طریقہ سے راہنمائی کرے،جو ہر قسم کی خطاو لغزش سے محفوظ ہو اور وہ طریقہ (نبوت) ہے، اور وہ یہ ہے کہ خدائے متعال اپنے بعض بندوں کو راہ فکر و عقل کے علاوہ ایک اور راہ (راہ وحی) سے معارف و احکام کے ایک سلسلہ کی تعلیم دے تا کہ ان پر عمل کے ذریعہ لوگوں کی حقیقی سعادت کی طرف رہنمائی کر سکے۔

نتیجہ

مذکورہ بیان سے معلوم ہوا کہ خدائے متعال کو چاہئے کہ اپنے بعض بندوں کو غیبی تعلیم کے قوانین سے آگاہ کر کے بھیجے جو انسانی سعادت کے ضامن ہیں ۔خدا کے پیغام لانے والے انسان کو پیغمبر یا خدا کارسول کہتے ہیں ، اور خدا کی طرف سے لائے گئے پیغامات کے مجموعہ کو"دین "کہتے ہیں ۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ خدا کی طرف سے بھیجے گئے دینی معارف اور الٰہی قوانین کو صحیح طور پر تبدیلی، اور کمی بیشی کے بغیر لوگوں کے پاس پہنچنا چاہئے ۔یعنی خدا کا پیغمبر وحی الہی کو حاصل کرنے میں خطا نہ کرے اور اس کی حفاظت میں بھول چوک اور لغزش سے دوچار نہ ہو اور اس کو لوگوں تک پہنچانے میں غلطی یا خیانت نہ کرے۔جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ ضروری معارف اور زندگی کے قوانین کی طرف لوگوں کی ہدایت نظام خلقت کا جزو ہے اور یہ انسان کی تخلیق کا ایک مقصد ہے۔ خلقت اپنی راہ کو طے کرنے میں ہر گز خطا اور لغزش کو قبول نہیں کرتی ، مثال کے طور پر یہ ممکن نہیں ہے کہ نظام خلقت ، انسان کے تناسل سے ایک پتھر یا پودے کو وجود میں لائے یا گیہوں کے دانہ کو بونے کے بعد ایک حیوان پیدا ہو یا انسان کی آنکھ موجودہ حالت میں معدہ کا کام انجام دے یا کان دل کا کام انجام دے۔

اس چیز سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے انبیاء کو معصوم ہونا چاہئے ۔یعنی جس کام کو وہ خود واجب جانتے ہوں اسے ترک نہ کریں اور جس کام کو وہ خود گناہ جانتے ہوںٓانہیں انجام نہ دیں ، کیونکہ ہم (انسان) اپنے ضمیر سے جانتے ہیں کہ جو اپنی بات پر عمل نہ کرے، حقیقت میں وہ اس بات کے صحیح اور سچ ہونے کا قائل نہیں ہے ۔اس صورت میں اگر پیغمبر گناہ کا مرتکب ہو جائے ،تو کوئی اس کی بات پر یقین نہیں کرے گا اور تبلیغ کا مسئلہ بے اثر ہوگا اور اگر بعد میں توبہ اور اظہار ندامت بھی کرتا ہے تو بھی ہمارا دل اس کی طرف سے صاف نہیں ہوگا اور ہر حالت میں تبلیغ کا مقصد فوت پر جائے گا ۔خدائے متعال فرماتا ہے :

(عالم الغيب فلا يظهر علی غيبه احدً اًالّا من ارتضی من رسول فانّه يسلک من بين يديه ومن خلفه رصدً اً ليعلم ان قد ابلغوا رسٰلت ربّهم)(جن ٢٨٢٦)

"وہ عالم الغیب ہے اور اپنے غیب پر کسی کو بھی مطلع نہیں کرتا ۔مگر جس رسول کو پسند کر لے تو اس کے آگے پیچھے نگہبان فرشتے مقرر کردیتا ہے ،تاکہ وہ دیکھ لے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغامات کو پہنچا دیا ہے ۔"

انسان اور دوسری مخلوقات کی ہدایت میں فرق

توحید کی بحثوں سے واضح ہوتا ہے کہ اشیاء کی تخلیق خدا کی طرف سے ہے ، لہذا ان کی پرورش بھی اسی سے مربوط ہے۔ واضح الفاظ میں یہ کہا جائے کہ کائنات کی ہر مخلوق ، اپنی پیدائش کے آغاز سے اپنی بقا اور نقائص کو دور کرنے میں سرگرم عمل ہوتی ہے اورا اپنی کمیوں وضرورتوں کو یکے بعد دیگر رفع کرتی ہے اور امکان کی حدتک اپنے آپ کو کامل اور بے نیاز کرتی ہے ۔ اپنی بقا کے سفر میں ایک منظم حرکت کے تحت اپنے وجود کو جاری رکھتی ہے ، اس سفر کو منظم کرنے والا اور ہر منزل پر اسکا رہبر خدائے متعال ہے۔

اس نظریہ کے مطابق ایک قطعی نتیجہ نکلتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کائنات کی ہر قسم کی مخلوق ایک خاص تکوینی پرو گرام کے تحت باقی ہے اور اس میں اپنی خاص سرگرمی ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ،کائنات کے مظاہر میں سے ہر معیّن گروہ کے لئے ، اپنی بقا کے سفر میں کچھ معیّن فرائض ہیں جو خدائے متعال کی طرف سے انھیں عطا ہوتے ہیں ۔ چنانچہ قرآن مجید اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

(ربّنا الّذی عطی کلّ شی ءٍ خلقه ثمّ هدی) (طہ٥٠)

"...ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کی مناسب خلقت عطا کی ہے اورپھر ہدایت بھی دی ہے "

خلقت کے تمام اجزااس کلی حکم میں شامل ہیں اور ان میں سے ہر گز کوئی مستثنیٰ نہیں ہے آسمان کے ستارے اور ہمارے پیروں تلے زمین اور ان میں موجود عناصر اور ابتدائی مظاہر کو ظاہر کرنے والی ترکیبیں اورنباتات وحیوانات ، سبھی کی یہی حالت ہے ۔ اس عام ہدایت میں انسان کی حالت بھی دوسری مخلوقات کے مانند ہے ، سوائے یہ کہ انسان اور دوسری مخلوقات کے درمیان ایک فرق ہے۔

انسان اور دوسری مخلوقات میں فرق

مثال کے طور پر کرۂ زمین کو لاکھوں سال پہلے خلق کیا گیا ہے ،جو اپنی تمام پوشیدہ توانائیوں کو استعمال میں لا کر اپنے دائرہ حدود میں جب تک مخالف عوامل مانع نہیں ہوتے اس وقت تک سرگرم عمل ہے اور اپنی وضعی و انتقالی حرکت کے نتیجہ میں اپنے وجودی آثار کو ظاہر کرتا ہے اور اس طرح اپنی بقا کی ضمانت حاصل کرتا ہے اور جب تک کوئی اس سے قوی مخالف عامل رکاوٹ نہ بنے ،اسی سرگرمی کو جاری رکھے گا ،اور اپنے فرائض کو نبھانے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرے گا ۔

بادام کا درخت گٹھلی سے باہر آنے کے وقت سے کامل درخت کی صورت اختیار کرنے تک،تغذیہ ،رشد و نمو وغیرہ میں ،دوسرے الفاظ میں اپنے تکامل کے سفر کی راہ میں کچھ فرائض انجام دیتا ہے کہ اگر کوئی قوی تر مخالف عامل رکاوٹ نہ بنے تو اپنے فرائض کو انجام دینے میں ہرگز کوتاہی نہیں کریگا اور کوئی کوتاہی کر بھی نہیں سکتا۔ہر دوسری مخلوق کی بھی یہی حالت ہے ۔لیکن انسان ،اپنی خصوصی سرگرمیوں کو اپنے اختیار سے انجام دیتا ہے اور جو کام انجام دیتا ہے ،اس کا سرچشمہ اس کی فکر اور اس کا فیصلہ ہوتا ہے ۔ممکن ہے انسان کبھی ایک ایسے کام کو انجام دینے سے پہلو تہی کرے ،جو سو فیصدی اس کے نفع میں ہو اور کوئی مخالف عامل بھی رکاوٹ نہ بنے اور اس کے مقابلہ میں ایک ایسے کام کو جان بوجھ کر انجام دے جس میں سو فیصدی ضرر اور نقصان ہو ،مثلا کبھی دوائی کھانے سے پرہیز کرتا ہے اور کبھی جام زہر نوش کرکے خودکشی کرتا ہے ۔

البتہ واضح ہے کہ جو مخلوق مختار پیدا کی گئی ہے ہو،عام ہدایت اس کے لئے جبری نہیں ہوگی۔یعنی انبیاء ،خیر و شر اور سعادت و بدبختی کی راہ کو خدائے متعال کی طرف سے لوگوں کو بیان کرتے ہیں اور دین کے پیرئوں کو ثواب کا مژدہ سنا کر پروردگار کی رحمت سے امیدوار بناتے ہیں سرکشوں اور باغیوں کو خدا کے عذاب سے ڈراتے ہیں اور وہ ان میں سے ہر ایک کو اختیار کرنے میں آزاد و مختار ہوں گے ۔

صحیح ہے کہ انسان اپنے خیر و شر اور نفع و نقصان کو اجمالا عقل سے سمجھتا ہے۔لیکن یہی عقل، اکثر اوقات اپنے کو گم کر کے نفسانی خواہشات کی پیروی کرتی ہے ،اور کبھی غلط راستہ پر چلتی ہے لہذا خدا کی ہدایت عقل کے علاوہ کسی اور راستہ سے بھی انجام پانی چاہیئے اور وہ اس راستہ کو خطا و لغزش سے بالکل محفوظ ہونا چاہیئے ۔یا دوسرے الفاظ میں خدائے متعال اپنے احکام کو اجمالی طور پر عقل سے لوگوں کو سمجھاتا،اور ایک دوسرے راستہ سے اس کی تصدیق فرماتا ۔

یہ راستہ،وہی "نبوت"کا راستہ ہے کہ خدائے متعال اپنے سعادت بخش احکام کو وحی کے ذریعہ اپنے بندوں میں سے کسی ایک کو سمجھاتا ہے اور اسے مامور کرتا ہے کہ انھیں لوگوں تک پہنچائے اور انھیں امید و خوف کے ذریعہ شوق دلا کر اور ڈرا کر ان احکام پر عمل کرنے کے لئے مجبور کرے۔خدائے متعال اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے:

(انّا وحينا ليک کما وحينا الی نوحٍ و النّبيّن من بعدهرسلاً مبشّرين ومنذرين لئلا يکون للنّاس علی الله حجّة بعد الرّسل) (نسائ١٦٥١٦٣)

"ہم نے آپ کی طرف اسی طرح وحی نازل کی ہے جس طرح نوح اور ان کے بعد کے انبیاء کی طرف وحی کی تھی ...یہ سارے رسول بشارت دینے والے اورڈرانے والے اس لئۓ بھیجے گئۓ تاکہ رسولونکے آنے کے بعد انسانوں کی حجت خداپر قایم نہ ہونے پائۓ "

پیغمبر کی صفات

مذکورہ بیان سے واضح ہوا کہ پیغمبر میں حسب ذیل صفات ہونی چاہئیں :

۱۔اپنے فریضہ کو انجام دینے میں خطا سے محفوظ اور معصوم ہونا چاہیئے اور ہر طرح کی فراموشی اور دوسری ذہنی آفتوں سے بھی محفوظ ہونا چاہیئے تاکہ جو چیز اس پر وحی ہوتی ہے اس کو صحیح طور پر حاصل کر کے ،کسی لغزش و غلطی کے بغیر لوگوں تک پہنچا دے ،کیونکہ اگر ایسا نہ کیا تو الٰہی ہدایت اپنے مقصد تک نہیں پہنچ سکتی اور عام ہدایت کا قانون اپنی کلی حیثیت کو کھو کر انسان پر اثر انداز نہیں ہو سکتا ہے۔

۲۔پیغمبر کو اپنے کردار وگفتار میں لغزش اور گناہ سے محفوظ ہونا چاہیئے چونکہ گناہ کی صورت میں تبلیغ موثّر واقع نہیں ہوتی ،جس کے قول وفعل میں اختلاف ہو ،لوگ اس کے قول کو قابل قدر نہیں جانتے حتی اس کے کردار کو بھی جھوٹ کی دلیل سمجھ کر کہتے ہیں: (اگر وہ سچ کہتا تو وہ اپنی بات پر عمل کرتا)

ان دو مطالب کو ایک عبارت میں جمع کیا جا سکتا ہے :تبلیغ کے صحیح وموثّر واقع ہونے کے لئے پیغمبر کا خطا اور معصیت سے معصوم ہونا ضروری ہے ،جیسا کہ قرآن مجید کی دلیل بھی بیان کی گئی ۔[1]

۳۔پیغمبر کو اخلاقی فضائل کا مالک ہونا چاہیئے، جیسے:عفت، شجاعت،عدالت وغیرہ کیونکہ یہ سب پسندیدہ صفات شمار ہوتی ہیں اور جو ہر قسم کی معصیت سے محفوظ ہو اور دین کی مکمل طور پر اطاعت کرتا ہو اس کا دامن کبھی اخلاقی ،برائیوں سے داغدار نہیں ہو سکتا ۔

انبیاء ،انسانوں کے درمیان

تاریخ کی رو سے مسلّم ہے کہ لوگوں کے درمیان کچھ پیغمبر تھے جنہوں نے دعوت کے ذریعہ انقلاب برپا کیا ہے ، لیکن پھر بھی ان کی زندگی کے بارے میں تاریخ زیادہ واضح نہیں ہے ۔صرف حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کی تاریخ میں کسی طرح کا ابہام نہیں ہے ۔اور قرآن مجید، جو آنحضرت ﷺ کی آسمانی کتاب ہے اور اس میں آپ ﷺ کے دین کے عالی مقاصد درج ہیں ،گزشتہ انبیاء کی دعوت کے موضوع کو بھی واضح کرتا ہے اور ان کے مقاصد کو بھی بیان کرتا ہے ۔

قرآن مجید بیان کرتا ہے کہ خدائے متعال کی طرف سے بہت سے انبیاء ر لوگوں کی طرف آئے ہیں اور انہوں نے متفقہ طور پر توحید اور دین کی دعوت کی ہے،چنانچہ فرماتا ہے :

(ومآارسلنا من قبلک من رّسول الّانوحی الیه انّه لاالٰه الّا انا فاعبدون) (انبیاء۲۵)

"اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر یہ کہ اس کی طرف وحی کرتے رہے کہ میرے علاوہ کوئی خدا نہیںہے، لہذا سب لوگ میری ہی عبادت کرو۔"

صاحب شریعت انبیائ

قرآن مجید بیان فرماتا ہے کہ خدا کے سارے نبی آسمانی کتاب کے حامل نہیںتھے اور نہ ہی مستقل شریعت لے کر آئے تھے ۔خدائے متعال فرماتا ہے:

(شرع لکم من الدّین ماوصّی به نوحاً والّذی وحینا الیک وما وصّینا به ابرهیم و موسٰی وعیسٰی) (شوریٰ ۱۳)

"اس نے تمھارے لئے دین میں وہ راستہ مقرر کیا ہے جس کی نصیحت نوح کوکی ہے اور جس کی وحی پیغمبر! تمھاری طرف بھی کی ہے اور جس کی نصیحت ابراہیم ،موسی اور عیسی کو بھی کی ہے ..."

اس بنا پر بڑے انبیاء میں سے پانچ نبی جو صاحب شریعت اور آسمانی کتابوں کے حامل تھے، حسب ذیل ہیں :

۱۔حضرت نوح علیہ السلام

۲۔حضرت ابراہیم علیہ السلام

۳۔حضرت موسی (کلیم)علیہ السلام

٤۔حضرت عیسی(مسیح)علیہ السلام

۵۔حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ان انبیاء میں سے ہر ایک کی شریعت اپنے گزشتہ نبی کی شریعت کو مکمل کرنے والی تھی ۔

اولوالعزم پیغمبر اور دوسرے انبیائ

ہم یہ بیان کر چکے کہ جو پیغمبر آسمانی کتاب اور مستقل شریعت لے کر آئے تھے وہ پانچ ہیںلیکن خدا کے رسول صرف یہی پانچ افراد نہیں تھے ،بلکہ ہر امت کا ایک نبی تھا اور خدا کی طرف سے لوگوں کے لئے بہت سے انبیاء بھیجے گئے ہیں ،کہ ان سے میں صرف بیس افراد کا نام قرآن مجید میں موجود ہے ،چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے :

(منهم من قصصنا علیک ومنهم من لم نقصص علیک) ۔(غافر۷۸)

"...جن میں سے بعض کا تذکرہ آپ سے کیا ہے اور بعض کاتذکرہ بھی نہیں کیا ہے "

(ولکلّ امّةٍ رسول) ۔(یونس٤۷)

"اور ہر امت کے لئے، ایک رسول ہے۔"

(ولکلّ قومٍ هاد) ۔(رعد۷)

"اور ہر قوم کے لئے ایک ہدایت کرنے والا ہے..."

جی ہاں، اولواالعزم پیغمبروں میں سے ہر ایک کے بعد جتنے بھی پیغمبر آئے ہیں، انہوں نے انسانوں کو انہی پیغمبروں کی شریعت کی طرف دعوت دی ہے اور اس طرح، بعثت ودعوت کا سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ خدائے متعال نے پیغمبر اکرم حضرت محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گزشتہ پیغمبروں کے سلسلہ کو ختم کرنے اور آخری احکام وکامل ترین دینی ضوابط کو پہنچانے کے لئے مبعوث فرمایا اور آپ ﷺ کی آسمانی کتاب کو آخری آسمانی کتاب قرار دیا نتیجہ میں، آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا دین قیامت تک جاری رہے گا اور آپ ﷺ کی شریعت ہمیشہ کے لئے زندہ رہے گی۔

۱۔ حضرت نوح علیہ السلام

سب سے پہلے پیغمبر جسے خدائے متعال نے شریعت اور آسمانی کتاب کے ساتھ عالم بشریت میں بھیجا، حضرت نوح علیہ السلام تھے۔

حضرت نوح علیہ السلام لوگوں کو توحید، یکتا پرستی کی ترغیب اور شرک وبت پرستی سے پرہیز کرنے کی دعوت دیتے تھے۔چنانچہ قرآن مجید میں ان کے قصوں سے واضح ہے کہ طبقاتی اختلافات کو ختم کرنے اور ظلم وستم کو جڑ سے اکھاڑنے کے لئے آپ ﷺ سخت جہاد ومبارزہ کرتے تھے اور استدلال کے زریعہ جو اس زمانہ کے لوگوں کے لئے نیا تھا، اپنی تعلیمات پہنچاتے تھے۔

آپ ﷺ نے ایک طولانی مدت تک جاہل، ضدی اور سرکش لوگوں سے دست بگریبان ہونے کے بعد ایک چھوٹے گروہ کی ہدایت کی اور خدائے متعال نے ایک طوفان کے ذریعہ کفار کو ہلاک کر کے زمین کو ان کے ناپاک وجود سے پاک فرمایا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے کچھ پیروؤں کے ساتھ نجات پانے کے بعد دنیا میں ایک نئے دینی معاشرہ کی بنیاد ڈالی۔

یہ معزز پیغمبر، شریعت توحید کے بانی اور خدا کے پہلے کچھ مورہیں، کہ جنہوں نے ظلم وستم اور سرکشی کا مقابلہ کیا اور دین حق وحقیقت کی عظیم خدمت کی لہذا خدائے متعال کی طرف سے خاص درودوسلام کے مستحق قرار پائے اور رہتی دنیا تک زندہ وپائندہ رہیں گے:

(سلٰم علی نوحٍ فی العٰلمین) (صافات ۷۹)

"ساری خدائی میں نوح پر ہمارا سلام"

۲۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام

حضرت نوح علیہ السلام کے بعد ایک طویل عرصہ گزر چکا تھا ۔اور اس عرصہ میں اگرچہ بہت سے انبیاء جیسے حضرت ہود علیہ السلام ، حضرت صالح علیہ السلام اوران کے علاوہ دوسرے انبیاء لوگونکی خدائے متعال اور حق کی طرف رہنمائی فرماتے رہے ، لیکن پھر بھی دن بدن شرک وبت پرستی کا بازار گرم ہوتا جارہا تھا ،یہاں تک کہ تمام عالم میں بت پرستی پھیل گئی اورخدائے متعال نے اپنی حکمت سے حضرت ابراھیم علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام فطری انسان کے ایک کامل نمونہ تھے۔آپ نے پاک و بے آلائش فطرت سے حقیقت کے لئے جستجو کرکے خالق کائنات کی وحدانیت کو پایا اور اپنی زندگی کے آخری لمحات تک شرک و ظلم سے لڑتے رہے۔

جیسا کہ قرآن مجید سے ثابت ہے اور اہل بیت کی روایتیں بھی دلالت کرتی ہیں،کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بچپن شہر کے شوروغل سے دور ایک غارمیں گزرا۔آپ کی ملاقات صرف کبھی کبھی اپنی والدہ سے اس وقت ہوتی تھی جب وہ آپ کے لئے کھانا پانی لے کر آتی تھیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک دن اپنی والدہ کے ساتھ غار سے باہرنکلے اور شہر تشریف لائے ۔اور اپنے چچا آزر کے پاس گئے ،وہ جو چیز بھی دیکھتے تھے وہ ان کے لئے نئی اور حیرت انگیز ہوتی تھی ۔ان کی پاکیزہ فطرت ہزاروں حیرت و تعجب کے عالم میں بڑی بے چینی و بے تابی کے ساتھ ان چیزوں کی خلقت کی طرف متوجہ تھی جن کا وہ مشاہدہ کرتے تھے اور وہ ان کی تخلیق کے اسرارتک پہنچنے کی جستجو میں تھے،جب انہوں نے ان بتوں کو دیکھا کہ جنہیں آزر اور دوسرے لوگوں نے تراشا تھا اوروہ ان کی پرستش کرتے تھے ۔تو انکی حقیقت کے بارے میں سوال کیا لیکن ان بتونکے رب ہونے کے بارے میں جو وضاحت کی جاتی تھی وہ اس سے مطمئن نہیں ہوتے تھے۔

جب حضرت ابراہیم نے کچھ لوگوں کو ستارۂ زہرہ، کچھ لوگوں کو چاند اور کچھ لوگوں کو سورج کی پوجا کرتے ہوئے پایا ،جو کہ ایک مدت کے بعد ڈوب جاتے تھے،تو آپ نے ان کے رب ہونے کو قبول نہ کیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کے بعد خدائے واحد کی پرستش اورشرک سے اپنی بیزاری کا لوگوں میں بلا خوف اعلان کر دیا اور اب وہ بت پرستی اورشرک سے مقابلہ کرنے کے علاوہ کسی اور چیز کے بارے میں نہیں سوچتے تھے۔بت پرستوں کے ساتھ انتھک مقابلہ کرتے اور ان کو توحید کی طرف دعوت دیتے تھے۔

آخر کارایک بت خانہ میں داخل ہوئے اور بتونکا توڑنا ان لوگوں میں سب سے بڑا جرم شمار ہوتا تھاآپ کے خلاف مقدمہ دائر کیا گیا ۔مقدمہ کی سماعت کے بعد آپ کو آگ میں جلانے کی سزا سنادی گئی،کاروائی مکمل کرنے کے بعد آپ کوآگ میں ڈال دیا گیا ، لیکن خدائے متعال نے آپ کی حفاظت فرمائی اورآپ آگ سے صحیح وسالم باہر نکل آئے ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کچھ مدت کے بعد اپنی جائے پیدائش ملک بابل سے سرزمین شام اور فلسطین کی طرف ہجرت کی اور اس علاقہ میں اپنی دعوت کو جاری رکھا۔

زندگی کے آخری ایام میں خدائے متعال نے آپ کو دو فرزند عطا کئے۔ان میں سے ایک حضرت اسحاق تھے جو اسرائیل کے والداوردوسرے اسماعیل تھے جو مصری عرب کے باپ ہیں۔

حضرت ابراہیم نے حضرت اسماعیل کو شیرخواری کے ایام میں ہی خدا کے حکم سے ان کی والدہ کے ہمراہ حجاز لے جاکر تہامہ کے پہاڑوں کے بیچ میں ایک بے آب وگیاہ اور باشندوں سے خالی سرزمین میں چھوڑدیا،اس طرح صحرانشین عربوں کو توحید کی دعوت دی۔اس کے بعد خانہ کعبہ کی سنگ بنیاد ڈالی اور اعمال حج انجام دینے کا تشرع فرمایا کہ اسلام کے ظہور اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت تک یہ عمل عربوں میں رائج تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام قرآن مجید کی نص کے مطابق دین فطرت کے حامل تھے۔آپ وہ پہلے شخص ہیںکہ جس نے خدا کے دین کو اسلام اور اس کے پیروئوں کو مسلمین کہا،اوردنیا میں ادیان توحیدیعنی یہودیت،نصرانیت اور اسلام آپ پر منتہی ہوتے ہیں، کیونکہ ان تینوں ادیان کے پیشوا حضرت موسی کلیم،حضرت عیسی مسیح اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور یہ سب دعوت دینے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نقش قدم پر تھے۔

۳۔حضرت موسی کلیم اللہ علیہ السلام

حضرت موسی بن عمران علیہ السلام تیسرے اولوالعزم پیغمبر اور صاحب کتاب وشریعت ہیں۔آپ اسرائیل (یعقوب) کی اولاد میں سے ہیں۔

حضرت موسی علیہ السلام کی زندگی شوروغل سے بھری ہوئی تھی۔آپ کی پیدائش کے وقت بنی اسرائیل مصر میں قبطیوںکے درمیان ذلت واسیری کی زندگی گزار رہے تھے اور فرعون[2] کے حکم سے بچوں کے سر قلم کئے جارہے تھے۔

حضرت موسی علیہ السلام کی ماں کو خواب میں جو حکم دیاگیاتھا اس کے مطابق موسی کو لکڑی کے ایک صندوق میں رکھ کر دریائے نیل میں ڈال دیا۔پانی نے صندوق کوبہاکر فرعون کے محل کے قریب پہنچادیا۔فرعون کے حکم سے صندوق کوپانی سے نکالا گیا،جب صندوق کو کھولا گیا تواس میں ایک خوبصورت بچے کو پایا گیا۔

فرعون نے ملکہ کے اصرار پر بچے کو قتل نہیںکیا،اورچونکہ وہ لاولد تھا،لہذا اسے اپنا بیٹا بنالیا اوردایہ کے حوالہ کیا گیا اتفاق سے وہی اس کی ماں تھی۔

حضرت موسی علیہ السلام ابتدائے جوانی تک فرعون کے دربار میں تھے۔اس کے بعد ایک قتل کے حادثہ کی وجہ سے فرعون سے ڈر کر، مصر سے بھاگ کر مداین چلے گئے اور وہاں پر حضرت شعیب پیغمبرعلیہ السلام سے ملاقات ہوئی اور حضرت شعیب کی ایک بیٹی سے شادی کی ۔

کئی سال تک حضرت شعیب کی بھیڑبکریوں کو چراتے رہے۔ایک دن انھیں اپنے وطن کی یادآئی۔اپنے اہل و عیال اورسازوسامان کے ساتھ راہی مصرہوئے ۔اس سفر کے دوران جب رات کے وقت طور سیناپہنچے تو خدائے متعال کی طرف سے رسالت کے عہدہ پرفائز ہوئے اورآپ کوماموریا گیا کہ فرعون کو دین توحیدکی دعوت دیں اوربنی اسرائیل کو قبطیوں سے نجات دلائیں اور اپنے بھائی ہارون کو اپنا وزیر قرار دیں ۔

لیکن اپنے فریضہ کو انجام دینے اورپیغام الٰہی کو پہنچانے کے بعد فرعون،جوکہ بت پرست تھااور خودکو خدا کہتا تھا،نے آپ کی رسالت اوردعوت کو مستردکردیا اوربنی اسرائیل کی آزادی کا ضامن نہیں ہوا۔

حضرت موسی علیہ السلام نے سالہا سال تک لوگوں کو توحیدکی دعوت دی اوربہت سے معجزے دکھائے لیکن اس کے باوجود فرعون اور اس کی قوم ان کے ساتھ سختی اورتندمزاجی کا مظاہرہ کرتی رہی۔یہاں تک کہ حضرت موسی علیہ السلام خدا کے حکم سے بنی اسرائیل کے ہمراہ رات کے اندھیرے میں مصرسے کوچ کر کے صحرائے سینا کی طرف چلے گئے۔جب وہ بحراحمرپہنچے تو فرعون کو یہ معلوم ہوگیا اور اس نے اپنے لشکرکے ساتھ ان کا پیچھا کیا ۔

حضرت موسی علیہ السلام نے معجزہ کے ذریعہ سمندرکو شگافتہ کیا اور اپنی قوم کے ساتھ پانی سے گزرگئے ،لیکن فرعون اور اس کا لشکرغرق ہوگیا۔اس واقعہ کے بعد خدائے متعال نے حضرت موسی علیہ السلام پرتوریت نازل فرمائی اوربنی اسرائیل میں کلیمی شریعت کونافذکیا ۔

٤۔حضرت عیسی مسیح علیہ السلام

حضرت مسیح اولواالعزم اورصاحب کتاب و صاحب شریعت پیغمبروںمیں سے چوتھے پیغمبرہیں۔آپ کی پیدائش غیر معمولی تھی ۔آپ کی والدہ حضرت مریم،ایک مقدس وپارسا دوشیزہ تھیںجو بیت المقدس میں عبادت کرنے میں مشغول تھیں کہ خدا کی طرف سے روح القدس آپ پرنازل ہوئے اورحضرت مسیح کی بشارت دی پھر ان کی آستین میں پھونک ماری کہ جس سے وہ حاملہ ہو گئیں ۔

حضرت مسیح نے پیدا ہونے کے بعد اپنی ماں پر لوگوں کی طرف سے لگائی جانے والی تہمتوں کا جواب گہوارہ میں دیا اور اپنی والدہ کا دفاع کیا اور اپنی نبوت اور کتاب کے بارے میں لوگوں کو خبر دی۔اس کے بعد جوانی میں لوگوں کو دعوت دینے میں مشغو

ل ہوئے اور حضرت موسی کی شریعت میں تھوڑی سی تبدیلی کرکے اسے زندہ کیا۔ آپ اپنے حواریوں کو اسلام کے مبلّغ کی حیثیت سے مختلف علاقوں میں بھیجتے تھے۔

ایک مدت کے بعد جب ان کی دعوت پھیل گئی، تو یہودی (آپ کی قوم) آپ کو قتل کرنے کے در پے ہو گئے، لیکن خدائے متعال نے آپ کو نجات دی اور یہودیوں نے آپ کی جگہ پر کسی اور کو پکڑ کر سولی پر چڑھادیا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ خدائے متعال نے قرآن مجید میں حضرت عیسی علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب کا نام "انجیل" بیان کیا ہے، یہ "انجیل" ان انجیلوں کے علاوہ ہے، جو آپ کے بعد آپ کی سیرت اور دعوت کے بارے میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے چار انجیلیں لوقا، مرقس، متی، اور یوحنا کی تالیف رسمی طور پر قبول کی گئی ہیں۔

۱۔ جن ۲۸۲۶۔

2۔ مصر میں بادشاہ کو (فرعون) کہتے تھے۔

۵۔خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۵۷۰ء میں ہجرت سے ۵۳ سال پہلے حجاز کے ایک شریف و نجیب ترین عرب خاندان (بنی ہاشم) میں پیدا ہوئے ۔

جیسا کہ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں دنیا حیرت انگیز حد تک اخلاقی گراوٹ سے دوچار تھی اور دن بدن جہل و نادانی کے بھنور میں پھنس کر اس کی حالت بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی اور ہر لحہ انسانی معنویات سے دور ہوتی جارہی تھی ۔خاص کر جزیرہ نمائے عرب ،جس کے اکثر باشندے صحرا نشین تھے اور قبیلوں کی صورت میں زندگی بسر کرتے تھے ،تمام شہری حقوق سے محروم تھے ۔وہ لوگ کچھ خرافی اور بیہودہ افکار (من جملہ اپنے ہاتھوں سے پتھر ،لکڑی اور کبھی خشک دہی کے بنائے گئے بتوں کی پرستش) میں زندگی گزارتے تھے ۔اوراپنے اسلاف کی تقلید کرنے ،لوٹ کھسوٹ اور قتل وغارت کے علاوہ کسی قسم کا فخر ومباہات نہیں رکھتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ،ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے کہ آپ ﷺ کے والد گرامی عبداللہ اس دنیا سے رحلت کر گئے اور چار سال کے بعد آپ ﷺ کی والدہ کا بھی انتقال ہوگیا۔ لہذا آپ کی پرورش کی ذمہ داری آپ ﷺ کے دادا عبدالمطلب نے سنبھالی ۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اپنے دادا سے بھی محروم ہوگئے اورآپ ﷺ کےچچا حضرت ابو طالب آپ کواپنے گھر لے گئے اور اپنے ایک بیٹے کی طرح آپ ﷺ کو پالا۔

مکہ کے عرب دوسرے عربوں کی مانند بھیڑبکری اور اونٹ پالتے تھے اور کبھی اپنے ہمسایہ ممالک بالخصوص شام کے ساتھ تجارت بھی کرتے تھے ۔یہ لوگ ان پڑھ تھے اور اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کے لئے کوئی اہتمام نہیں کرتے تھے ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگرچہ ان کے درمیان زندگی گزاررہے تھے۔ لیکن بچپن سے ہی کچھ پسندیدہ اوصاف کی وجہ سے معاشرے میں امتیازی حیثیت کے مالک تھے، آپ ﷺ ہرگز بتوں کی پرستش نہیں کرتے تھے،جھوٹ نہیں بولتے تھے ،چوری اورخیانت نہیں کرتے تھے ،برے ناپسند اورنا مناسب کام انجام دینے سے پرہیز کرتے تھے ،عقل وشعور رکھتے تھے ،اسی لئے تھوڑے ہی عرصہ میں لوگوں کے درمیان قابل توجہ محبوبیت حاصل کرلی اور"محمد امین" کے نام سے مشہور ہوئے،چونکہ عرب اپنی امانتوں کوآپ ﷺ کے سپرد کرتے تھے اور آپ کی امانتداری اور لیاقت کی تعریفیں کرتے تھے ۔

آپ ﷺ تقریباً ابیس سال کے تھے کہ مکہ کی ایک دولت مند عورت (خدیجہ کبریٰ) نے آپ ﷺ کو اپنی تجارت کے کارندہ کی حیثیت سے معین کیا ۔آپ ﷺ کی سچائی ،اچھائی اور عقل ولیاقت کی وجہ سے اس کو تجارت میں کافی منافع ملا اور فطری طور وہ پر آپ ﷺ کی شخصیت سے متاثر ہوئی ،اورآخر کار آپ ﷺ کے ساتھ شادی کرنے کی پیش کش کی ،آپ ﷺ

نے بھی اسے قبول کیا اور ان کے ساتھ شادی کی اور اس کے بعد بھی برسوں تک اپنی شریک حیات کے ساتھ تجارت میں مشغول رہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چالیس برس تک لوگوں میں عام زندگی بسر کرتے تھے اور معاشرے کے ایک فرد کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے ،فرق صرف اتنا تھا کہ آپ پسندیدہ اخلاق کے مالک تھے اوردسرے لوگوں کے مانندبد کرداری میں آلودہ نہیں تھے۔آپ ﷺ میں ظلم ،سنگدلی اور جاہ طلبی کا شائبہ تک نہیں تھا، اس وجہ سے لوگوں میں محترم اور قابل اعتماد تھے۔ جب عربوں نے خانہ کعبہ کی مرمت کرنا چاہی اور حجرا سود کو نصب کرنے کے بارے میں عرب قبائل کے درمیان اختلاف اور جھگڑا پیدا ہوا تو انہوں نے آنحضرت ﷺ کو حَکَم قرار دیا اورآپ ﷺ کے حکم سے ایک عبا کو پھیلا کر حجراسود کو اس میں رکھا گیا اور قبائل کے سرداروں نے عبا کے اطراف کو پکڑ کر اٹھایا اور آپ ﷺ نے اپنے ہاتھوں سے حجراسود کو اس کی جگہ پر نصب فرمایا اور اس طرح قبائل کے درمیان کشمکش ،لڑائی جھگڑا اور احتمالی خونریزی کا خاتمہ ہوا۔

آنحضرت ﷺ بعثت سے پہلے اگرچہ خدائے یکتا کی پرستشکرتے تھے اوربت پرستی سے اجتناب کرتے تھے، لیکن بت پرستی کے عقائدسے مقابلہ نہیں کرتے تھے اس لئے لوگ آپ سے کوئی سروکار نہیںرکھتے تھے۔اس زمانے میں دوسرے ادیان کے پیرو جیسے یہود و نصاری بھی عربوں میں محترمانہ طورپر زندگی گزارتے تھے اور اعراب ان کے لئے بھی کوئی مزاحمت ایجاد نہیں کرتے تھے۔

بحیرا راہب کا قصہ

جن دنوں آنحضرت ﷺ اپنے چچا حضرت ابو طالب کے ہاں زندگی بسر کر رہے تھے اور ابھی بالغ نہیں ہوئے تھے، ان دنوںحضرت ابو طالب تجارت کی غرض سے شام گئے اورآنحضرت ﷺ کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔

ایک بڑا قافلہ تھا،کافی مال تجارت کے ساتھ لوگوں کی ایک بڑی تعداد تھی ،قافلہ سر زمین شام میں داخل ہو ا اورشہر بصری میں پہنچا ، ایک دَیر کے قریب پڑاو ڈالا اورخیمے نصب کر کے آرام کرنے لگے۔

ایک راہب جس کا لقب "بحیرا" دَیر سے باہر آیا اور قافلہ کی دعوت کی، سب نے بحیرا کی دعوت قبول کی اور دیر میں گئے ۔حضرت ابو طالب بھی آنحضرت ﷺ کو سامان کے پاس بیٹھا کر دوسرے لوگوں کے ساتھ بحیرا کی دعوت پر گئے۔

بحیرا نے پوچھا: کیا سب آگئے ؟

ابو طالب نے کہا: سب سے چھوٹے ایک نوجوان کے علاوہ سب لوگ آگئے ہیں۔

بحیرا نے کہا: اسے بھی لے کے آئیے۔

آنحضرت ﷺ زیتون کے ایک درخت کے نیچے کھڑے تھے، حضرت ابو طالب نے آپ ﷺ کو بلایا اور آپ ﷺ بھی راہب کے پاس آگئے۔

بحیرا نے آنحضرت ﷺ پر ایک گہری نظر ڈالنے کے بعد کہا: میرے قریب آجاو، میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ کو ایک طرف لے گیا۔ حضرت ابو طالب بھی ان کے پاس گئے۔

بحیرا نے آنحضرت ﷺ سے کہا: آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں اور تم کو لات وعزی کی قسم دیتا ہوں کہ جواب ضرور دینا۔ (لات وعزیٰ دو بتوں کے نام ہیںکہ جن کی مکہ کے لوگ پرستش کرتے تھے)

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: سب سے زیادہ میں ان دونوں بتوں سے نفرت کرتا ہوں۔

بحیرا نے کہا: تم کو خدائے یکتا کی قسم دیتا ہوں سچ کہنا۔

آپ ﷺ نے فرمایا: میں ہمیشہ سچ بولتا ہوں اور کبھی جھوٹ نہیں بولتا ہوں آپ اپنا سوال کیجئے۔

بحیرا نے پوچھا: کس چیز کو سب سے زیادہ پسند کرتے ہو ؟

آپ ﷺ نے فرمایا: تنہائی کو۔

بحیرا نے پوچھا: کس چیز پر زیادہ نظر ڈالتے ہو اور اسے دیکھنا پسند کرتے ہو۔ ؟

آپ ﷺ نے فرمایا: آسمان اور اس میں موجود ستاروں کو۔

بحیرا نے پوچھا: کیا سوچ رہے ہو؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خاموشی اختیار کی لیکن بحیرا بغور اور سنجیدگی کے ساتھ آپ ﷺ کی پیشانی کو دیکھتا رہا۔

بحیرا نے کہا: کس وقت اور کس فکر میں سوتے ہو ؟

آپ ﷺ نے فرمایا: اس وقت جب آنکھیں آسمان پر جمائے ہوتا ہوں اور ستاروں کو دیکھتا ہوں، انھیں اپنی آغوش میں اور خود کو ان کے اوپر پاتا ہوں۔

بحیرا نے کہا: کیا خواب بھی دیکھتے ہو ؟

آپ ﷺ نے فرمایا: جی ہاں، جو خواب میں دیکھتا ہوں، اسے بیداری میں بھی دیکھتا ہوں۔

بحیرا نے کہا: مثلا، خواب میں کیا دیکھتے ہو ؟

آنحضرت ﷺ: نے خاموشی اختیار کی اور بحیرا بھی خاموش رہا۔

تھوڑی دیر رکنے کے بعد بحیرا نے پوچھا: کیا میں آپ کے دونوں شانوں کے درمیان دیکھ سکتا ہوں ؟

آنحضرت ﷺ اپنی جگہ سے اٹھے بغیر بولے: آئو اور دیکھ لو۔

بحیرا اپنی جگہ سے اٹھا، آپ ﷺ کے قریب آیا، آنحضرت ﷺ کے شانوں سے لباس ہٹایا، ایک سیاہ تِل نظر آیا، ایک نظر ڈال کرزیر لب بولا: وہی ہے!

ابو طالب نے پوچھا: کون ہے؟ کیا کہتے ہو؟

بحیرا نے کہا: ایک علامت جس کی ہماری کتابوں میں خبر دی گئی ہے۔

ابو طالب نے پوچھا: کون سی علامت؟

بحیرا نے دریافت کیا: اس جوان سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟

ابوطالب چونکہ آپ ﷺ کو اپنے بیٹے کی طرح چاہتے تھے، اس لئے بولے: یہ میرا بیٹا ہے۔

بحیرا نے کہا: نہیں، اس جوان کا باپ مرچکا ہونا چاہئے۔

ابو طالب نے پوچھا: تم کیسے جانتے ہو؟ جی ہاں یہ جوان میرا بھتیجا ہے!

بحیرا نے ابو طالب سے کہا: سن لو، اس جوان کا مستقبل اتنا درخشان اور حیرت انگیز ہے، کہ جو میں نے دیکھا ہے اگر اسے دوسرے دیکھ لینگے اور اسے پہچان لینگے تو اسے قتل کر ڈالیں گے، اسے دشمنوں سے مخفی رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا۔

ابوطالب نے کہا: بتائو وہ کون ہے؟

بحیرا نے کہا: اس کی آنکھوں میں ایک عظیم پیغمبر کی علامت اور اس کی پشت پر اس کی واضح نشانی ہے۔

نسطورا راہب کا قصہ

چندبرسوں کے بعد آنحضرت ﷺ حضرت خدیجہ کبریٰ کی تجارت کے کارندے کی حیثیت سے ان کا مال لیکر دوبارہ شام گئے۔ حضرت خدیجہ نے میسرہ نامی اپنے ایک غلام کو آپ ﷺ کے ہمراہ بھیجا اوراس سے تاکید کی کہ مکمل طور پر آپ ﷺ کی اطاعت کرے۔ اس سفر میں بھی جب قافلہ شام کی سرزمین پر پہنچا، تو شہر بصری کے نزدیک ایک درخت کے نیچے پڑائو ڈالا، وہاں قریب میں نسطورا نامی ایک راہب کی عبادت گاہ تھی، جسے میسرہ پہلے سے جانتا تھا۔

نسطورا نے میسرہ سے پوچھا: درخت کے نیچے سویا ہوا کون ہے؟

میسرہ نے کہا: قریش سے ایک مرد ہے۔

راہب نے کہا: اس درخت کے نیچے اب تک کوئی نہیں ٹھہرا ہے اور نہ ٹھہرے گا، مگر یہ کہ خدا کے پیغمبروں میں سے ہو۔

اس کے بعد پوچھا: کیا اس کی آنکھوں میں سرخی ہے؟

میسرہ نے کہا: جی ہاں، اس کی آنکھیں ہمیشہ اسی حالت میں ہوتی ہیں۔

راہب نے کہا: یہ وہی ہے اوروہ خدا کے پیغمبروں میں سے آخری پیغمبر ہے ،کاش میں اس دن کو دیکھتا ،جس دن وہ دعوت پر مامور ہوں گے ۔

حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری پیغمبر ہیں ، جنھیں خدائے متعال نے لوگوں کی ہدایت کے لئے دنیا میں بھیجا ہے ۔

چودہ سو سال پہلے ،عالم بشریت ایک ایسی حالت سے گزر رہی تھی کہ جب دین اور توحید کا صرف نام باقی تھا ۔لوگ یکتا پرستی اورخداشناسی سے بالکل دور ہو چکے تھے۔ معاشرے سے انسانیت کے آداب اور عدالت ختم ہوچکی تھی۔جزیزہ نمائے عرب ، میں خانہ خدا اوردین ابراہیم کا مرکز ہونے کے باوجود،کعبہ شریف بت خانہ میں اوردین ابراہیم بت پرستی میں تبدیل ہو چکا تھا ۔

عربوں کی زندگی ،قبیلوں پر مشتمل تھی ،یہاں تک کہ چند شہر جو حجاز اور یمن وغیرہ میں تھے، اسی ترتیب سے چلائے جاتے تھے ۔ دنیائے عرب بدترین حالات سے گزر رہی تھی تہذیب و تمدن کے بجائے ان میں بے حیائی ،عیاشی ،شراب نوشی اور جوا کھیلنا رائج تھا ۔لڑکیوں کو زندہ دفن کیا جاتا تھا ۔لوگوں کی زندگی اکثر چوری ،ڈاکہ زنی ،قتل اور مال مویشوں کو لوٹ کر چلائی جاتی تھی ۔ظلم وستم اورخونریزی کو سب سے بڑا فخر سمجھا جاتا تھا ۔

خدائے متعال نے ایسے ماحول میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دنیا کی اصلاح اور رہبری کے لئے مبعوث فرمایا اورقرآن مجید کو آپ ﷺ پر نازل کیا۔ جس میں حق شناسی کے معارف، انصاف کے نفاذ کے طریقے اور مفید نصیحتیں موجود ہیں ،اورآنحضرت ﷺ کو مامور فرمایا تاکہ آسمانی سند سے لوگوں کوانسانیت اور حق پیروی کرنے کی دعوت دیں ۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعثت سے پہلے بت پرستی کے ماحول میں زندگی بسر کرنے کے باوجود کبھی بتوں کی تعظیم میں سر تسلیم خم نہیں کیا اور ہمیشہ خدائے یکتا کی پرستش کرتے رہے ، کبھی مکہ کے نزدیک واقع غار حرامیں جاتے تھے اور لوگوں کے شوروغوغا سے دوراپنے پروردگار سے مناجات کرتے تھے ۔جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی عمر شریف کے چالیس سال گزارنے کے بعدپروردگار عالم کی طرف سے مقام رسالت وپیغمبری پر مبعوث ہوئے توقرآن مجید کا پہلا سورہ (قرء باسم ربّک)آپ ﷺ پرنازل ہوا اورآپ ﷺ لوگوں کی دعوت وتبلیغ پرمامور ہوئے ۔ابتدائی مرحلہ میں جو ماموریت ذمہ داری آپ ﷺ پر تھی وہ یہ تھی کہ دعوت کو مخفی طورپر شروع کریں ۔

سب سے پہلے جو شخص آپ ﷺ پر ایمان لایا وہ حضرت علی بن ابیطالب علیہ السلام تھے ،وہ آپ ﷺ کے گھر میں زندگی بسر کرتے تھے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود ان کی تربیت فرماتے تھے ، حضرت علی کے بعد حضرت خدیجہ کبریٰ سلام

اللہ علیہا نے اسلام قبول کیا۔ ایک مدت تک یہ دونوں آنحضرت ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتے رہے جبکہ اس وقت دوسرے لوگ شرک و کفر میں زندگی بسر کررہے تھے، کچھ دنوں کے بعد تھوڑے سے لوگ آنحضرت ﷺ پر ایمان لائے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تین سال کے بعد خدا کی طرف سے حکم ہوا کہ اعلانیہ طور پر دعوت دیں اوراپنے رشتہ داروں سے اس کا آغاز کریں۔آنحضرت ﷺ نے اس حکم کے مطابق اپنے تمام رشتہ داروں کو جمع کیا اوران کے سامنے اپنی رسالت کا اعلان کیا اور یہ بشارت دی کہ جو بھی ان میں سب سے پہلے آپ ﷺ کی دعوت کو قبول کرے گا وہی آپ کا جانشین ہوگاآپ ﷺ نے اس اعلان کو تین بار دوہرایا لیکن ان میں سے کسی نے قبول نہیں کیا، بلکہ ہر بار صرف حضرت علی علیہ السلام اٹھے اورآنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اپیل کو قبول کیا۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ اور ان کو اپنا جانشین بنانے کا وعدہ کیا۔آخر میں ان لوگوں نے کھڑے ہوکر ہنسی اڑاتے ہوئے حضرت ابو طالب سے مخاطب ہو کر کہا :"اس کے بعد تمہیں اپنے فرزند کی اطاعت کرنی چاہئے"پھر وہ لوگ چلے گئے۔

اسکے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلانیہ طور پر عام دعوت کا آغاز کیا، لیکن لوگوں سے شدید، سخت، عجیب اورناقابل برداشت مقابلہ کرنا پڑا۔مکہ کے لوگ اپنے وحشیانہ مزاج اور اپنی بت پرستی کی عادت کی وجہ سے دشمنی اورضد پر اتر آئے اورآنحضرت ﷺ اورآپ کے پیروئوں کو جسمانی اذیت پہنچانے، مضحکہ اورتوہین کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھتے تھے اور ہر روز اپنی بیوقوفی اور سختی میں اضافہ کرتے تھے۔

جتنا لوگوں کی طرف سے سختی اوردبائو بڑھتا جا رہا تھا، اتنا ہی آنحضرت ﷺ بھی اپنی دعوت میں صبرواستقامت، اورثابت قدمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے اور اسلام کے پیروئوں میں تدریجاً اضافہ ہوتارہا لہذاکفار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کولالچ دینا شروع کی کہ انہیں کافی مال ودولت دیں گے یا انھیں حاکم کے طورپر منتخب کریں گے تاکہ وہ اپنی دعوت سے دست بردار ہو جائیں یاصرف اپنے خدا کی طرف دعوت دیں اور ان کے خدائوں کو نہ چھیڑیں۔ لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی تجویز کو ٹھکرادیا اور اس خدائی فریضہ کو انجام دینے اوردعوت کو جاری رکھنے کے اپنے مستحکم عزم وارادے کا اعلان کیا۔

کفار جب طمع و لالچ کے راستے سے ناامید ہوگئے تو انہوں نے دوبارہ اپنے دبائو میں اضافہ کیا اور مسلمانوں کو سخت جسمانی اذیتین تکلیفیں پہنچانے لگے اور کبھی ان میں سے کچھ کو قتل کرتے تھے تاکہ انھیں اسلام سے روک سکیں۔کفار نے قبیلۂ بنی ہاشم کے سردار حضرت ابو طالب کے لحاظ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے سے اجتناب کیا، لیکن یہ لحاظ دوسری اذیتوں اور تکلیفوں کو روک نہ سکا۔

ایک مدت کے بعد مسلمانوں کا عرصئہ حیات اور تنگ ہو گیا اور ظلم و ستم اپنی انتہا کو پہنچ گیا حالت یہ ہو گئی تھی کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دیدی تاکہ کچھ دنوں تک آرام کی سانس لے لیں ۔ایک جماعت نے حضرت علی کے بھائی حضرت جعفر بن ابیطالب کی سر کردگی میں اپنے اہل وعیال کے ہمراہ حبشہ کی طرف ہجرت کی (جعفر پیغمبر اکرم ﷺ کے منتخب صحابیوں میں سے تھے)۔

کفار مکہ جب مسلمانوں کی ہجرت سے آگاہ ہوئے تو انہوں نے اپنے دو تجربہ کار افراد کو کافی مقدار میں تحفہ و تحائف کے ساتھ حبشہ کے بادشاہ کے پاس بھیجا، اورانہوں نے بادشاہ سے مکہ کے مہاجرین کو واپس بھیجنے کا تقاضا کیا ، لیکن جعفر بن ابیطالب نے اپنے بیانات سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سر اپا نورانی شخصیت اور اسلام کے بلند اصولوں کی حبشہ کے بادشاہ، مسیحی پادریوں اور ملک کے حکام کے سامنے تشریح کی اور سورئہ مریم کی چند آیتوں کی تلاوت فرمائی ۔

حضرت جعفر بن ابیطالب کا حق پر مبنی یہ بیان ایسا دلچسپ و موثر تھا کہ بادشاہ اور مجلس میں موجود تمام لوگوں نے آنسو بہائے ۔نتیجہ میں بادشاہ نے کفار مکہ کے تقاضا کو مسترد کیا اور ان کے بھیجے ہوئے تحفوں کو واپس کر دیا اور حکم دیا کہ مسلمان مھاجرین کے آرام وآسائش کے تمام امکانات فراہم کئے جائیں۔

کفار مکہ نے اس روئداد کے بعد آپس میں معاہدہ کیا کہ بنی ہاشم ،جو پیغمبر اسلام کے رشتہ دار تھے ، اور ان کے حامیوں کے ساتھ قطع تعلق کر کے مکمل طور پر سوشل بائیکاٹ کریں، اس سلسلہ میں انہوں نے ایک عہد نامہ لکھا اور عام لوگوں سے دستخط لے کر اسے کعبہ میں رکھا ۔

بنی ہاشم، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ مکہ سے باہر جانے پر مجبور ہوئے اور شعب ابو طالب نامی کے ایک درہ میں پناہ لی او رانتہائی سختی اور بھوک میں زندگی بسر کرتے تھے۔

اس مدت کے دوران کسی نے شعب ابو طالب سے باہر آنے کی جرائت تک نہیں کی، دن میں شدید گرمی اور رات کو عورتوں اور بچوں کی فریادوں سے دست و گریبان تھے۔

کفار تین سال کے بعد عہد نامہ کے محو ہونے اور بہت سے قبائل کی طرف سے ملامتوں کے نتیجہ میں اپنے معاہدہ سے دست بردار ہوئے اور بنی ہاشم کا محاصرہ ختم ہوا ، لیکن انہی دنوںپیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تنہا حامی حضرت ابو طالب اورآنحضرت ﷺ کی شریک حیات حضرت خدیجہ کبری کا انتقال ہو گیا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے اور مشکل ہو گئی۔آپ ﷺ میں یہ طاقت نہیں رہی کہ لوگوں کے درمیان جائیں یا خود کو کسی کے سامنے ظاہر کریں یا کسی خاص جگہ پر رہیں۔یہاں تک کہ آپ ﷺ کی جان کی کوئی حفاظت نہیں تھی ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طائف کی طرف سفر

جس سال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور بنی ہاشم شعب ابو طالب کے محاصرہ سے باہر آئے، وہ بعثت کا تیرھواں سال تھا۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان ہی دنوں شہر طائف کی طرف سفر کیا۔ (طائف مکہ سے تقریبا سو کلو میٹر کی دوری پر ایک شہر ہے) آپ ﷺ نے طائف کے باشندوں کو اسلام کی دعوت دی، لیکن اس شہر کے جاہل ہر طرف سے آپ ﷺ پر حملہ آور ہوئے اور آپ ﷺ کو برا بھلا کہا، سنگسار کیا اور آخر کار آنحضرت ﷺ کو شہر سے باہر نکال دیا گیا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم طائف سے مکہ لوٹے اور کچھ مدت تک مکہ میں رہے، چونکہ وہاں پر جان کی کوئی حفاظت نہیں تھی، اس لئے لوگوں کے درمیان نہیں آتے تھے۔ کفار مکہ کے سردار اور بزرگ شمع رسالت کو گل کرنے کی خاطر مناسب فرصت کو دیکھتے ہوئے، دار الندوہ۔ جو مجلس شوری کے مانند تھا۔ میں جمع ہوئے اور ایک مخفیانہ میٹنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے کا آخری منصوبہ بنایا۔

مذکورہ منصوبہ یہ تھا کہ قبائل عرب کے ہر قبیلہ سے ایک شخص کو چن لیا جائے اور تمام منتخب افراد ایک ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر پر حملہ کر کے آپ ﷺ کو قتل کر ڈالیں۔ اس منصوبہ میں تمام قبائل کو شریک کرنے کا مقصود یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ کا قبیلہ بنی ہاشم آپ ﷺ کے خون کا بدلہ لینے کے لئے قیام نہ کر سکئے اور قتل کا منصوبہ بنانے والوں سے نہ لڑ سکے۔ اور اسی طرح بنی ہاشم میں سے ایک آدمی کو شریک کر کے قبیلئہ بنی ہاشم کی زبان مکمل طور پر بند کردی۔

اس فیصلے کے مطابق، مختلف قبائل کے تقریبا چالیس افراد آنحضرت ﷺ کے قتل کے لئے منتخب ہوئے، انہوں نے رات کے اندھیرے میں آنحضرت ﷺ کے گھر کا محاصرہ کیا، حملہ آور سحر کے وقت گھر میں داخل ہوئے تاکہ منصوبہ کو عملی جامہ پہنائیں، لیکن ارادئہ الہی ان کے ارادہ سے بلند ہے، کہ جس سے ان کے منصوبہ پر پانی پھر گیا۔ خدائے متعال نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی کئی اور کفار کے منصودبہ سے آگاہ فرمایا اور حکم فرمایا کہ راتوں رات مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کریں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واقعہ کی روداد سے حضرت علی علیہ السلام کو آگاہ فرمایا اور حکم دیا کہ رات کو آپ ﷺ کے بستر پر سو جائیں اور ان سے کچھ وصیتیں کیں اور رات کے اندھیرے میں گھر سے باہر نکلے، راستے میں حضرت ابو بکر کو دیکھا، انھیں بھی اپنے ساتھ مدینہ لے کر گئے۔ مدینہ کے کچھ بزرگ آنحضرت ﷺ کی ہجرت سے پہلے مکہ آکر آپ ﷺ سے ملاقات کی اور آپ پر ایمان لائے تھے اور ضمناً ایک عہدنامہ لکھا تھا کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لائیں تو وہ ان کی حمایت میں ایسے ہی دفاع کریں گے جیسا وہ اپنی جان و عزت کا دفاع کرتے ہیں۔

مدینہ کے یہودیوں کی بشارت

یہودیوں کے بہت سے قبیلوںنے آنحضرت ﷺ کے اوصاف اورآپ ﷺ کی جگہ کے بارے میں اپنی کتابوں میں پڑھاتھا اور اپنے وطن کو ترک کرکے حجاز آکر مدینہ اور اس کے اطراف میں پڑائو ڈالا تھا اورنبی امی کے ظہور کاانتظار کررہے تھے۔چونکہ وہ لوگ دولت مند تھے، اس لئے اعراب کبھی کبھی ان پر حملہ کرکے ان کے مال ودولت کو لوٹ لیتے تھے۔

یہودی ہمیشہ مظلو میت کے عالم میں ان سے مخاطب ہو کرکہتے تھے: "ہم تم لوگوں کے ظلم و ستم پریہاں تک صبر کریں گے کہ نبی امی مکہ سے ہجرت کرکے اس علاقہ میں آجائیں، اس دن ہم آنحضرت ﷺ پر ایمان لاکر تم لوگوں سے انتقام لیں گے"۔

اہل مدینہ کے فورًا ایمان لانے کے اہم عوامل میں سے ایک ان ہی بشارتوں کا ان کے ذہنوں پر اثر تھا، آخر کار وہ لوگ ایمان لے آئے۔ لیکن یہودیوں نے قومی تعصب کی بنا پر ایمان لانے سے گریز کیا۔

نبی کی بشارتوں کی طرف قرآن مجید کا اشارہ

خدائے متعال اپنے کلام پاک میں کئی جگہوں پران بشارتوں کی طرف اشارہ فرماتا، بالخصوص اہل کتاب کے ایک گروہ کے ایمان کے بارے میں فرماتا ہے۔

(الّذین یتّبعون الرّسول النّبی الامّی الّذی یجدونہ مکتوباً عندھم فی التّوریۃ والانجیل یامرھم بالمعروف و ینھٰھم عن المنکر و یحلّ لھم الطّیبٰت ویحرّم علیھم الخبٰئث ویضع عنھم اصرھم و الاغلل التّی کانت علیھم) ۔

(اعراف۱۵۷)

"جو لوگ کہ رسول نبی امی کا اتباع کرتے ہو جس کاذکر اپنے پاس توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں کہ وہ نیکیوں کا حکم دیتا ہے اور برائیوںسے روکتا ہے اور پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے اور خبیث چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے اور ان پرسے احکام کے سنگین بوجھ اور قید و بند کو اٹھادیتا ہے..."

مزید فرماتا ہے:

(ولما جاء ھم کتب من عند اللہ مصدّق لما معھم و کانوا من قبل یستفتحون) ...)(بقرہ۸۹)

"اور جب ان کے پاس خدا کی طرف سے کتاب آئی ہے جو ان کی توریت وغیرہ کی تصدیق بھی کرنے والی ہے اور اسکے پہلے وہ دشمنوںکے مقابلہ میں اسی کے ذریعہ طلب فتح بھی کرتے تھے۔"

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مدینہ میں ورود

اسلام کی ترقی کی زمین شہر یثرب جس کا بعد میں مدینہ نام رکھا گیا۔ میں ہموار ہوی اور اس کا سبب یہ تھا کہ اہل مدینہ داخلی جنگ۔ جو برسوں سے اوس وخزرج نامی دو قبیلوں کے درمیان جاری تھی ۔ سے تنگ آچکے تھے، آخر کار وہ اس فکر میں تھے کہ اپنے لئے ایک بادشاہ کا انتخاب کر کے اس قتل و غارت کو ختم کریں ۔

انہوں نے اس کام کے لئے، اپنے چند معروف افراد کو مکہ بھیجا تاکہ اس سلسلہ میں مکہ کے سرداروں سے گفتگو کریں ۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب مکہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دعوت کو اعلانیہ طور پر شروع کیا تھا ۔

مدینہ کی معروف شخصیتیں جب مکہ پہنچ گئیں اور انہوں نے اپنے مقصد کو قریش کے سرداروں کے سامنے پیش کیا، تو قریش کے سرداروںنے اس عذرو بہانہ سے ان کے ساتھ صلاح ومشورہ کرنے سے پہلو تہی کی کہ ایک مدت سے اس شہر میں محمد ﷺ نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور ہمارے مقدس خدائوں کو برا بھلا کہا ہے، اور ہمارے جوانوں کو گمراہ کیا ہے اور ہمیں فکرمند کیا ہے۔

اس بات کو سن کر اہل مدینہ ہل کر رہ گئے ، کیونکہ انہوں نے مدینہ میں یہودیوں سے بارہا یہ پیشگوئی سنی تھی کہ مکہ میں نبی امی ظہور کریں گے، لہذا ان کے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جاکر انھیں دیکھیں اور ان کی دعوت کی کیفیت سے آگاہ ہو جائیں ۔ جب وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور آپ ﷺ کے بیانات اور قرآن مجید کی آیات کو سنا تو وہ ایمان لے آئے اور آنحضرت ﷺ سے وعدہ کیا کہ اگلے سال مدینہ کے کچھ لوگوں کے ہمراہ آکر اسلام کی ترقی کے اسباب فراہم کریں گے ۔

دوسرے سال مدینہ کے سرداروں کی ایک جماعت مکہ آئی، رات کے وقت شہر سے باہر تنہائی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کی اور آپ ﷺ کی بیعت کی اور مدینہ میں دین اسلام کو رائج کرنے کا عہد وپیمان کیا اور کہا کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لائیں تو وہ دشمنوں سے آپ ﷺ کی اس طرح حفاظت ودفاع کریں گے جیسا وہ اپنے خاندان کا دفاع کرتے ہیں اس کے بعد یہ لوگ مدینہ لوٹے ، اہل مدینہ میں سے اکثر لوگوںنے اسلام قبول کیا اور اس طرح شہر مدینہ اسلام کا پہلا شہر بن گیا ۔ لہذا جب انہوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف لانے کی خبر سنی تو وہ بہت خوشحال ہوئے اور انتہائی بے تابی کے ساتھ آنحضرت ﷺ کے استقبال کے لئے بڑھے اور آپ کا شایان شان استقبال کیا اور انتہائی خلوص نیت سے اپنی جان ومال کو اسلام کی ترقی کے لئے آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا اسی لئے ان کا نام "انصار" رکھا گیا۔ خدائے متعال

اپنے کلام پاک میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت کے واقعہ اور انصار کی خدمات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کی قدردانی کرتا ہے:

(والّذین تبو ء والدّار والایمٰن من قبلھم یحبّون من ھاجر لیھم و لا یجدون فی صدورھم حاجۃً ممّا اوتو ویؤثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ) ۔(حشر۹)

"اور جن لوگوں نے دارالہجرت اور ایمان کو ان سے پہلے اختیار کیا تھا وہ ہجرت کرنے والوں کو دوست رکھتے ہیں اور جو کچھ انھیں دیا گیا ہے اپنے دلوں میں اس کی طرف سے کوئی ضرورت نہیں محسوس کرتے ہیں اور اپنے نفس پر دوسروں کو مقدم کرتے ہیں چاہے انھیں کتنی ہی ضرورت کیوں نہ ہو..."

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جنگوں کا ایک مختصر جائزہ

۱۔جنگ بدر

آخر کار ۲ھ میں مسلمانوں اور کفار مکہ کے درمیان پہلی جنگ سرزمین بدر میں ہوئی۔اس جنگ میں کفار کے سپاہیوں کی تعداد تقریبا ایک ہزار تھی جو جنگی سازوسامان اور اسلحہ سے مکمل طور پر لیس تھے اور مسلمانوں کے پاس ان کی نسبت ایک تہائی افراد تھے جو اچھی طرح سے مسلح بھی نہیں تھے۔لیکن خدائے متعال کی عنایتوں سے اس جنگ میں مسلمانوں کو شاندار فتح حاصل ہوئی اور کفار کو بری طرح شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

اس جنگ میں کفار کے ستر افراد مارے گئے،ان میں سے تقریبا نصف حضرت علی علیہ السلام کی تلوار سے قتل ہوئے۔اس کے علاوہ ان کے ستر آدمی اسیر کر لئے گئے اور باقی افراد تمام جنگی سازوسامان چھوڑ کر بھاگ گئے۔

۲۔جنگ احد

۳ ہجری میں کفار مکہ نے ابوسفیان کی سرکردگی میں تین ہزار افراد کے ساتھ مدینہ پر حملہ کیا اور احد کے بیابان میں ان کا مسلمانوں کے ساتھ آمنا سامنا ہوا۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے اس جنگ میں سات سو مسلمانوں کے ہمراہ کفار کے سامنے صف آرائی کی۔جنگ کی ابتداء میں مسلمانوں کا پلہ بھاری تھا،لیکن کئی گھنٹوں کے بعد بعض مسلمانوں کی کوتاہی کی وجہ سے لشکر اسلام کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور کفار نے ہر طرف سے مسلمانوں پر تلواروں سے وار کیا۔

اس جنگ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ تقریبا ستر اصحاب پیغمبر ﷺ ،جن میں اکثر انصار تھے،کے ساتھ شہید ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشانی مبارک زخمی ہوئی اور آپ ﷺ کے سامنے کے دانتوں میں سے ایک دانت ٹوٹ گیا۔ایک کافر نے آپ ﷺ کے شانہ مبارک پر ایک ضرب لگا کر آواز دی:"میں نے محمد کو قتل کردیا"اس کے نتیجہ میں لشکر اسلام پراگندہ ہوا۔

صرف حضرت علی علیہ السلام چند افراد کے ہمراہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اردگرد آپ ﷺ کی حفاظت کرتے ہوئے ثابت قدم رہے اور حضرت علی علیہ السلام کے علاوہ سب شہید ہوئے حضرت علی علیہ السلام نے آخر تک مقابلہ کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دفاع کیا۔

آخری وقت، اسلام کے فراری فوجی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گرد دوبارہ جمع ہوئے، لیکن دشمن کے لشکر نے اس قدر کامیابی کو غنیمت سمجھ کر جنگ سے ہاتھ کھینچ لیا اور مکہ روانہ ہوے۔

لشکر کفار چند فرسخ طے کرنے کے بعد اس بات پر غور کرنے کے بعد سخت پشیمان ہوئے کہ انہوں نے جنگ کو آخری فتح تک کیوں جاری نہ رکھاتاکہ مسلمانوں کی عورتوںاور بچوں کو اسیر کر کے ان کے اموال کو لوٹ لیتے۔ اس لئے مدینہ پر دوبارہ حملہ کرنے کے لئے آپس میں مشورہ کررہے تھے۔ لیکن انھیں یہ خبر ملی کہ لشکر اسلام جنگ کو جاری رکھنے کے لئے ان کے پیچھے آرہا ہے۔ وہ اس خبر کو سن کر مرعوب ہوئے اور پھر سے مدینہ لوٹنے کا ارادہ ترک کر کے تیزی کے ساتھ مکہ کی طرف بڑھ گئے۔

حقیقت بھی یہی تھی، کیونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا کے حکم سے مصیبت زدہ لوگوں کا ایک مسلح لشکر تیار کر کے حضرت علی علیہ السلام کی سرپرستی میں ان کے پیچھے روانہ کیا تھا۔

اس جنگ میں اگرچہ مسلمانوں کو زبردست نقصان اٹھانا پڑا لیکن حقیقت میں یہ اسلام کے نفع میں ختم ہوئی خصوصاً اس لحاظ سے کہ دونوں طرف نے جب جنگ بندی کے معاہدہ پر اتفاق کیا تو اسی وقت طے پایا تھا کہ اگلے سال اسی وقت بدر میں پھر سے جنگ لڑیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب کے ایک گروہ کے ساتھ وعدہ کے مطابق وقت پر بدر میں حاضر ہوگئے، لیکن کفار وہاں نہ پہنچے۔

اس جنگ کے بعد مسلمانوں نے اپنے حالات کو بہتر بنایا اور جزیرہ نمائے عرب میں مکہ اور طائف کے علاوہ تمام علاقوں میں پیش قدمی کی۔

۳۔جنگ خندق

تیسری جنگ جو عرب کفار نے پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ لڑی، اورجو اہل مکہ کی رہبری میں آخری اور ایک زبردست جنگ تھی، اسے "جنگ خندق" یا "جنگ احزاب" کہتے ہیں۔

جنگ احد کے بعد مکہ کے سردار ابوسفیان کی سرکردگی میں اس فکر میں تھے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آخری اور کاری ضرب لگا کر نور اسلام کو ہمیشہ کے لئے بجھادیں۔ اس کام کے لئے عرب قبائل کو ابھارا اور اپنے تعاون اور مدد کے لئے دعوت دی۔ طوائف کے یہودی بھی اسلام کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرنے کے باوجود چوری چھپے اس آگ کو ہوا دے رہے تھے اور آخر کار اپنے عہد وپیمان کو توڑ کر کفار کے ساتھ تعاون کرنے کا کھل کر معاہدہ کیا۔

جس کے نتیجہ میں ۵ھ میں قریش، عربوں کے مختلف قبائل اور طوائف کے یہودیوں پر مشتمل ایک بڑااور سنگین لشکر تمام جنگی سازو سامان سے لیس ہو کر مدینہ پر حملہ آور ہوا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے ہی دشمن کے اس منصوبے سے آگاہ ہو چکے تھے۔اس لئے آپ ﷺ نے اپنے اصحاب سے مشورہ کیا۔ایک طویل گفتگو اور صلاح ومشورہ کے بعد،پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک معزز صحابی سلمان فارسی کی تجویز پر شہر مدینہ کے اردگرد ایک خندق کھودی گئی اور لشکر اسلام نے شہر کے اندر پناہ لی۔دشمن کی فوجیں جب مدینہ پہنچیں تو انھیں مدینہ کے اندر داخل ہونے کا راستہ نہیںملا،مجبور ہو کر انہوں نے شہر مدینہ کو اپنے محاصرہ میں لے لیا اور اسی صورت میں جنگ شروع کی۔جنگ اور محاصرہ کچھ طولانی ہوگیا۔اسی جنگ میں عرب کا نامور شجاع اور شہسوار عمروبن عبدود،حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں قتل ہوا۔آخر کار طوفان،سردی،محاصرہ کے طولانی ہونے،عربوں کی خستگی اور یہود واعراب کے درمیان اختلاف کے نتیجہ میں محاصرہ ختم ہوا اور کفار کا لشکر مدینہ سے چلا گیا۔

٤۔جنگ خیبر

جنگ خندق کے بعد،جس کے اصلی محرک یہودی تھے،جنہوں نے کفار عرب کا تعاون کر کے اعلانیہ طور پر اسلام کے ساتھ اپنے معاہدہ کو توڑ دیا تھا،پیغمبر اسلام ﷺ نے خدا کے حکم سے مدینہ میں موجود یہودی کے قبائل کی گوشمالی اور تنبیہ کرنے کے لئے ان کے ساتھ چند جنگیں لڑیں اور یہ سب جنگیں مسلمانوں کی فتحیابی پر ختم ہوئیں۔ان میں سب سے اہم "جنگ خیبر" تھی۔خیبر کے یہودیوں کے قبضہ میں چند مستحکم اور مضبوط قلعے تھے اور انکے پاس جنگجوئوں کی ایک بڑی تعداد تھی،جو جنگی سازوسامان سے لیس تھے۔

اس جنگ میں حضرت علی علیہ السلام نے یہودیوں کے نامور پہلوان "مرحب" کو قتل کر کے یہودیوں کے لشکر کو تہس نہس کر دیا اور اس کے بعد قلعہ پر حملہ کیا اور قلعہ کے صدر دروازے کو اکھاڑ دیا اور اسطرح اسلام کا لشکر قلعہ کے اندر داخل ہوا اور فتح وظفر کے پرچم کو قلعہ پر لہرادیا۔اسی جنگ میں،جو ۵ھ میں ختم ہوئی حجاز کے یہودیوں کا خاتمہ ہوا۔

بادشاہوں اور سلاطین کو دعوت اسلام

٦ھمیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کئی بادشاہوں،سلاطین اور فرمانروائوں،جیسے:شاہ ایران،قیصر روم،سلطان مصر اور حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے نام چند خطوط تحریر فرمائے اور انھیں اسلام کی دعوت دی۔نصرانیوں اور مجوسیوں کے ایک گروہ نے جزیہ دے کر امن سے رہنے کا وعدہ کیا اور اسطرح اسلام کے ذمہ میں آگئے۔آنحضرت ﷺ نے کفار مکہ سے جنگ نہ کرنے کا ایک معاہدہ کیا۔اس معاہدہ کے جملہ شرائط میں یہ شرط بھی تھی کہ مکہ میں موجود مسلمانوں کو کسی قسم کی اذیت نہ پہنچائی جائے اور اسلام کے دشمنوں کی مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں مدد نہ کی جائے۔

لیکن کفار مکہ نے کچھ مدت کے بعد اس معاہدہ کو توڑ دیا ، جس کے نتیجہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ کو فتح کرنے کا فیصلہ کیا اور ٦ھ میں دس ہزار کے ایک لشکر کے ساتھ مکہ پر حملہ کیا۔ مکہ کسی جنگ، خونریزی اور مزاحمت کے بغیر فتح کیا اور خانہ کعبہ کو بتوں سے صاف کیا ۔

عام معافی کا اعلان فرمایا ۔مکہ کے سرداروں کو۔جنہوں نے بیس سال کے عرصہ میں آپ ﷺ سے کافی دشمنی کی تھی اور آپ ﷺ کے اور آپ کے اصحاب کے ساتھ ناروا سلوک کیا تھا۔ اپنے پاس بلایا اور کسی قسم کی شدت ،برے سلوک اور سختی کے بغیر نہایت مہربانی اور لطف و کرم سے انھیں معاف فرمایا ۔

٥۔جنگ حنین

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ کو فتح کرنے کے بعد، اس کے اطراف منجملہ شہر طائف کو فتح کرنے کے لئے اقدام کیا اور اس سلسلہ میں عربوں سے متعدد جنگیں لڑیں کہ ان میں سے ایک "جنگ حنین "ہے۔

"جنگ حنین"، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اہم جنگوں میں سے ہے۔یہ جنگ فتح مکہ کے کچھ ہی دنوں بعد حنین، میں قبیلہ ھوازن سے ہوی ۔ لشکر اسلام نے دوہزار سپاہیوں سے ھوازن کے کئی ہزار سواروں کا مقابلہ کیا اور ان کے درمیان ایک گھمسان کی جنگ ہوی۔

ھوازن، نے جنگ کے آغاز میں مسلمانوں کو بری طرح شکست دیدی، یہاں تک کہ حضرت علی علیہ السلام ،کہ جن کے ہاتھ میں اسلام کا پرچم تھا ،جو پیغمبر اسلام ﷺ کے آگے آگے لڑرہے تھے اور چند گنے چنے افراد کے علاوہ سب بھاگ گئے ۔ لیکن کچھ دیر کے بعد ہی پہلے انصار اور پھر دوسرے مسلمان دوبارہ میدان کارزار کی طرف واپس لوٹے اور ایک شدید اور سخت جنگ لڑی اور دشمن کو تہس نہس کر کے رکھ دیا ۔

اس جنگ میں دشمن کے پانچ ہزار سپاہی لشکر اسلام کے ہاتھوں اسیر ہوئے ، لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر مسلمانوں نے تمام اسیروں کو آزاد کردیا ، صرف چند افراد ناراض تھے کہ آنحضرت نے ان کے حصے میں آئے افراد کو پیسے دیکر خرید لیا اور پھر انہیںآزاد کر دیا ۔

٦۔جنگ تبوک

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ٩ ہجری میں قیصر روم سے جنگ کرنے کی غرض سے تبوک پر لشکر کشی کی(تبوک شام او رحجازکی سرحدپر ایک جگہ ہے) کیونکہ افواج پھیلی تھی کہ قیصر روم نے اس جگہ پر رومیوں اور اعراب کے ایک لشکر کو تشکیل دیا

ہے ۔ جنگ موتہ بھی اس کے بعد رومیوں کے ساتھ وہیں پر لڑی گئی جس کے نتیجہ میں جعفر بن ابیطالب ، زید بن حارثہ اور عبد اللہ بن رواحہ جیسے اسلامی فوج کے سردار شہید ہوئے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے تیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ تبوک پر حملہ کیا لیکن اسلامی لشکر کے پہنچنے پر وہاں موجود افراد بھاگ گئے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم تین دن تبوک میں ٹھہرے ۔ اس کے اطراف کی پاک سازی کرنے کے بعد واپس مدینہ لوٹے۔

اسلام کی دوسری جنگیں

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ و سلم نے مذکورہ جنگوں کے علاوہ مدینہ منورہ میں اپنے دس سالہ قیام کے دوران تقریبا اَسّی چھوٹی بڑی جنگیں لڑی ہیں، جن میں سے ایک چوتھائی جنگوں میں آپ ﷺ نے بذات خود شرکت فرمائی۔

آنحصرت ﷺ نے جن جنگوں میں شرکت فرمائی ،دوسرے کمانڈروں کے بر خلاف کہ وہ پناہ گاہ میں بیٹھ کر فرمان جاری کرتے ہیں ،آپ ﷺ بذات خودسپاہیوں کے شانہ بہ شانہ لڑتے تھے ، لیکن کسی کو ذاتی طور پر قتل کرنے کا آپ ﷺ کے لئے کبھی اتفاق پیش نہیں آیا ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معنوی شخصیت کا ایک جائزہ

مستند تاریخی اسناد کے مطابق،پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ایسے ماحول میں پرورش پائی تھی جو جہالت، فساد اور خلاقی برائیوں کے لحاظ سے بدترین ماحول تھا۔ آپ ﷺ نے ایک ایسے ہی ماحول میں کسی تعلیم وتربیت کے بغیر اپنے بچپن اور جوانی کے ایام گزارے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اگرچہ ہرگز بت پرستی نہیں کی اورخلاف انسانیت کاموں میں آلودہ نہیں ہوئے، لیکن آپ ﷺ ایسے لوگوں میں زندگی گزار رہے تھے کہ کسی بھی صورت میں آپ ﷺ کی زندگی سے اس قسم کے روشن مستقبل کا اشارہ تک نہیں ملتا تھا، سچ یہ ہے کہ ایک غریب ونادار یتیم اورکسی سے تعلیم وتربیت حاصل نہ کرنے والے شخص سے یہ سب برکتیں قابل یقین نہیں تھیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی حالت میں ایک زمانہ گزارا،یہاں تک کہ انہی راتوں میں سے ایک رات کو جب آپ ﷺ اپنے آرام ضمیر اورخالی ذہن کے ساتھ عبادت میں مشغول تھے، اچانک اپنے آپ کو ایک دوسری شخصیت میں پایا۔آپ ﷺ کی پوشیدہ باطنی شخصیت ایک آسمانی شخصیت میں تبدیل ہوگئی، انسانی معاشرے کے ہزاروں سال پہلے کہ افکار کو خرافات سمجھا اور دنیا والوں کی روش اور دین کو اپنی حقیقت پسندانہ نگاہوں سے ظلم وستم کے روپ میں دیکھا۔

دنیا کے ماضی اور مستقبل کو آپس میں جوڑدیا، سعادت بشری کی راہ کی تشخیص کردی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھ اور کان نے حق وحقیقت کے علاوہ نہ کچھ دیکھا اورنہ کچھ سنا، آپ ﷺ کی زبان کلام خدا سے پیغام آسمانی اور حکمت وموعظہ کے لئے کھل گئی، اندرونی ضمیر جو تجارت، لین دین اور روزہ مرہ کی مصلحتوں میں سر گرم تھا، وہ دل وجان سے دنیا اوردنیا والوں کی اصلاح اور بشر کی ہزاروں سال کی گمراہی اور ظلم وستم کو ختم کرنے پر اتر آیا اور حق وحقیقت کو زندہ کرنے کے لئے تن تنہا قیام کیا اور دنیا کی وحشتناک متحد مخالف طاقتوں کی کوئی پروانہ کی معارف الٰہیہ کو بیان کیا اور کائنات کے تمام حقائق کا سرچشمہ خالق کائنات کی وحدانیت کو سمجھا۔

انسان کے اعلیٰ اخلاق کی بہترین تشریح فرمائی اور ان کے روابط کو کشف اور واضح کیا، جو بیان فرماتے تھے خوددوسروں سے پہلے اس کے قائل ہوتے تھے اور جس چیزکی ترغیب فرماتے تھے، پہلے خود اس پر عمل کرتے تھے۔

شریعت اور احکام، جو عبادتوں اور پرستشوں کے ایک مجموعہ پر مشتمل ہیں، وہ خدائے یکتا کی عظمت وکبریائی کے سامنے بندگی کوایک اچھے انداز میں پیش کرتے ہیں۔اس کے علاوہ عدلیہ اور تعزیرات سے متعلق دوسرے قوانین بھی لائے، کہ جو انسانی

معاشرے کے تمام ضروری مسائل کا اطمینان بخش جواب دیتے ہیں، وہ ایسے قوانین ہیںجو آپس میں مکمل طور پر ایک دوسرے سے مرتبط ہیں اور توحید، انسانی احترام و عالی اخلاق کی بنیاد پر استوار و پائدار ہیں ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لائی ہوئی عبادات و معاملات پر مشتمل قوانین کا مجموعہ، اس قدر وسیع اور جامع ہے کہ عالم بشریت میں انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام مسائل موجود ہیں اور زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ پیش آنے والی گوناگوں ضرورتوں کی تحقیق کر کے تشخیص کا حکم دیتا ہے ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے دین کے قوانین کو عالمی اور ابدی جانتے ہیں، یعنی آپ ﷺ کا اعتقاد ہے کہ آپ ﷺ کا دین تمام انسانی معاشروں کی دنیوی و اخروی ضرورتوں کو ہر زمانے میں پورا کرسکتا ہے، اور لوگوں کو اپنی سعادت کے لئے اسی روش کو اختیار کرنا چاہیئے ۔

البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات کو عبث اور مطالعہ کے بغیر نہیں فرمایا ہے بلکہ خلقت کی تحقیق اور عالم انسانیت کے مستقبل کی پیشینگوئی کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔دوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے کہ :

اولاً : اپنے قوانین اور انسان کی جسمی اور روحی خلقت کے درمیان مکمل توافق و ہم آہنگی کو واضح کردیا۔

ثانیا : مستقبل میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور مسلمانوں کے معاشرے کو پہنچنے والے نقصانات کو مکمل طور پر مدنظر رکھنے کے بعد اپنے دین کے احکام کے ابدی ہونے کا حکم فرمایا ہے ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو پیشنگوئیاں قطعی دلیلوں کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہیں، ان کے مطابق آپ ﷺ نے اپنی رحلت تک کے عمومی حالات کی تشریح فرمائی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان معارف کے اصولوں اور شرائط کو پراکندہ طور پر قرآن مجید میں لوگوں کے لئے تلاوت فرمائی ہیں کہ اس کی حیرت انگیز فصاحت وبلاغت نے عرب دنیا کے فصاحت وبلاغت کے اساتذہ اور ماہروں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا اور دنیا کے دانشمندوں کے افکار کو متحیر کر کے رکھدیا ہے ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان تمام کارناموں کو ۲۳ سال کے عرصہ میں انجام دیا ہے کہ جن میں سے ۱۳ سال جسمانی اذیت، اور کفار مکہ کی ناقابل برداشت مزاحمتوں میں گزارے اور باقی دس سال بھی جنگ، لشکر کشی، کھلم کھلا دشمنوں کے ساتھ بیرونی مقابلہ اور منافقین اور روڑے اٹکانے والوں کے ساتھ اندرونی مقابلہ اور مسلمانوں کے امور کی باگ ڈور سنبھالنے میں اوران کے عقائد واخلاق واعمال اور ہزاروں دوسری مشکلات کی اصلاح کرنے میں گزارے ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ پورا راستہ ایک ایسے غیر متزلزل ارادہ سے طے کیا، جو حق کی پیروی اور اسے زندہ کرنے کے لئے تھا۔آپ ﷺ کی حقیقت پسندانہ نظر صرف حق پر ہوتی تھی اور خلاف حق کو کوئی اہمیت نہیں دیتی تھی۔ اگر کسی چیز

کواپنے منافع کے یا میلانات اور اپنے عمومی جذبات کے موافق پاتے تھے تو ان میں سے جس کو حق جانتے اسے قبول فرماتے اور اسے مسترد نہیں کرتے تھے اور جس کو باطل سمجھتے تھے اسے مسترد کر دیتے اور ہرگز قبول نہیں کرتے تھے ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غیر معمولی معنوی شخصیت

اگر ہم انصاف سے مذکورہ مطالب پر تھوڑا سا غور وخوص کریں گے، تو کسی شک وشبہہ کے بغیر یہ قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ ان حالات اور ماحول میں ایسی شخصیت کا پیدا ہونا معجزہ اور خدائے متعال کی خاص تائید کے علاوہ کچھ نہیں تھا ۔

اس لحاظ سے ،خدائے متعال اپنے کلام پاک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امی ہونے ،یتیمی اور سابقہ مفلسی کے بارے میں یاددہانی کراتا ہے ،اور ان کو عطا کی گئی شخصیت کو ایک آسمانی معجزہ شمار کرتا ہے اوراسی سے آپ ﷺ کی دعوت کی حقانیت کا استدلال کرتا ہے ،چنانچہ فرماتا ہے :

(الم یجدک یتیما فآوی٭و وجدک ضالّا فھدیٰ٭ و وجدک عائلاً فاغنی) (ضحی٨٦)

"کیا اس نے تم کو یتیم پاکر پناہ نہیں دی ہے ؟اور کیا تم کوگم گشتہ پاکر منزل تک نہیں پہنچایا ہے؟اور تم کو تنگ دست پاکر غنی نہیں بنایا ہے؟"

(وماکنت تتلوا من قبله من کتاب ولا تخطّه بیمینک) ۔

(عنکبوت٤٨)

"اور اے پیغمبر!آپ اس قرآن سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے کچھ لکھتے تھے..."

(وان کنتم فی ریب ممّا نزّلناعلی عبدنا فاتو بسورةٍ من مثله) ۔(بقرہ٢٣)

"اگر تمھیں اس کلام کے بارے میں کوئی شک ہے جسے ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تو اس کا جیسا ایک ہی سورہ لے آئو.
.."

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت

تنہا اصل جس پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا کے حکم سے اپنے دین کی بنیاد رکھی اور اسے دنیا والوں کے لئے سعادت کا سبب قرار دیا، وہ توحید کی اصل ہے ۔

توحید کی اصل کے مطابق، جو خالق کائنات پرستش کا سزاوار ہے وہ خدائے یکتا ہے ، اور خدائے متعال کے علاوہ کسی اور کے لئے سر تعظیم خم نہیں کیا جاسکتا۔

اس بناپر، انسانی معاشرہ میں جوروش عام ہونی چاہیئے، وہ یہ ہے کہ سب آپس میں متحد اور بھائی بھائی ہوں اور کوئی اپنے لئے خدا کے سوا کسی کو بلا قید وشرط حاکم مطلق قرار نہ دے، چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے:

(قل یااھل الکتاب تعالوا الی کلمةٍ سواء بیننا وبینکم الا نعبد الااللہ ولا نشرک بہ شیئا ولا یتّخذ بعضنا بعضا ارباباً من دون اللہ) ۔(آل عمران٦٤)

"اے پیغمبر!آپ کہدیں کہ اہل کتاب !آئوایک منصفانہ کلمہ پر اتفاق کر لیں کہ خدا کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں، کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں آپس میں ایک دوسرے کو خدائی کا درجہ نہ دیں..."

اس آسمانی حکم کے مطابق، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی سیرت میں سبھی کو برابر وبرادر قرار دیتے تھے اوراحکام وحدودالٰہیٰ کے نفاذمیں ہرگمز امتیازی سلوک اور استثنا کے قائل نہیں تھے، اس طرح اپنے اورپرائے، طاقت ور اور کمزور، امیر وغریب اور مرداورعورت میں فرق نہیں کرتے تھے اورہرایک کے حق کو دین کے احکام وقوانین کے مطابق اس تک پہنچاتے تھے ۔

کسی کوکسی دوسرے پرحکم فرمائی اور فرمانروائی اور زبردستی کرنے کا حق نہیں تھا۔ لوگ قانون کے حدود کے اندر زیادہ سے زیادہ آزادی رکھتے تھے ۔(البتہ قانون کے مقابلہ میں آزادی نہ صرف اسلام میں بلکہ دنیا کے اجتماعی قوانین میں بھی کوئی معنی نہیں رکھتی ہے)

آزادی اور اجتماعی عدالت کی اسی روش کے بارے میں خدائے متعال اپنے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعارف کراتے ہوئے فرماتا ہے:

(الّذین یتّبعون الرّسول النبیّ الامیّ الذی یجدونہ مکتوباً عندھم فی التورٰیة والانجیل یامرھم بالمعروف وینھٰھم عن المنکر و یحلّ لھم الطیبت ویحرّم علیھم الخبٰئث ویضع عنھم اصرھم والاغلل الّتی کانت علیھم فالّذین امنوا بہ وعزّروہ ونصروہ واتّبعوا النّور الّذی انزل معہ اولئک ھم المفلحون٭قل یا ایّھا النّاس انّی رسول اللہ الیکم جمیعا) ۔ (اعراف١٥٧،١٥٨)

"جو لوگ رسول نبی امی کا اتباع کرتے ہیں کہ،جس کا ذکر اپنے پاس توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں کہ وہ نیکیوں کا حکم دیتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے اور پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے اور خبیث چیزونکو حرام قرار دیتا ہے اور ان پرسے احکام کے سنگین بوجھ اور قید وبند کو اٹھا دیتا ہے ،پس جو لوگ اس پر ایمان لائے،اس کا احترام کیا ،اس کی امداد کی اوراس نور کا اتباع کیا جواس کے ساتھ نازل ہوا ہے وہی درحقیقت فلاح یافتہ اور کامیاب ہے . پیغمبر! کہدو اے لوگو!میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول اور نمائندہ ہوں..."

یہاں پر معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی زندگی میں اپنے لئے کسی قسم کا امتیاز نہیں برتتے تھے اور ہر گز وہ شخص جو پہلے سے آپ ﷺ کو نہیں جانتا تھا، اس میں اور دوسروں میں امتیاز نہیں برتا جاتا تھا۔

آپ ﷺ اپنے گھر کا کام خود انجام دیتے تھے، ہر ایک کو ذاتی طور پر شرف یابی بخشتے تھے، حاجتمندوں کی باتوں کو خود سنتے تھے، تخت اور صدر محفل کی جگہ پر نہیں بیٹھتے تھے۔ راستہ چلتے وقت جاہ و حشم اور سرکاری تکلفات سے نہیں چلتے تھے۔

اگر کوئی مال آپ ﷺ کے ہاتھ میں آتا تو اپنے ضروری مخارج کے علاوہ باقی مال کو فقرا میں تقسیم کرتے تھے اور کبھی اپنی ضرورت کی اشیاء کو بھی حاجتمندوں میں تقسیم کر کے خود بھوکے رہتے تھے اور ہمیشہ فقیرانہ زندگی گزارتے تھے اور فقراء کے ساتھ ہم نشیں ہوتے تھے، لوگوں کے حقوق کی دادرسی میں کبھی غفلت اور لاپر وائی نہیں کرتے تھے، لیکن اپنے ذاتی حقوق میں زیادہ تر عفو و بخشش سے کام لیتے تھے۔

جب فتح مکہ کے بعد قریش کے سرداروں کو آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر کیا گیا، تو آپ ﷺ نے کسی قسم کی تندی اور سختی کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ سبھی کو عفو کیا، جبکہ ہجرت سے پہلے انہوں نے مستقل آپ ﷺ پر ظلم کئے تھے اور ہجرت کے بعد بھی فتنے برپا کر کے آپ ﷺ کے ساتھ خونین جنگیں لڑی تھیں۔ آپ ﷺ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت پر خدا کا درود و سلام ہو۔

بخوبی جان لینا چاہئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دین اور توحید کے نشر کے علاوہ کوئی مقصد نہیں رکھتے تھے، اور اچھے اخلاق، خندہ پیشانی اور واضح ترین استدلال و برہان سے لوگوں کو توحید کی دعوت دیتے تھے اور اپنے اصحاب کو بھی اسی روش پر عمل کرنے کی نصیحت فرماتے تھے، چنانچہ خدائے متعال آپ ﷺ کو اس طرح حکم فرماتا ہے:

(قل هذه سبیلی ادعوا الی الله علی بصیرة انا و من اتّبعنی) ۔ (یوسف۱۰۸)

"آپ کہدیجئے کہ یہ میرا راستہ ہے کہ میں بصیرت کے ساتھ خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں اور میرے ساتھ میرا اتباع کرنے والا بھی ہے"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس امر کی طرف انتہائی توجہ رکھتے تھے کہ اسلامی معاشرہ میں ہر فرد (اگرچہ غیر مسلمان اور اسلام کے ذمہ دار میں ہو) اپنا حق حاصل کرے اور الہی قوانین کے نفاذ میں کسی قسم کا استثنا پیدا ہونے نہ پائے اور حق و عدل کے سامنے سب مساوی ہوں، کوئی کسی پر (تقوی کے علاوہ) کسی قسم کا امتیاز نہ جتلائے اور مال و دولت یا حسب و نسب اور عام قدرت کے بل بوتے پر کسی پر ترجیح حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے، فخر نہ جتائے اور معاشرے کے مالدار لوگ کمزوروں اور محتاجوں پر زبردستی نہ کریں اور اپنے ماتحتوں پر ظلم نہ کریں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود بھی فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے، اور اٹھنے، بیٹھنے اور راستہ چلنے میں ہر گز تکلفات سے کام نہیں لیتے تھے۔ اپنے گھریلو کام بھی انجام دیتے تھے، آپ ﷺ کے پاس محافظ ونگہبان نہیں تھے۔ لوگوں کے درمیان عام شخص جیسے لگتے تھے، جب لوگوں کے ہمراہ چلتے تھے تو کبھی آگے نہیں بڑھتے تھے، جب کسی محفل میں داخل ہوتے تو نزدیک ترین خالی جگہ پر بیٹھ جاتے، اصحاب کو نصیحت فرماتے تھے کہ دائرے کی صورت میں بیٹھیں تاکہ محفل صدر نشین کی حالت پیدا نہ کرے، جس کو دیکھتے، چاہے عورت ہو یا بچہ سب کو سلام کرتے تھے۔ ایک دن آپ ﷺ کا ایک صحابی آپ ﷺ کے سامنے خاک پر گر کر سجدہ کرنا چاہتا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا کر رہے ہو؟ یہ قیصر و کسری کی روش ہے اور میری شان پیغمبری اور بندگی ہے، آپ ﷺ نے اپنے صحابیوں کو نصیحت فرماتے تھے کہ حاجتمندوں کی حاجتوں اور کمزوروں کی شکایتوں کو مجھ تک ضرور پہنچائیں اور اس سلسلہ میں کوتاہی نہ کریں۔ کہا جاتا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو آخری نصیحت لوگوںکو کی وہ غلاموں اور عورتوں کے بارے میں تھی۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کے بارے میں چند نکات

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے نیک اخلاق میں دوست ودشمن میں معروف ومشہور تھے۔ آپ ﷺ کے حسن اخلاق کا یہ عالم تھا کہ، ظالم دشمنوںاورناداں دوستوں کی بد اخلاقی اور آزار و بے ادبی وجسمانی اذیتوںکے باوجود آپ کی تیوری پر بل نہ آتے تھے اورناراضگی کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ سلام کرنے میں عورتوں بچوں اور ماتحتوں پر سبقت کرتے تھے۔ جب آپ ﷺ کو خدا کی طرف سے دین کی تبلیغ اور لوگوں کی رہبری کرنے کی ذمہ داری ملی، تو آپ ﷺ نے فریضہ کی انجام دہی میں ایک لمحہ بھی کوتاہی نہیں کی اور اپنی انتھک کوششوں کی بنا پر کبھی آرام سے نہیں بیٹھے۔ ہجرت سے تیرہ سال پہلے مکہ میں، مشرکین عرب کی طرف سے ناقابل برداشت مشکلات اوراذیتوں کے باوجودعبادت ودین خدا کی تبلیغ میں مسلسل مشغول رہتے تھے۔ ہجرت کے بعددس سال کے دوران بھی دین کے دشمنوں کی طرف سے روزبروز مشکلات اوریہودیوں اور مسلمان نمامنافقوں کی طرف سے روڑے اٹکا ئے جاتے رہے۔

معارف دین اور قوانین اسلام کوحیرت انگیز وسعت کے ساتھ لوگوں تک پہنچایا دشمنان اسلام سے ۸۰ سے زیادہ جنگیں لڑیں۔ اس کے علاوہ اسلامی معاشرے کی باگ ڈور۔ جو ان دنوں تمام جزیرئہ نما عرب پر پھیلا ہوا تھا۔ آپ ﷺ کے ہاتھوں میں تھی، یہاں تک کہ لوگوں کی چھوٹی سے چھوٹی شکایتوں اور ضرورتوں کو بھی کسی رکاوٹ کے بغیر خود برطرف فرماتے تھے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شجاعت اور شہامت کے بارے میں اتنا ہی کافی ہے کہ آپ ﷺ نے اس وقت تن تنہا حق کی دعوت کا پرچم بلند کیا، جبکہ دنیابھر میں ظلم وزبردستی اور حق کشی کے علاوہ حکومت نہیں کی جا سکتی تھی آپ ﷺ نے

وقت کے ظالموں سے بے انتہا جسمانی اذیتیں اور تکلفیں اٹھائیں، لیکن یہ سب چیزیں آپ ﷺ کے عزم وارادے میں سستی اور کمزوری پیدا نہ کرسکیں اورآپ نے کسی جنگ میں پیٹھ نہیں دکھائی ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہایت پاکیزہ نفس کے مالک تھے، فقیرانہ لباس پہنتے تھے اور سادہ زندگی گزارتے تھے،آپ ﷺ کے اورنوکرونوغلاموں کے درمیاں کوئی فرق نظرنہیں آتا تھا،آپ ﷺ کے پاس کافی مال ومنال آتا تھالیکن اسے مسلمان فقراء میں تقسیم کرتے تھے، تھوڑی مقدار میں اپنی اور اپنے اہل وعیال کی زندگی کے لئے لیتے تھے۔بعض اوقات کئی دنوں تک آپ ﷺ کے گھر سے دھواں نہیں اٹھتا تھا اورپکاہوا کھانانصیب نہیں ہوتا تھا ۔زندگی میں صفائی خاص کرعطر کو بہت پسند فرماتے تھے ۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی اپنی حالت نہیں بدلی،جو تواضع و فروتنی آپ ﷺ کی ابتدائی زندگی میں تھی وہی آخرتک رہی اور اس گراں قدر حیثیت کے مالک ہونے کے باوجود،ہرگز اپنے لئے ایسے امتیاز کے قائل نہ ہوئے جس سے آپ ﷺ کی اجتماعی قدر ومنزلت دکھائی دیتی ۔آپ ﷺ کبھی تخت پر نہیں بیٹھے، محفل کی صدرنشین کو کبھی اپنے لئے مخصوص نہ کیا،راستہ چلتے وقت کبھی دوسروں سے آگے نہیں بڑھے اور کبھی حکمراں اور فرمانرواکا قیافیہ اختیار نہیں کیا۔جب اپنے اصحاب کے ساتھ کسی عام محفل میں تشریف فرما ہوتے تھے،تو اگرکوئی اجنبی شخص آپ ﷺ سے ملاقات کے لئے آجاتا تھاتو وہ آپ ﷺ کو نہیں پہچان پاتا تھا اوروہاں پر موجود لوگوںسے مخاطب ہو کر کہتا تھا:آپ میں کون شخص پیغمبر خدا ﷺ ہے؟پھر لوگ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعارف کراتے تھے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی پوری زندگی میں کسی کو گالی نہیں دی اور کبھی بیہودہ کلام نہیں کیا،کبھی قہقہہ لگاکر نہیں ہنسے اور،کوئی ہلکا اور بے فائدہ کام انجام نہ دیا۔غور وخوض کو پسند فرماتے تھے،ہردردمند کی بات اور ہرایک کا اعتراض سنتے تھے،پھر جواب دیتے تھے، کبھی کسی کی بات نہیں کاٹتے تھے،آزادتفکر میں رکاوٹ نہیں بنتے تھے، لیکن اشتباہ کرنے والے کو اشتباہ کو واضح کرکے اس کے اندورونی زخم پر مرہم لگاتے تھے ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مہربان اور انتہائی نرم دل تھے،ہر مصیبت زدہ کی مصیبت کو دیکھ کر رنجیدہ ہوتے تھے، لیکن بدکاروں اور مجرموں کو سزا دینے میں نرمی نہیں کرتے تھے اورسزا کوجاری کرتے وقت اپنے اورپرایے اور بیگانہ وآشنا میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے ۔

ایک انصاری کے گھرمیں چوری ہوئی تھی،اس سلسلہ میں ایک یہودی اور ایک مسلمان ملزم ٹھہرائے گئے ۔انصار کی ایک بڑی جماعت آنحضرت ﷺ کے پاس آئی اوردباؤڈالاکہ مسلمانوں خاص کر انصارکی آبرو بچانے کے لئے،صرف یہودی کو سزادی جائے ۔کیونکہ انصار کے ساتھ یہودیوں کی کھلم کھلادشمنی تھی ۔لیکن آنحضرت ﷺ نے حق کو ان کی مرضی کے برخلاف ثابت کیا ،یہودی کی آشکارا طورپر حمایت کی اور مسلمان کو سزا سنادی ۔

جنگ بدر کی پکڑ دھکڑ کے دوران مسلمانوں کی صفوں کو منظم کرتے ہوئے جب آنحضرت ایک سپاہی کے پاس پہنچے جو تھوڑ اسا آگے تھا ،تو آپ نے اپنے عصا سے اس سپاہی کے پیٹ پر رکھ کر تھوڑا ساڈھکیلاتاکہ اپیچھے ہٹے اور صف سیدھی ہو جائے ۔ سپاہی نے کہا: یارسول اللہ ! خدا کی قسم میرے پیٹ میں درد ہونے لگا۔میں آپ ﷺ سے قصاص لوں گا۔آنحضرت ﷺ نے اپنے عصا کو اس کے ہاتھ میں دیدیا ، اور اپنے شکم سے لباس ہٹادیا اور فرمایا آئو قصاص لے لو ۔ سپاہی نے بڑھ کر آنحضرت ﷺ کے شکم مبارک کو چوما اور کہا :"میں جانتا ہوں کہ آج قتل کیا جائوں گا ،میں اس طرح آپ ﷺ کے بدن مقدس کا بوسہ لینا چاہتا تھا[1] "اسکے بعد اس سپاہی نے دشمن پر حملہ کیا اور تلوار چلائی یہاں تک کہ شہید ہوگیا ۔

مسلمانوں کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت

عالم بشریت ،کائنات کے دوسرے ان تمام اجزاء کے مانند تغیر وتبدل کی حالت میں ہے کہ جس کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں۔اور لوگوں کی بناوٹ میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کی وجہ سے انسان میں مختلف سلیقے وجود میں آئے ہیں کہ جن کے نتیجہ میں لوگ ،فہم وادراک کی تیزی وکندی ، حفظ اور افکار کی فراموشی میں مختلف ہیں ۔

اس لحاظ سے ،عقائد اور اسی طرح رسومات اور ایک معاشرہ میں جاری قوانین کی ایک پائدار بنیاد کی حفاظت کے لئے اگر باایمان وقابل اعتماد نگہبان ومحافظ نہ ہوں ،تووہ تھوڑی ہی مدت کے بعد تغیر وتبدل اور انحراف کا شکار ہو کر نابود ہو جائیں گے ۔ مشاہدہ اور تجربہ ہمارے لئے اس مسئلہ کو واضح ترین صورت میں ثابت کرتا ہے ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے عالمی اورابدی دین کو درپیش خطرے سے بچانے کے لئے پائدارو محکم سند اور با صلاحیت محافظ کے طورپرکتاب خدا اور اپنے اہل بیت علیہم السلام کو لوگوں کے کے سامنے پیش کیا ،چنانچہ شیعہ اور سنی راویوں نے تواتر کے ساتھ نقل کیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بارہا فرمایا :"میں اپنے بعد،

خدا کی کتاب اور اہل بیت کو تم لوگوں میں چھوڑرہا ہوں ، یہ دونوںکبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے ،،جب تک تم لوگ ان سے متمسک رہو گے،گمراہ نہیں ہوگے ۔"[2]

پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت اور جانشینی کا مسئلہ

وہ آخری شہر ،جس کا فتح ہونا اسلام کے جزیرۂ نما عرب پر تسلط جمانے کا سبب بنا،شہر "مکہ" تھا،کہ جہاں پر حرم خدا اور کعبہ ہے ۔یہ شہر ۸ھ میں اسلامی لشکر کے ہاتھوں فتح ہوا اور اس کے فوراہی بعد شہر طائف بھی فتح ہوا ۔

۱۰ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فریضہ حج انجام دینے کے لئے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔حج کے اعمال اور لوگوں تک ضروری تعلیمات پہنچانے کے بعد مدینہ روانہ ہوئے۔راستہ میں "غدیر خم "نامی ایک جگہ پر قافلہ کو آگے بڑھنے سے روکنے کا حکم فرمایا اور مختلف علاقوں سے آئے ہوئے ایک لاکھ بیس ہزار حاجیوں کے درمیان حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھ کو پکڑ کر بلند کیا اور تمام لوگوں میں حضرت علی کی ولایت اور جانشینی کا اعلان فرمایا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس اقدام سے اسلامی معاشرہ میں والی کا مسئلہ۔کہ جو اسلامی معاشرہ میں مسلمانوں کے امورپر ولایت رکھتا ہے اور کتاب وسنت اوردینی معارف اور قوانین کی حفاظت کرتاہے۔حل ہوا اور آیۂ شریفہ:(یا ایّھا الرّسول بلّغ ما انزل الیک من ربّک وان لم تفعل فما بلّغت رسالته) ۔(مائدہ ٦٧)کا حکم نافذ ہوا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ لوٹے، ستّردن کے بعد،تقریبا ۲۸ماہ صفر ۱۱ھ کو رحلت فرمائی۔

۱۔طبری ،تاریخ ،ج ۲،ص۱٤۹

2۔(انی تارک فیکم الثقلین !کتاب اللہ وعترتی اھل بیتی !ما ان تمسکتم بھمالن تضلوابعدی ابداوانھمالن یفترقا حتی یرداعلی الحوض۔(غایۃ المرام،ص۲۱۲الغدیر،ج ۱،ص٥٥)

قرآن مجید، نبوت کی سند

سب سے بڑی دلیل کہ جس کو پیغمبر اکرم ﷺ نے سند نبوت کے طور پر پیش کیا ہے نیز معارف اسلام یعنی اصول و فروع کے لئے ماخذ و مصدر ہے کہ جس پر سب سے زیادہ اعتماد کیا جاتا ہے وہ کتاب آسمانی یعنی قرآن مجید ہے ۔

قرآن مجید، خدائے متعال کے کلام اور خطاب کا ایک مجموعہ ہے ،جو مقام کبریائی کی عزت و عظمت کے مصدر سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا اور اس کے ذریعہ راہ سعادت کی نشاندہی کی گئی ۔

قرآن مجید عالم بشریت کو ایسے علمی و عملی احکام و قوانین کی نشاندہی کرتا ہے کہ جن پر عمل کر کے انسان دنیا وآخرت کی سعادت حاصل کر سکتا ہے ۔

قرآن مجید پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا معجزہ، حجت اور ایک ایسی سند وثبوت ہے جو دشمن کو ہر جہت سے عاجز اور کمزور بنا دیتا ہے اور ہر قسم کے عذر، اعتراض،نزاع اور لڑائی جھگڑے کے راستہ کو اس کے لئے بند کردیتا ہے اور اپنے مقاصد کو واضح ترین صورت میں ثابت کرتا ہے ۔

قرآن مجید اپنے مقاصد میں لوگوں کو آنکھیں بند کر کے تقلید کرنے کی دعوت دینے کے بجائے اس کے ساتھ عام اور خداداد منطق کی زبان میں بات کرتا ہے اور کچھ معلومات کی یاد دہانی کرتا ہے ،جنھیں انسان خواہ نخواہ اپنی فطرت سے درک کرتا ہے ، اوریاد دہانی کراتاہے کہ انسان کبھی ان کو قبول کرنے اور اعتراف کرنے سے پہلو تہی نہیں کر سکتا ہے۔خدائے متعال فرماتا ہے :

(إ(نّہ لقول فصلٌ٭وماھو بالھزل) (طارق۱۳۔۱٤)

"بیشک یہ قول فیصل ہے اور مذاق نہیں ہے ۔"

قرآن مجید ایک مطلب کو بیان کرتا ہے ،جہاں تک اس کی دلالت کی شعاعیں پھیلتی ہیں،ہمیشہ اور سبھی کے لئے زندہ وپایندہ ہے ،نہ لوگوں کی معمولی باتوں کے مانند بعض جہات سے فہم وتفکر کے ذریعہ اس پر احاطہ کیا جاسکتا ہے اور بعض لحاظ سے غفلت اور لاپر وائی کا اس میں امکان ہو،بلکہ یہ ایسے خدائے متعال کا کلام ہے جو ہرظاہروباطن اور مصلحت و مفسدہ سے آگاہ ہے ۔

اس لحاظ سے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ اپنی حقیقت پسندانہ آنکھوں کو کھول دے اور ہمیشہ ان دوآیتہ شریفہ کو مد نظر رکھے ،خدا کے کلام کو زندہ اور پائندہ جانے ۔اور جو دوسروں نے سمجھ کر بیان کیا ہے ،اس پر اکتفانہ کرے ،آزادفکر کے راستے کواپنے اوپر بند نہ کرے، کیونکہ یہ انسانیت کا تنہا خصوصی سرمایہ ہے اور قرآن مجید اس پر عمل کرنے کی بہت تاکید کرتا ہے ۔قرآن مجید ہمیشہ اور سبھی کے لئے قول فیصل اور ایک زندہ حجت ہے اور یہ کتاب کسی خاص گروہ کے فہم تک محدود و منحصر نہیں ہو سکتی ہے ،خدائے متعال فرماتا ہے :

(ولا یکونوا کالّذ ین اوتوا الکتٰب من قبل فطال علیھم الامد فقست قلوبھم) ۔(حدید۱٦)

"اوروہ(مسلمان)ان اہل کتاب کی طرح نہ ہو جائیں ،جنھیں کتاب دی گئی تو ایک عرصہ گزرنے کے بعد ان کے دل سخت ہو گئے
"

قرآن مجید لوگوں سے چاہتا ہے کہ وہ اپنی فطرت کی طرف پلٹیں ، حق کو قبول کریں ،یعنی پہلے اپنے آپ کو بلا قید وشرط حق کو قبول کرنے پرآمادہ کریں اور جب دیکھیں کہ یہ حق ہے اور ان کی دنیوی واخروی سعادت ومنافع اسی میں ہے ،تو شیطانی وسوسوں اور ہواوہوس کی آواز کی طرف کان دھرے بغیر اسے قبول کریں ۔

اس کے بعد، اسلامی معارف کو اپنے زندہ شعور کے سپرد کریں ، اگر دیکھیںکہ یہ حق ہے اور انھیں قبول کر کے ان پر عمل کرنے میں ان کے لئے حقیقی مصلحت وآسودگی ہے تو ان کے سامنے تسلیم ہو جائیں اور البتہ اس صورت میں انسانی معاشرے میں عام ہونے والی زندگی کی روش اوردین، ایسے ضوابط اور احکام ہونگے جنھیں انسان اپنے فطری میلانات کے تحت چاہتا ہے ۔

آخر ایک یکسان روش ہوگی جس کے تمام اجزاء ومواد انسان کی خصوصی بناوٹ سے مکمل ہم آہنگ ہوں گے اورتضادوتناقض سے مکمل طورپر دور ہونگے، نہ ایک ایسی متضاد روش جو کہیں پر معنویات سے وجود میں آتی ہو اور کہیں پر مادیات سے اور کہیں عقل سلیم کے موافق ہو اور بعض مواقع پر ہواہوس کے تابع ہو ۔خدائے متعال قرآن مجید کی توصیف میں فرماتا ہے :

(۔۔۔یہدی الی الحق والی طریق مستقیم) (احقاف ۳۰)

"(یہ کتاب)حق وانصاف اورسیدھے راستہ کی طرف ہدایت کرنے والی ہے "

نیز فرماتا ہے :

(انّ ھذاالقرآن یہدی للّتی ھی اقوم) ۔(اسرائ۹)

"بیشک یہ قرآن اس راستہ کی طرف ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے ..."

ایک دوسری آیت میں اسلام کی اس توانائی کے سبب کو اسلام کے انسان کی خلقت کے مطابق ہونے کو بتاتاہے کیونکہ بالکل واضح ہے کہ جوروش وراستہ انسان کی فطری خواہشوں اور حقیقی ضرورتوں کوپورا کرے، وہ انسان کو بہترین صورت میں کامیاب وخوش بخت بناسکتا ہے:

(فاقم وجھک للدّین حنیفا فطرت اللہ الّتی فطر النّاس علیھا لا تبدیل لخلق اللہ ذلک الدّین القیّم) ۔(روم۳۰)

"آپ اپنے رخ کو دین کی طرف رکھیں اور باطل سے کنارہ کش رہیں کہ یہ دین وہ فطرت الٰہی ہے جس پر اس نے انسانوں کوپیدا کیا اور خلقت الہیٰ میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی ہے۔یقینا یہی سیدھا اور مستحکم دین ہے "

نیز فرماتا ہے :

(۔۔۔کتٰب انزلنہ الیک لتخرج النّاس من الظّلمات الی النّور) ۔(ابراہیم ۱)

"یہ کتاب ہے جسے ہم نے آپ کی طرف نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کو حکم خدا سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آئے..."

قرآن مجید، لوگوں کو ایک ایسے راستہ کی طرف دعوت دیتا ہے کہ جو خود بھی روشن ہو اور منزل مقصود کو بھی واضح طور پر دکھائے ،یہ راستہ قطعا وہی راستہ ہوگا جو انسان کی فطری خواہشات ،جو اسکی واقعی ضرورتیں ہیں ..کو پورا کر سکے اور عقل سلیم کی نظر سے موافق ہونا چاہئے اور یہ وہی دین فطرت ہے جسے "اسلام "کہتے ہیں۔

لیکن جس روش کی بنیاد معاشرہ کی ہوا و ہوس اور شہوانی خواہشات کے لئے یا معاشرے کے با اثر افراد کے ذریعہ رکھی گئی ہو ، اسی طرح جو روش اسلاف کی اندھی تقلید پر بنی ہو، اسی طرح جو راہ و روش ایک پسماندہ اور ناتواں ملت نے ایک توانا اور قدرتمند ملت سے حاصل کر کے عقل و منطق سے اس کی تحقیق کئے بغیر جو کچھ اس سے حاصل کیا ہے، اسے آنکھیں بند کر کے قبول کر کے خود کو اسکے مشابہ بنائے ، ایسی روشیں تاریکی میں ڈوبنے کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور حقیقت میں یہ ایک ایسے راستہ پر چلنے کے مترادف ہے کہ جہاں منزل مقصود تک پہنچنے کی کوئی ضمانت نہیں ہے ،چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے :

(او من كان ميّتا فاحيينه وجعلنا له نوراً يمشى به فى النّاس كمن مثله فى الظّلمات ليس بخارج منها) ...)

(انعام۱۲۲)

"کیا جو شخص مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور اس کے لئے ایک نور قرار دیا جس کے سہارے وہ لوگوں کے درمیان چلتا ہے اسکی مثال اسکی جیسی ہو سکتی ہے جو تاریکیوں میں ہو اور ان سے نکل بھی نہیں سکتا ہو..."

قرآن مجید کی اہمیت

قرآن مجید ایک آسمانی کتاب ہے جو عالمی و ابدی دین اسلام کی پشت پناہ ہے ۔اس میں معارف اسلامی کے کلیات دلکش انداز میں بیان ہوئے ہیں ، اس لحاظ سے اس کی قدر و قیمت دین خدا کی قدر و قیمت کے مساوی ہے ، وہ دین جس سے انسان کی حقیقی سعادت و خوشبختی وابستہ ہے ، وہ ہر چیز سے زیادہ قیمتی، اہم اور بلند ہے بلکہ قدر و قیمت میں کوئی چیز اس سے قابل موازنہ نہیں ہے ۔اسکے علاوہ قرآن مجید خدائے متعال کا کلام اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لافانی معجزہ ہے ۔

قرآن مجید کا معجزہ

یقینا عربی زبان ، ایک قوی اور وسیع زبان ہے ،جو انسان کے باطنی مقاصد کو واضح ترین اور دقیق ترین صورت میں بیان کر سکتی ہے اور یہ اس خصوصیت میں مکمل ترین زبانوں میں سے ایک ہے۔

تاریخ سے ثابت ہو چکا ہے کہ عصر جاہلیت (قبل از اسلام) کے اعراب اکثر خانہ بدوش اور تہذیب وتمدن سے بے بہرہ اورزندگی کے بیشتر حقوق سے بالکل محروم تھے ۔ لیکن وہ قدرت بیان اورکلام کی فصاحت وبلاغت میں ایک بلندمقام رکھتے تھے ،چنانچہ تاریخ کے صفحات میں ان کا حریف پیدانہیں کیا جاسکتا ۔

ادبیات عرب کے میدان میں، فصیح کلام کی بہت قدروقیمت تھی اورادیبانہ اور فصیح کلام کا کافی احترام کیا جاتا تھا .اعراب جس طرح بتوں اوراپنے خدائوں کو خانہ کعبہ میں نصب کرتے تھے ،اسی طرح صف اول کے ادیبوں اورشعراء کے دلکش اشعارکو بھی کعبہ کی دیوارپر لٹکاتے تھے ۔اس کے باوجود کہ وہ ایک وسیع زبان کو ان تمام علامتوں اور دقیق قواعد وضوابط اورکم ترین غلطی اور اشتباہ سے استعمال کرتے تھے اور کلام کی فصاحت وبلاغت میں کمال دکھاتے تھے ،جب ابتدائی ایام میں پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن مجید کی چند آیتیں نازل ہوئیں ،تواعراب اور اس قوم کے ادیبوں اور سخنوروں میں ہلچل مچ گئی اورقرآن مجید کا دلکش اورپُر معنی بیان کا دلوں پر ایسا اثر ہوا کہ دل والوں کو اپنا فریفتہ بنا کر رکھدیا اور وہ ہر فصیح کلام کو بھول گئے اور نامور شعراء جو اپنے اشعار کعبہ کی دیوارپر لٹکائے تھے ، انہیں اتاردیا۔

یہ خدائی کلام ،اپنی ابدی زیبائی و دلکشی سے ہر دل کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا اور اپنی شیرین بیانی سے شیرین زبانوں پرتالا لگادیتا تھا ۔ لیکن دوسری جانب مشرکوں اوربت پرستوں کے لئے انتہائی تلخ وناگوار تھا ،کیونکہ خدا کا کلام اپنے موثر بیان اور قطعی حجت سے دین توحید کو برہان واستدلال بخشتا تھا اورشرک وبت پرست کی روش کی سرزنش کرتا تھا ۔ جن بتوں کو لوگ خدا کہتے تھے ان کے سامنے نیازمندی کا ہاتھ پھیلاتے تھے ، ان کی بارگاہ میں قربانیاں پیش کرتے تھے اور ان کی پوجا کرتے تھے ، قرآن ان کی مذمت کرتا اورانھیں پتھر اور لکڑی کے بے جان وبے فائدہ مجسمے سے تعبیر کرتا تھا ،وحشی اعراب جنہوں نے غروروتکبرمیں غرق ہو کر اپنی زندگی کی بنیاد خونخواری اورڈاکہ زنی پرڈالی تھی ...کو حق پرستی کے دین اورعدالت وانسانیت کے احترام کی طرف دعوت دیتا تھا ،یہی وجہ تھی کہ اعراب جنگ و لڑائی کے راستہ سے سامنے آگئے اوراس شمع ہدایت کو خاموش کرنے کے لئے ہر ممکنہ کوشش کر تے رہے لیکن اپنی بے جاکوششوں میں ناامیدی وناکامی کے علاوہ کچھ نہیں پایا۔ اوائل بعثت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ولید نامی ایک ادیب اور فصاحت وبلاغت کے ماہر کے پاس لے گئے ۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سورئہ "حم سجدہ"کی چند آیتوں کی تلاوت فرمائی ۔ولید اپنے تکبر وغرورکے باوجودبڑی سنجیدگی سے سن رہا تھا ،یہاں تک کہ آنحضرت ﷺ نے اس آیہء شریفہ کی تلاوت فرمائی :

(فان اعرضوافقل انذر تکم صٰعقة مثل صٰعقة عاد وثمود)

(فصلت۱۳)

"پھر اگر یہ اعراض کریں تو کہدیجئے کہ ہم نے تم کو ویسی ہی بجلی کے عذاب سے ڈرایا ہے جیسی قوم عاد وثمود پر نازل ہوئی تھی ۔"

جوں ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیہ شریفہ کی تلاوت کی ، ولید کی حالت بگڑ گئی ، اس کا بدن کانپنے لگا، اس کے ہوش اڑ گئے ، محفل درہم برہم ہو گئی ، اور لوگ متفرق ہو گئے۔

اس کے بعد، کچھ لوگ ولید کے پاس آئے اور اس سے شکوہ کیا اور کہا کہ تم نے ہمیں محمد ﷺ کے سامنے رسوا کر کے رکھدیا !اس نے جواب میں کہا :خدا کی قسم ہر گز نہیں !تم لوگ جانتے ہو کہ میں کسی سے نہیں ڈرتا ہوں اور کوئی لالچ بھی نہیں رکھتا ہوں اور تم لوگ جانتے ہو کہ میں سخن شناس ہوں ، جو باتیں میں نے محمد ﷺ سے سنیں ان میں لوگوں کی باتوں کی شباہت نہیں پائی جاتی ، یہ دلفریب اور دلکش کلام تھا ، نہ اسے شعر کہہ سکتے ہیں اور نہ نثر ، با معنی اور عمیق کلام ہے ۔ اگر میں اس کلام کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کرنے پر مجبور ہی ہونتو مجھے تین دن کی مہلت دیں تا کہ میں اس پر غور کر سکوں ۔جب تین دن گزرنے کے بعد اس کے پاس گئے تو ولید نے کہا : محمد ﷺ کا کلام سحر وجادو ہے جو دلوں کو اپنا فریفتہ بنا لیتا ہے۔

مشرکین ولید کی راہنمائی پر قرآن مجید کو سحر وجادو کا نام دیکر اس کو سننے سے پرہیز کرتے تھے اور لوگوں کو بھی اسے سننے سے منع کرتے تھے ، بعض اوقات جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد الحرام میں قرآن مجید کی تلاوت فرماتے تھے ، تو کفار شور مچا تے اور تالیاں بجاتے تھے تاکہ دوسرے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز سن نہ سکیں۔

اس کے باوجود کہ وہ لوگ قرآن مجید کے فصیح اور دلکش بیان کے عاشق ہوئے تھے ، اکثر و بیشتر آرام سے نہیں بیٹھتے تھے اور رات کی تاریکی سے استفادہ کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کی دیوار کے پیچھے جمع ہو کر قرآن مجید کی تلاوت کو سنتے تھے ، پھر سرگوشی میں ایک دوسرے سے کہتے تھے :اس کلام کو مخلوق کا کلام نہیں کہا جا سکتا ہے!خدائے متعال اس مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

(نحن اعلم بما یستمعون به اذ یستمعون الیک واذ هم نجوی اذ یقول الظٰلمون ان تتّبعون الا رجلا مسحوراً)

(اسراء ٤٧)

"ہم خوب جانتے ہیں کہ یہ لوگ آپ کی طرف کان لگا کر سنتے ہیں تو کیا سنتے ہیں اور جب یہ باہم رازداری کی بات کرتے ہیں تو ہم اسے بھی جانتے ہیں، یہ ظالم آپس میں کہتے ہیں تم لوگ ایک جادو زدہ انسان کی پیروی کر رہے ہو۔"

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ، بعض اوقات کعبہ کے نزدیک لوگوں کو قرآن مجید کی تلاوت کی طرف دعوت دیتے تھے ، عرب کے سخنور جب آپ ﷺ کے نزدیک سے گزرتے تھے تو جھک کر گزرتے تھے۔تاکہ دیکھے اور پہچانے نہ جائیں ، چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے:

(الا انھم یثنون صدورھم لیستخفوامنہ) ۔(ہود۵)

"ترجمہ کا خلاصہ :وہ اپنے آپ کو پیغمبر ﷺ سے چھپانے کے لئے جھک جاتے ہیں ۔"

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تہمتیں کفار ومشرکین نے نہ صرف قرآن مجید کو سحر وجادو کہا ،بلکہ وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری دعوت کو ہی جادو کہتے تھے ۔جب بھی آپ ﷺ لوگوں کو راہ خدا کی دعوت دیتے تھے اور انھیں کچھ حقائق کی یاددہانی کراتے تھے یا کوئی وعظ ونصیحت فرماتے تھے تو کفار کہتے تھے :"جادو کر رہا ہے "جبکہ تمام حالات میں ،آپ ﷺ ان کے لئے ایسے مسائل کوواضح فرماتے تھے ،کہ وہ خداداد فطرت اور انسانی شعور سے ان کی حقیقت کو درک کرتے تھے اورآپ ﷺ انہیں سیدھا اور واضح راستہ دکھاتے تھے کہ انسانی معاشرے کی سعادت وکامیابی کو جادو نہیں کہا جاسکتا ہے۔

کیا یہ کہنا جادو ہے ؟کہ"اپنے ہاتھوں سے پتھر ولکڑی کے بنائے ہوئے بتوں کی پرستش نہ کرو اور اپنے فرزندوں کو انکی قربانی نہ کرو اور خرافات کی پیروی نہ کرو "اور کیا پسندیدہ اخلاق ،جیسے سچائی ، صحیح ،خیر خواہی ،انسان دوستی ، صلح وصفا،انصاف ، عدالت اور انسانی حقوق کے احترام کو جادو کہا جاسکتا ہے؟خدائے متعال اپنے کلام پاک میں اس مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے :

(۔۔۔ولئن قلت انکم مبعوثون من بعد الموت لیقولنّ الّذین کفروا انّ ھذاالّا سحر مبین) (ہود۷)

ترجمہ کا خلاصہ :"جب آپ کفار سے کہتے ہیں کہ :موت کے بعد دوبارہ زندہ ہو جاؤ گے تو کہتے ہیںکہ جادو کرتا ہے"۔

قرآن مجید کی مشرکین کو مناظرہ کی دعوت

کفارومشرکین کہ جن کے دلوں میں بت پرستی نے جڑ پکڑ لی تھی ،اسلام کی دعوت کو قبول کرنے اور حق وحقیقت کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے لئے ہر گز تیار نہیں تھے. لہذاپیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تردید کرتے ہوئے کہتے تھے :"یہ جھوٹا ہے اور جس قرآن کو خدا سے نسبت دیتا ہے ،یہ اس کا اپنا کلام ہے"

اس تہمت کو دور کرنے کے لئے قرآن مجید نے شدید رد عمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے عربوں کے میدان فصاحت وبلاغت کے ہراول دستے کو مقابلہ کی دعوت دیتے ہوئے ان سے چاہا کہ اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ان لوگوں کا شک و شبہہ صحیح ہے اور وہ سچ کہتے ہیں توقرآن مجید کے کلام کے مانند کلام لے آئیں اور اس طرح اسلام کی دعوت کے بے بنیاد ہونے کو ثابت کریں چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے :

(ام یقولونَ تقّوله بل لا یو منون*فلیاّ توا بحدیث مثله ان کانوا صادقین) (طور۳۳،۳٤)

"یا یہ کہتے ہیں کہ نبی نے قرآن گڑھ لیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں اگر یہ اپنی بات وتّمیں سچے ہیں تو یہ بھی ایسا ہی کوئی کام لے آئیں ۔"

(ام یقولون افترٰیہ قل فتوا بسورةٍ مثلہ وادعوا من استطعتم من دون اللہ ان کنتم صٰدقین) (یونس ۳۸)

"کیا یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسے پیغمبر نے گڑھ لیا ہے تو کہدیجئے کہ تم اس کے جیسا ایک ہی سورہ لے آئو اورخدا کے علاوہ جسے چاہو اپنی مدد کے لئے بلا لو اگر تم الزام میں سچے ہو ۔"

کفار ومشرکین عرب ،جو سخنوری کے استاد اور ملک فصاحت و بلاغت کے فرمانروا تھے ، سخنوری میں اس تکبر وغرور کے باوجود اس دعوت کو قبول کرنے سے پہلو تہی کرتے ہوئے مقابلہ سے چشم پوشی کی اور کلام کے مقابلہ کو خونین مقابلہ میں تبدیل کرنے پر مجبور ہوئے یعنی ان کے لئے رسوائی اور مقابلہ کی نسبت قتل ہونا زیادہ آسان تھا ۔

عرب سخنور قرآن مجید کا جواب لانے سے عاجز ہوئے ،نہ صرف نزول قرآن کے زمانے میں زندگی گزارنے والے ،بلکہ جو نزول قرآن کے زمانے کے بعد پیدا ہوئے وہ بھی اس کا کوئی جواب نہ لا سکے اور مقابلے کے بعد شکست کھا کر پیچھے ہٹ گئے ۔انسان کی فطرت ہمیشہ اس چیز کی طرف مائل ہوئی ہے کہ اس سے کوئی شاہکار یا ہنر ظاہر ہو جائے اور لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرے ،اگرچہ یہ کارنامہ مکہ بازی اور رسی کھینچنے کے مانند معاشرہ میں براہ راست اثر بھی نہ رکھتا ہو ،پھر بھی لوگوں کی ایک جماعت اس کی جیسی مثال یا اس سے بہتر مثال پیش کرنے اور اس کا مقابلہ کرنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے بھی گھات میں کچھ لوگ ہمیشہ رہے ہیں کہ اگر اس آسمانی کتاب سے مقابلہ کرنے کی فرصت مل جائے تو اس سے گریز نہ کریں گے ۔

یہ لوگ مقابلہ سے عاجز آچکے تھے اور سحر و جادو کو بہانہ بنا کر یہ نہیں کہہ سکے کہ قرآن مجید جادو ہے ، کیونکہ جادو ایک ایسا عمل ہے جو خاصیت کے مطابق حق کو باطل اور باطل کو حق ظاہر کرتا ہے ،جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کے روپ میں پیش کرتا ہے اور اگر قرآن مجید اپنے زیبا لحن اور فصیح نظم سے دلوں کو جذب کرتا ہے تو یہ اس کی فطری خاصیت کی زیبائی ہے اور علم جادو سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے. اگر لفظ کے ذریعہ کچھ مقاصد کی طرف دعوت دیتا ہے اور کچھ معارف کے بارے میں لوگوں کو یاددہانی کراتا ہے کہ انسانی شعور اور خداداد فطرت سے ان کی حقیقت کو سمجھ سکیں اور لوگوں کو کچھ رفتار وکردار کا جیسے :حق شناسی ،نیک نیتی ،عدل وانصاف اور انسان دوستی کو قبول کرنے پر مجبور کرے تو ان کی تعریف کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے ۔

چونکہ قرآن مجید، حقیقت کو بیان کرنے کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے ، اس لئے یہ لوگ عاجز ہو کر یہ بھی نہ کہہ سکے ہیں کہ قرآن مجید کلام بشر سے مافوق ہے اس لئے کہ زیبائی، دلکشی ،بلاغت اور کشش میں بے نظیر ہے اور یہ اس کے کلام خدا ہونے کی دلیل نہیں بن سکتی ہے ۔

دوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے کہ ہر ایک صفت یامہارت ، جیسے جرئت ، شجاعت، پڑھنا اور لکھنا وغیرہ جو قابل ترقی ہے ، لا محالہ تاریخ بشریت میں ان میں سے ایک غیر معمولی ذہنیت والا مقابلہ میں جیت کر اول آتا ہے ،کیا حرج ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عربی بول چال کے اس مقابلہ میں کامیاب قرار پا کر فصاحت وبلاغت میں اول آئیں ،اس صورت میں آپ ﷺ کا کلام باوجود اس کے کہ کلام بشر ہے نا قابل مناقشہ ہوگا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہم عصر سخن وروں نے یہ بات نہیں کہی اور نہ ہی قرآن مجید کے حریفوں میں سے کوئی شخص یہ کہہ سکا اورثابت کر سکا ،کیونکہ ہر صفت یا مہارت جو کسی غیر معمولی ہنر مند کے ذریعہ ترقی کے کمال تک پہنچتی ہے ،کچھ بھی آخر کار یہ ایک ایسا امر ہے جو انسان کی قابلیت اور استعداد سے وجود میں آتا ہے اور فطرت بشر کا نتیجہ ہے ،لہذا یہ کام دوسروں کے لئے ممکن ہے کہ اس غیر معمولی ذہین شخص کے نقش قدم پر چل کر ضروری سعی و کوشش کے ذریعہ اسی غیر معمولی ذہین انسان کی طرح ایک کارنامہ انجام دیں اگرچہ کسی بھی جہت سے اس سے بہتر نہ ہو۔

اس حالت میں مذکورہ غیر معمولی شخص ،جو راستہ کھولنے والا پہلا شخص ہے ،صرف پیشوااور پیش رو ہو سکتا ہے ،مثلا سخاوت میں حاتم طائی سے بلند کوئی شخص نہیں ہو سکتا ہے ،لیکن اس کے جیسا کام انجام دیا جاسکتا ہے ،خوشنویسی میں میر کے برابر اور نقاشی میں مانی کے مقام تک نہیں پہنچ سکتے ہیں ،لیکن مناسب کوشش اور جستجو کے نتیجہ میں میر کے نہج پر ایک کلمہ لکھا جاسکتا ہے یا مانی کے اسلوب پر نقاشی کا ایک چھوٹا سا نمونہ بنایا جاسکتا ہے۔

اس عام قانون کی بناپر، اگر قرآن مجید فصیح و بلیغ ترین انسانی کلام (نہ کلام خدا) ہوتا تو دوسروں کے لئے خاص کر دنیا کے نامور سخن وروں کے لئے ممکن تھا کہ اسی اسلوب کا تجربہ کر کے ، ایک کتاب یا کم ازکم قرآن مجید کے سوروں کے مانند ایک سورہ کو بنا تے ۔

قرآن مجید نے مقابلہ کے مرحلہ میں لوگوں سے اپنے جیسے کلام کا تقاضا کیا ہے نہ کہ اس سے بہتر کا:

(فليا توا بحديث مثله) (طور٣٤)

(فاتوا بسورة مثله) (یونس٣٨)

(فاتوا بعشرسور مثله مفتريٰت) (ہود١٣)

(لا ياتون بمثله ولو كان بعضهم لبعض ظهيرا) (اسراء٨٨)

قرآن مجید کی تعلیمات

قرآن مجید ۲۳ سال کے عرصہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے دوران تدریجاً نازل ہوا اور انسانی معاشرہ کی ضرورتوں کا حل پیش کیا۔

قرآن مجید، ایک ایسی کتاب ہے کہ خود اس کے بیانات کے مطابق لوگوں کی سعادت کی طرف رہنمائی کے علاوہ اس کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ صحیح اعتقاد، پسندیدہ اخلاق اور شائستہ عمل، جو انسان کے انفرادی و اجتماعی سعادت کی بنیادیں ہیں، کی فصیح زبان میں تعلیم دیتا ہے:

۔(ونزّلنا علیک الکتٰب تبیَۤاناً لکلّ شی ئ) ۔(نحل۸۹)

"اور ہم نے آپ پر کتاب نازل کیا ہے جس میں ہر شے کی وضاحت موجود ہے"

قرآن مجید نے اسلامی معارف کو خلاصہ کے طور پر بیان کیا ہے۔ ان معارف کی تفصیلات خاص کر فقہی مسائل کی وضاحت کے لئے، لوگوں کو خانہ نبوت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی طرف ہدایت کرتا ہے چنانچہ فرماتا ہے:

(وانزلنا الیک الذّکر لتبیّن للنّاس مانزّل الیھم) ۔(نحل ٤٤)

"اور آپ کی طرف بھی ذکر کو (قرآن) نازل کیا ہے تاکہ ان کے لئے ان احکام کو واضح کردیں جو ان کی طرف نازل کئے گئے ہیں..."

(وماانزلناعلیک الکتب الاّ لتبیّن لھم الذی اختلفوا فیہ) ۔

(نحل٦٤)

"اور ہم نے آپ پر کتاب صرف اس لئے نازل کی ہے کہ آپ ان مسائل کی وضاحت کردیں جن میں یہ اختلاف کئے ہوئے ہیں "

جان لیجئے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کتاب خدا کی تفسیر اوردین کے معارف کی وضاحت کے لئے اپنے اہل بیت علیہم السلام کے کلام کو اپنے کلام کے مانند قرار دیتے ہوئے فرمایا:

"قرآن مجید اور میرے اہل بیت قیامت کے دن تک ایک دوسرے سے جدا نہیں ہونگے اور جو بھی شخص قرآن مجید سے استفادہ کرنا چاہتا ہے، اسے میرے اہل بیت کے دامن کو پکڑنا چاہئے۔"[(1)]

قرآن مجید کی نظر میں علم وجہل

قرآن مجید میں علم ودانش کی جو تعریف اور غور و حوض کی جو تشویق کی گئی ہے، وہ کسی اور آسمانی کتاب میں پائی نہیں جاتی ۔اسی طرح جہل ونادانی کی جو سرزنش کی گئی ہے وہ بھی قرآن مجید کے خصوصیات میں سے ہے ۔قرآن مجید نے علم ودانش کو زندگی اور جہل ونادانی کو موت سے تعبیر کیا ہے۔اور اسلام سے قبل فساد سے بھرے ماحول کو (جاہلیت) کا ماحول کہا ہے چنانچہ فرماتا ہے:

(هل يستوى الّذين يعلمون والّذين لا يعلمون)

(زمر۹)

"کیا وہ لوگ جو جانتے ہیں ان کے برابر ہو جائیں گے جو نہیں جانتے ؟"

(او من کان میتا فاحیینہ وجعلنا لہ نورا یمشی بہ فی الناس کمن مثلہ فی الظّلمات لیس بخارج منہا۔ (انعام ۱۲۲)

"جو شخص مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کیا اوراس کے لئے ایک نور قراردیاجس کے سہارے وہ لوگوں کے درمیان چلتا ہے اس کی مثال اس شخص کی سی ہو سکتی ہے جوتاریکیوں میں ہواوران سے نکل بھی نہ سکتا ہو"۔

۔(فانها لا تعمى الابصار ولكن تعمى القلوب التى فى الصدور) (حج ٤٦)

"...در حقیقت آنکھیں اندھی نہیں ہوتی ہیں بلکہ وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں کے اندر پائے جاتے ہیں"

(لهم قلوب لا يفقهون بها و لهم اعين لا يبصرون بها ولهم آذان لا يسمعون) ۔..)(اعراف ۱۷۹)

"...ان کے پاس دل ہیں مگر سمجھتے نہیں ہیں اورآنکھیں ہیں دیکھتے نہیں ہیں اور کان ہیں سنتے نہیں ہیں ۔یہ چوپایوں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں..."

(ومايستوى الاعمى والبصير* ولا الظلمات ولا النور* ولا الظل ولاالحرور* ومايستوى الاحياء ولا الاموات) .

(فاطر ۱۹۔۲۲)

"اور اندھے اور بینا برابر نہیں ہو سکتے اورتاریکیاں اور نوردونوں برابر نہیں ہو سکتے اور سایہ اوردھوپ دونوں برمر نہیں ہو سکتے اورزندہ اور مردے برابر نہیں ہو سکتے..."

خدائے متعال اپنے کلام پاک کی بہت سی آیتوں میں ،انسان کو غوروفکر، اورتدبر کی ترغیب اور تشویق فرماتا ہے اور اپنے بندوں کو حکم دیتا ہے کہ آسمانوں ،زمین اور ان میں موجود گوناگون مخلوق کی خلقت کے بارے میں غورو فکر کریں ، بالخصوص انسان کی خلقت کے بارے میں غور و فکر سے کام لیںگزشتہ ملتوں اور امتوں کی تاریخ ،آثار ،رسومات ،عادات اور طور طریقوں،جو حقیقت میں مختلف علوم وفنون انسانی ہیں ،مطالعہ کی تاکید کرتا ہے اور ان مطالعات کے ذریعہ اپنی حقیقی سعادت حاصل کریں۔اور جان

لینا چاہیئے کہ فنی نظریات اور علمی مسائل کی چھان بین کرنا اس دنیا کی چند روزہ محدود زندگی کی فلاح وبہبود کے لئے نہیں ہے بلکہ علمی مطالعات کی بنیاد پر جاودانی حیات کی سعادت وآسائش حاصل کرنے ہونا چاہیئے۔

خالق کائنات کے بارے میں قرآن مجید کی تعلیم

(...(افی اللہ شکّ فاطر السّموات والارض) ۔(ابراہیم ۱۰)

"کیا تمھیں اللہ کے بارے میں شک ہے جو زمین وآسمان کا پیدا کرنے والا ہے....؟"

وضاحت

دن کے اجالے میں تمام چیزیں آنکھوں کے سامنے نمایاں ہوتی ہیں، ہم اپنے آپ کو، گھر، شہر، بیابان، پہاڑ، جنگل اور دریا کو دیکھتے ہیں۔ لیکن جب رات کا اندھیرا چھاجاتا ہے تو تمام وہ چیزیں جو روشن و نمایاں تھیں، اپنی روشنی کو کھو دیتی ہیں، ہم اس وقت سمجھتے ہیں کہ ان کی وہ روشنی اپنی نہیں تھی بلکہ سورج سے مربوط تھی کہ وہ ایک قسم کے رابطہ کی وجہ سے انھیں روشن کئے ہوئے تھا۔ سورج بذات خود روشن ہے اور اپنے نور سے زمین اور اس میں موجود تمام چیزوں کو روشن اورنمایاں کرتا ہے۔ اگر ان اشیاء کی روشنی اپنی ہوتی تو ہرگز اسے کھو نہیں دیتیں۔

انسان اور دیگر تمام زندہ حیوانات اپنی آنکھوں، کانوں او ردیگر حواس سے اشیاء کو درک کرتے ہیں اورہاتھ، پاؤں اور تمام اندرونی و بیرونی اعضاء سے سرگرمی انجام دیتے ہیں، لیکن وہ بھی ایک مدت کے بعد حس و حرکت کو کھو کرکسی قسم کی سرگرمی انجام نہیں دے پاتے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے کہ وہ مرجاتے ہیں۔

ہم اس چیز کا مشاہدہ کرنے کے بعد فیصلہ کرتے ہیں کہ ان جانداروں سے ظاہر ہونے والا شعور، ارادہ اور تحرک، ان کے جسم و بدن سے نہیںہے، بلکہ ان کی روح وجان سے ہے کہ جس کے نکل جانے کے بعد اپنی زندگی اور تحرک کو کھودیتے ہیں۔

اگر دیکھنے او رسننے کا تعلق مثلا صرف آنکھ او رکان سے ہوتا، تو جب تک یہ دونوں عضو موجود ہوتے دیکھنا اور سننا بھی جاری رہنا چاہیئے تھا، جبکہ ایسا نہیں ہے۔

اسی طرح یہ عظیم کائنات کہ، جس کے اجزاء میں سے ہم بھی ایک جزو اور ایک وجودہیں ہرگز شک و شبہ نہیں کرسکتے، کہ یہ کائنات اورناقابل انکار خلقت، اگر خود سے ہوتی، تو ہرگز اسے کھونہ دیتی، جبکہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ اس کے اجزاء یکے بعد دیگرے اپنے وجود کو کھودیتے ہیں اورہمیشہ تغیر و تبدل کی حالت میں ہوتے ہیں، یعنی ایک حالت کو کھو کردوسری صورت اختیار کرتے ہیں۔

لہذا ہمیں قطعی فیصلہ کرنا چاہئے کہ تمام مخلوقات کی خلقت اور وجود کا سرچشمہ کوئی دوسری چیز ہے جو ان کا خالق اور پروردگار ہے اور جوں ہی خلقت کا رابطہ اس ذات سے ٹوٹ جاتا ہے تو وہ نیستی و نابودی کے دریا میں غرق ہو جاتی ہے۔

قرآن مجید کا احترام

معارف و احکام کا خزانہ اسلام کی آسمانی کتاب "قرآن مجید" ہے، جسے خدائے متعال نے وحی کے ذریعہ اپنے پیغمبر ﷺ پر نازل فرمایا ہے۔

قرآن مجید دنیا کے مسلمانوں کی مادی و معنوی زندگی کا نہایت گرانقدر پشتپناہ ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و سلم نے امت کو بارہا اس کتاب کی اسی عنوان سے تاکید کیا ور مکرر طور پر (خاص کر اپنی زندگی کے آخری ایام میں) لوگوں سے فرمایا ہے:

"میں اپنے بعد دو گراں بہا چیزیں تم لوگوں میں چھوڑ رہا ہوں جو قیامت تک ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گی، جب تک تم ان دونوں سے متمسک رہوگے، ہر گز گمراہ نہیں ہوگے، ان میں سے ایک قرآن مجید ہے اور دوسری میری عترت (اہل بیت) ہیں، جو قرآن مجید کو بیان کرنے والے ہیں"۔

قرآن مجید کے تقدس اور احترام کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ:

۱۔ کلام خدا ہے۔

۲۔ پیغمبر ﷺ کی قطعی اور زندہ سند ہے۔

۳۔ اسلام کے بنیادی قانون کا حامل ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم فرماتے ہیں:" قرآن مجید سے جدا نہ ہونا، کیونکہ اس میں آپ کے اسلاف مستقبل میں آپ کے آنے والوں کے حالات موجود ہیں اور آپ لوگوں کے درمیان عدل و انصاف سے حکومت کرتا ہے۔"

راہ خدا میں جہاد او رفداکاری کے متعلق قرآن کا دستور

اجتماعی طریقے، ایک پھل دار درخت کے مانند ہیں، جسے شگوفہ دینے، پھلنے اور پھولنے کے لئے ایک مناسب زمین میں لگا نا چاہئے، پھر اس کی آبیاری کرنی چاہئے تاکہ زمین میں اسکی جڑیں مضبوط و مستحکم ہو جائیں، اور اس کے بعد وہ نشو و نما پائے اور اس میں مناسب موسم میں، شگوفے نکلیں اور پھل آئیں۔

اسلام کا یہ درخت سو فیصدی اجتماعی دین ہے، اس کے مکمل موثر ہونے کے لئے مندرجہ ذیل مراحل کا طے کرنا ضروری ہے:

۱۔ لوگ اسے قبول کریں۔

۲۔ تربیت کے ذریعہ ، اس کی حفاظت کی جائے تاکہ اپنی زندگی کو جاری رکھ سکے۔

۳۔ اس کے قوانین کی عملی مخالفت کی روک تھام کی جائے، اور حوادث کے گزند سے ان کی حفاظت کی جائے تا کہ اپنے آثار و فوائد کو انسانی معاشرہ میں پھیلاسکیں۔

بحث کا خاتمہ

بحث کے اختتام پر یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید نے صرف فصاحت و بلاغت کی دلکشی سے ہی دوسروں کو عاجز نہیں کیا ہے، بلکہ اس لحاظ سے بھی عاجز کیا ہے، کہ اس میں انسان کی تمام ضرورتوں کا حقیقی حل موجود ہے اور غیبی خبروں کے اعتبار سے بھی کہ جن کی اس نے پیشنگوئی کی ہے اور کچھ حقائق بیان بھی کئے ہیں اور دیگر جہات سے بھی جو اس آسمانی کتاب میں پائے جاتے ہیں، قرآن مجید چلینج کرتے ہوئے اعلان کرتا ہے کہ اس کی مثال پیش نہیں کرسکتے ہو۔

۱۔ حقاق الحق،ج۹،ص۳۰۹۔۳۷۵۔

۳۔ معاد یا قیامت

"معاد" ، دین مقدس اسلام کے تین اصولوں میں سے ایک اصول ہے اور اس مقدس دین کی ضروریات میں سے ہے۔

قرآن مجید کی سیکڑوں آیات اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام کی ہزاروں روایتیں پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہیں کہ خدائے متعال اپنے تمام بندوں کو موت کے بعد ایک معین دن کو پھر سے زندہ کرے گا اور ان کا اعمال کا حساب لے گا۔ پھر نیک کام انجام دینے والوں کو ابدی نعمت و لذت سے نوازے گا او ربدکرداروں کو ان کے کیفر کردار تک پہنچا کر ابدی عذاب میں مبتلا کرے گا۔

خدائے متعال قرآن مجید میں فرماتا ہے کہ تمام گذشتہ پیغمبروں نے، معاد اور روز قیامت کے بارے میں لوگوں کو یاددہانی کرائی ہے۔

دوسرے آسمانی ادیان بھی دین اسلام کے مانند، معاد کو ثابت کرتے ہیں، اس کے علاوہ آثار قدیمہ کے توسط سے ہزاروں سال پر انی قبروں کی کھدائی سے ایسے آثار و علائم ہاتھ آرہے ہیں، جن سے معلوم ہوتاہے کہ پہلا اور ما قبل تاریخ کے بشر بھی انسان کے لئے موت کے بعد ایک قسم کی زندگی کا قائل تھا، اوریہاں سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے انسان اپنی سادہ سوچ سے بھی نیک انسانوں کے لئے جزا اور بدکاروں کے لئے سزا کا قائل ہے اور اس کے لئے ایک معین دن کو جانتے ہیں، چونکہ ایسادن اس دنیا میں موجود نہیں ہے ، اس لئے اس کا دوسری دنیا میں ہونا ضروری ہے ۔

ادیان و ملل کی نظر میں معاد

تمام وہ مذاہب، جو خدا کی پرستش کی دعوت دیتے ہیںاور انسان کونیک کام انجام دینے کا حکم اور بدکاری سے روکتے ہیں، وہ موت کے بعد معاد اور دوسری زندگی کے قائل ہیں، کیونکہ وہ ہرگز معین نہیں کرتے ہیں کہ نیک کام کی اس وقت قدر وقیمت ہوگی جب نیکی کی جزا ہوگی اور چونکہ یہ جزا اس دنیا میں دیکھی نہیں جاسکتی ہے، اس لئے مرنے کے بعد دوسری دنیا او رایک دوسری زندگی میں اس کا ہونا ضروری ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس دن کو کہ جسے قیامت کا دن کہا ہے، پوری وضاحت سے ثابت کیا ہے اور اس کی ناقابل انکار حالت میں تعارف کراتاہے۔ اس پر اعتقاد کودین کے تین اصولوں میں سے ایک شمار کرتاہے اور قرآن مجید میں اسی مطلب کو سابقہ پیغمبروں کی دعوت سے نقل کرتاہے۔

اس کے علاوہ، آثار قدیمہ کے کشف ہوئے بہت سے مقبروں سے کچھ ایسے آثار و علامتیں پائی گئی ہیں، جو اس چیز پر دلالت کرتی ہیں کہ قدیم انسان موت کے بعد دوسری زندگی پر ایما ن رکھتا تھا او راپنے عقائد کے مطابق کچھ فرائض انجام دیتا تھا تاکہ لوگ اس دنیا میں آرام و آسائش حاصل کریں۔

قرآن مجید کی نظر میں معاد

قرآن مجید نے سیکڑوں آیات میں معاد سے لوگوں کو آگاہ کیا ہے، اور اس کے بارے میں ہر قسم کے شک و شبہہ کی نفی کی ہے بصیرت کی افزائش اور عدم امکان کودور کرنے کے لئے اور اشیاء کی اولین خلقت اور خدا کی قدرت مطلقہ کے بارے میں بہت سے مواقع پر لوگوں کو یاددہانی کراتے ہوئے فرماتا ہے:

(اولم یر الانسان انا خلقناه من نطفة فاذا هو خصیم مبینٌ و ضرب لنا مثلاونسی خلقه قال من یحی العظام و هی رمیمٌ قل یحییها الذی انشأها اوّل مرّة و هو بکل خلقٍ علیم) (یٰسین۷۷۔۷۹)

"تو کیا انسان نے یہ نہیں دیکھا کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا ہے اور وہ یکبارگی ہمارا کھلا ہوا دشمن ہوگیا ہے اور ہمارے لئے مثل بیان کرتا ہے اور اپنی خلقت کو بھول گیا ہے، کہتا ہے کہ ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرسکتا ہے؟ آپ کہدیجئے کہ جس نے پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے وہی زندہ بھی کرے گا اور وہ ہر مخلوق کا بہتر جاننے والا ہے"

اور کبھی جاڑے میں مردہ ہوجانے والی زمین کو بہار میں زندہ کرکے لوگوںکے انکار کو خدا کی قدرت کی طرف متوجہ کیا ہے، چنانچہ فرماتا ہے:

(ومن آیاته انک تری الارض خٰشعة فاذا انزلنا علیها الماء اهتزّت وربت انّ الذی احیاهالمح الموتی انه علی کل شی ء قدیر) (فصلت۳۹)

"اور اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ تم زمین کو صاف اور مردہ دیکھ رہے ہو اور پھر جب ہم نے پانی برسادیا تو زمین لہلہا نے لگی اور اس میں نشو و نما پیدا ہوگئی، بیشک جس نے زمین کو زندہ کیا ہے وہی مردوں کا زندہ کرنے والا بھی ہے اور یقینا وہ ہر شے پر قادر ہے"

اور کبھی عقلی استدلال سے سامنے آکر انسان کی خدا داد فطرت کو اس حقیقت کے اعتراف پر ابھارا ہے، چنانچہ فرماتا ہے:

(و ما خلقنا السماء و الارض و ما بینهما باطلاً ذلک ظنّ الذین کفروا فویل للّذین کفروا من النّارٌ ام نجعل الذین آمنوا و عملوا الصٰلحت کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجّار) (ص۲۷۔۲۸)

"اور ہم نے آسمان اور زمین او ر ان کے درمیان کی مخلوقات کو بیکار نہیں پیدا کیا ہے (کیونکہ اگر مقصد یہی ہوتا کہ مثلاً انسان پیدا ہوتا اور چند دن گھومنے کے بعد سوتا اور مرجاتا اور اس طرح دوسرا انسان آتا اور اس سلسلہ کی تکرار ہوتی تو کائنات کی خلقت بیہودہ اور ایک کھلونے سے زیادہ نہ ہوتی ، جبکہ بیہودہ کام خدا سے کبھی انجام نہیں پاتاہے) یہ تو صرف کافروں کا خیال ہے اور کافروں کے لئے جہنم میں ویل کی منزل ہے کیا ہم ایمان لانے والے اور نیک عمل کرنے والوں کو زمین میں فساد برپا کرنے والوں جیسا قرار دیدیں یا صاحبان تقوی کو فاسق و فاجر افراد جیسا قرار دیدیں ۔ (کیونکہ اس دنیا میں اچھا اور برا کام انجام دینے والے اپنے اعمال کی مکمل جزا نہیں پاسکتے، اگر دوسری دنیا نہ ہوتی، کہ جہاں ان دونوں گروہوں کو ان کی رفتار و کردار کے مطابق واقعی سزا ملتی تو وہ دونوں گروہ خدا کے نزدیک یکساں ہوتے اور یہ عدل الٰہی کے خلاف ہے)۔

موت سے قیامت تک

بدن مرتا ہے نہ کہ روح

اسلام کی نظر میں ، انسان ،روح وبدن سے تشکیل پائی ہوئی ایک مخلوق ہے۔انسان کا جسم بھی بذات خود مادہ اورمادہ سے مربوط قوانین کی ترکیبات میں سے ایک ہے ،یعنی اس کے لئے حجم اور وزن ہے۔اس کی زندگی ایک زمان و مکان میں ہے ،سردی ، گرمی وغیرہ سے متاثر ہوتا ہے اور تدریجاً بوڑھا اور کمزور ہوتا ہے اور ایک دن خدائے متعال کے حکم سے پیدا ہوا تھا ،آخرکار ایک دن تجزیہ ہو کر نابود ہو جاتا ہے۔

لیکن روح،مادی نہیں ہے اور مادہ کی مذکورہ خاصیتوں میں سے کوئی ایک اس میں نہیں پائی جاتی ہے،بلکہ علم ،احساس،فکر اور ارادہ کی صفت کے علاوہ دوسری معنوی صفات جیسے: محبت ،کینہ ،خوشی غم ،اور امید وغیرہ اس سے مخصوص ہیں ۔اورچونکہ روح میں مادہ کی مذکورہ خصوصتیں نہیں پائی جاتیں۔ لہذا معنوی خاصیتیں بھی مادی خاصیتوں سے الگ ہیں ،بلکہ دل ودماغ اور بدن کے دوسرے تمام اجزاء اپنی بے شمار سرگرمیوں میں روح اور معنوی صفات کے تابع ہو تے ہیں ،اوربدن کے اجزاء میں سے کسی ایک کو فرمانروا کا مرکز قرار نہیں دیا جاسکتا ۔خدائے متعال فرماتا ہے :

(ولقد خلقنا الا نسٰن من سلٰلةٍ من طینٍ٭ ثم جعلناہ نطفة فی قرار مکین٭ ثم خلقنا النطفة علقة فخلقنا العلقة مضغة فخلقنا المضغة عظٰما فکسونا العظٰم لحماً ثم انشأنہ خلقا آخر...) (مؤمنون١٢۔١٤)

"اور ہم نے انسان کو گیلی مٹی سے پیدا کیا ہے پھر اسے ایک محفوظ جگہ پر نطفہ بنا کر رکھا ہے .پھر نطفہ کو علقہ بنایا ہے اور پھر علقہ سے مضغہ پیدا کیا ہے اور پھر مضغہ سے ہڈیاں پیدا کی ہیں اور پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا ہے ،پھر ہم نے اسے ایک دوسری مخلوق بنادیا ہے..."

اسلام کی نظر میں موت کے معنی

مذکورہ اصل کے مطابق اسلام کی نظر میں موت کا معنی یہ نہیں ہے کہ انسان نابود ہوتا ہے ،بلکہ یہ ہے کہ انسان کی روح لافانی ہے ،بدن سے اسکا رابطہ منقطع ہوجاتا ہے ، نتیجہ میں بدن نابود ہو جاتا ہے اور روح بدن کے بغیر اپنی زندگی کو جاری رکھتی ہے ۔خدائے متعال فرماتا ہے :

(وقالوأ اذا ضللنافی الارض أَئِ نّا لفی خلق جدید بل هم بلقاء ربهم کافرون*قل یتوّٰفکم ملک الموت الذی وُکِّل بکم) ...)(سجدہ۱۰۔۱۱)

"اور کہتے ہیں کہ اگر ہم زمین میں گم ہو گئے (مر گئے)تو کیا نئی خلقت میں پھر ظاہر کئے جائیں گے ۔بات یہ ہے کہ یہ اپنے پرور دگار کی ملاقات کے منکر ہیں ۔آپ کہدیجئے کہ تم کو وہ ملک الموت زندگی کی آخری منزل تک پہنچائے گا جو تم پر تعینات کیا گیا ہے۔"

برزخ

اسلام کا نظریہ ہے کہ انسان،مرنے کے بعد ایک خاص طریقے سے زندہ رہتا ہے۔ اگر اس نے نیکی کی ہو تو اسے نعمت وسعادت ملتی ہے اور اگر برا تھا تو عذاب میں ہو گا ،اور جب قیامت برپا ہوگی تو اسے عام حساب وکتاب کے لئے حاضر کیا جائے گا۔ جہاں پر انسان مرنے کے بعد قیامت تک زندگی کرتا ہے اسے"عالم برزخ"کہتے ہیں ۔اس سلسلہ میں خدائے متعال فرماتا ہے:

(...(ومن ورآئهم برزخ الی یوم یبعثون) (مؤمنون ۱۰۰)

"...اور ان کے پیچھے ایک عالم برزخ ہے جو قیامت کے دن تک قائم رہنے والا ہے"

(ولا تحسبنَّ الذین قتلوا فی سبیل الله امواتا بل احیاء عند ربهم یرز قون) (آل عمران ۱۶۹)

"اور خبر دار راہ خدا میں قتل ہونے والوں کومردہ خیال نہ کرنا وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے یہاں رزق پا رہے ہیں ۔"

قیامت یقینی ہے

ہر انسان (بلا استثنا) اپنی خداداد فطرت سے، اچھائی اوربرائی کام میں فرق کو محسوس کرتا ہے اور نیک کام کو (اگرچہ اس پر عمل نہ کرتا ہو) اچھا اور لازم العمل جانتا ہے اور برے کام کو(اگرچہ اس میں پھنسا بھی ہو) برا اورلازم الاجتناب جانتا ہے ۔اس میں کسی قسم کا شک و شبہہ نہیںہے کہ اچھائی اور برائی ، نیکی اور بدی ان دونوں صفتوں میں موجود سزا اور جزا کی جہت سے ہے اور اس میں کوئی شک و شبہہ نہیں ہے کہ اس دنیا میں کوئی ایسادن نہیں ہے جس میں اچھے اور برے انسانوں کوان کی اچھائی اور برائی کی سزا اور جزا دی جائے، کیونکہ ہم اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں کہ بہت سے نیک انسان اپنی زندگی انتہائی تلخی اور سختی میں گزارتے ہیں اور بہت سے برے انسان جو گناہ اور ظلم و ستم میں آلودہ ہیں لیکن پھر بھی خوشی اورآرام وآسائش میں زندگی گزارتے ہیں ۔

اس بناپر، کہ اگر انسان کے لئے اپنے مستقبل میں اور اس دنیا کے علاو دوسری دنیا میں ایک ایسا دن نہ ہوکہ جس میں اس کے نیک اور برے اعمال کا حساب کر کے اسے مناسب سزا و جزا دی جائے ، یہ نظریہ (نیک کام اچھا اور واجب الاطاعت ہے اور برا کام برا اور واجب الاجتناب ہے)انسان کی فطرت میں قرار پایا ہے ۔

یہ تصور نہیں کیا جانا چاہئے کہ نیک کام کرنے والوں کی جزاجسے انسان اچھا سمجھتا ہے۔ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ معاشرہ کے انتظامات بر قرار ہوتے ہیں اور نیک لوگ زندگی کی سعادت حاصل کرتے ہیں اور نتیجہ میں اس منافع کا ایک حصہ خودنیکی کرنے والے کو ملتا ہے اوراسی طرح بدکار اپنے نا مناسب کردار سے، معاشرہ کو درہم برہم کردیتا ہے اوراسکا نا مناسب کام آخرکار خود اس کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے، کیونکہ یہ تصور اگرچہ سماج کے پسماندہ اور مفلس طبقہ کے لوگوں میں کسی حدتک پایا جاتاہے. لیکن جو لوگ اپنی قدرت کے عروج پرپہنچے ہیں اور معاشرہ کا انتظام وخلل ان کی خوشبختی اور کامیابی میں موثر نہیں ہے، بلکہ معاشرہ میں جس قدرافراتفری اورفساد ہو اور لوگوں کے حالات بدتر ہوںتووہ زیادہ خوشحال اور کامیاب ہوتے ہیں اور کوئی دلیل نہیں ہے کہ ان افراد کی فطرت نیک کام کو نیک اوربرے کام کو برا جانے! یہ بھی تصور نہیں کرنا چاہئے کہ یہ لوگ اگرچہ اپنی چند روزہ زندگی میں کامیاب رہے ہوں، لیکن کسی وجہ سے ان کا نام ہمیشہ کے لئے عام طورپر آنے والی نسلوں کی نظروں میں ننگ و عار سمجھاجائے گا، کیونکہ ان کے نام کا ننگ وعار کی صورت میں ظاہر ہونا اور لوگوں کا ان کے بارے میں خیال رکھنا اس وقت ہوگا، جب وہ مرچکے ہوں گے اور اس ننگ و عار کا ان کی اس دنیا میں گئے خوشحال او رلذت اندوز زندگی پر کسی قسم کا اثر نہیں پڑے گا۔

اس صورت میں کوئی دلیل نہیں ہوگی کہ انسان نیک کام کو اچھا جان کر اسے انجام دے اور برے کام کو براجان کراس سے پرہیز کرے، اور اس طرح مذکورہ نظریہ کا قائل ہو۔ اگر معاد کا وجود نہ ہو تو یہ اعتقاد قطعا ایک خرافائی اعتقاد ہوگا۔

لہذا ہمیں خالق کائنات کی طرف سے ہماری فطرت میں ودیعت کئے گئے اس مقدس اور مستحکم اعتقاد سے یہ سمجھنا چاہئے کہ معاد کا ہونا ضروری ہے اور انسان کے لئے ضرور ایک دن ایسا آئے گا، جس دن اسے خالق کائنات کے حضور اس کی رفتار و کردار کے حساب و کتاب کے لئے پیش کیا جائے گا جہاں پر اسے نیک کاموں کی جزا او ربرے کاموں کی سزادی جائے گی۔

٤۔عدل

خدائے متعال، عادل اوردادرس ہے،کیونکہ "عدل"صفات کمالیہ میں سے ایک ہے ،اور خدائے متعال تمام صفات کمالیہ کا مالک ہے ۔اس کے علاوہ خدائے متعال اپنے کلام پاک میں عدل کی بار بار تعریف اور ظلم و ستم کی مذمّت کرتا ہے ،اور لوگوں کو عدل کا حکم دیتاہے اور ظلم سے روکتا ہے ۔یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ جس چیز کوبرا سمجھتاہو وہ خود اس میں پائی جاتی ہواور جس چیز کو نیک اور خوبصورت سمجھتا ہو وہ اس میں موجود نہ ہو! سورہ ٔنساء میں فرماتا ہے:

(انّ اللہ لا یظلم مثقال ذرَّة) ...)(نسائ٤٠)

" خدائے متعال ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا"

نیزسورئہ کہف میں فرماتاہے:

(...(ولا یظلم ربّک احد) (کہف٤٩)

"تیرا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرتا ہے"

اسی طرح سورئہ نساء میں فرماتا ہے:

(ما اصابَکَ من حسنة فمن اللہ و ما اصابَکَ من سیّئة فمِن نَّفسک) ...)(نسائ٧٩)

"تم تک جو بھی اچھائی اور کامیابی پہنچی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو بھی برائی پہنچی ہے وہ خود تمہاری طرف سے ہے ۔"

سورئہ سجدہ میں فرماتا ہے:

(الّذی احسن کل شی ء خلقه) ...)(سجدہ١)

"اس نے ہرچیز کو حسن کے ساتھ بنایاہے۔"

اس بناپر،ہر مخلوق اپنی جگہ پر انتہائی حسن کے ساتھ خلق کی گئی ہے ۔بعض مخلوقات میں جو بدصورتی ،نا مناسب یا عیب ونقص پایا جاتا ہے ،وہ موازنہ اور نسبت کی وجہ سے پیش آتا ہے ۔مثلا سانپ اور بچھو کا وجود ہماری نسبت بد اورنا مناسب ہے اور کانٹے کو جب پھول سے موازنہ کیا جاتاہے تو کانٹازیبا نہیںہوتا، لیکن یہ سب اپنی جگہ پر حیرت انگیز مخلوق اور سراپا خوبصورت ہیں ۔دوسرے الفاظ میں ،یہ کہا جائے کہ تمام اشیاء اپنے وجوداور وجود کی بقا میں جس جس چیز کی محتاج ہین اور ان میں سے جو عیب پایاجاتا ہے ،وہ انھیں خود رفع نہیں کر سکتیں اور وہ اتفاقی طورپر اور خودبخودبھی رفع نہیں ہوسکتا۔بلکہ یہ سب عالم مشہود سے مافوق ایک مقام کی طرف سے فراہم کئے جاتے ہیں ۔

وہی ہے جو ہر حاجت اور عیب کو دور کرتا ہے ، البتہ خودہر حاجت و عیب سے پاک و منزہ ہے ورنہ دوسرے مبداء کی ضرورت پڑے گی جو اس کے عیب و نقص کودور کرے اور اس صورت میں وہ خود بھی عالم کے ضرورت مندوں میں سے ایک قرار پائے گا ۔

وہی ہے ،جو اپنی لامتنا ہی قدرت اور علم سے کائنات کی ہر مخلوق کو وجود بخشتا ہے کائنات اور کائنات میں موجودہ ہر شی کو تکامل کی شاہراہ پر ناقابل استثناء قوانین کے ذریعہ مقصد اور کمال کی منزل کی طرف راہنمائی کرتا ہے اس بیان سے یہ نتیجہ نکلتے ہیں :

۱ ۔خدائے متعال کائنات میں ، مطلق سلطنت کا مالک ہے اور ہر مخلوق جووجود میں آتی ہے اور ہر واقعہ جو رونما ہوتا ہے ، ان کا سرچشمہ اس کا حکم وفرمان ہے ۔چنانچہ فرماتا ہے :

(...(له الملک و له الحمد) ...) (تغابن ۱)

"مطلق سلطنت اوربادشاہی اسی سے مخصوص ہے اور حقیقت میں ہر ستائش کا وہی سزاوار ہے کیونکہ نیکی اور اچھائی اسکی خلقت سے پیدا ہوئی ہے "

(...(اِنِ الحکم الاّ لله) ...) (یوسف ۴۰)

"حقیقت میں ہر حکم خدائے متعال کی طرف سے ہے"

۲ ۔خدائے متعال عادل ہے ،کیونکہ عدالت حکم میں یا اس کے جاری ہونے کی صورت میں یہ ہے کہ اس میں استثنا اور امتیاز نہیں ہے ۔ یعنی جو مواقع حکم سے مربوط ہیںوہ ،یکساں ثابت ہوں اور جو مواقع قابل نفاذہیں وہ یکساں نافذکئے جائیں ۔چنانچہ معلوم ہوا کہ کائنات اور اس میں موجودچیزوں کا نظم و نسق کچھ ناقابل استثنا قوانین کے سایہ میں ہیں ۔جن کا مجموعہ قانون علیت و معلو لیت ہے ۔ چل رہا ہے ۔ مثلاً آگ کچھ خاص شرائط کے ساتھ ، ایک جلنے والی چیز کو جلائے گی ، خواہ یہ کالا کوئلہ ہو یا ہیرا ، خشک لکڑی ہو یا ایک ضرورت مند مفلس کا لباس ۔

اس کے علاوہ جس نے عدالت کو نظرانداز کیا،وہ اپنی کچھ ضرورتوں کوپورا کرنے کیلئے ظلم و ستم کو انجام دیتا ہے ۔ خواہ یہ ضرورت مادی ہو جیسے کوئی شخص دوسرے کے مال کو لوٹ لیتا ہے اور اپنے انبار میں اضافہ کرتا ہے ،یا معنوی ضرورت ہو جیسے کوئی شخص دوسروں کے حقوق پر تجاوز کر کے یا قدرت اثرورسوخ اور تسلّط کا اظہار کر کے لذت محسوس کرتا ہے ۔

چنانچہ یہ معلوم ہوا کہ ،خالق کائنات کی ذات اقدس کے بارے میں کسی قسم کی حاجت قابل تصور نہیں ہے اورجو بھی حکم اس کے منبع جلال سے جاری ہوتا ہے، اگر ایک تکوینی حکم ہے تو وہ عام مصلحتوں کوپورا کرنے کے لئے ہے کہ خلقت کے لئے جس کی مراعات ضروری ہے اور اگر ایک تشریعی حکم ہے تو وہ اس کے بندوں کی سعادت اور خوشبختی کے لئے ہے اور اس کا نفع انہی کو ملتا ہے ۔خدائے متعال اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے :

(انّ الله لایظلم مثقال ذرةٍ) ...)(نسائ٤٠)

"خدائے متعال ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا ہے"

(...(وما الله یرید ظلماً للعباد) (غافر٣١)

"خدائے متعال اپنے بندونپر ظلم کرنا نہیں چاہتا ہے ۔"

٥۔امامت اور امت کی رہبری

اسلامی معاشرہ کے دینی اور دینوی امور کی سرپرستی کو"امامت" کہتے ہیں۔امامت دین اسلام کے مقدس اصولوں میں سے ایک مسلم اصول ہے ۔جن آیات میں خدائے متعال نے اپنے دین کی تشکیل کو بیان کیا ہے ، ان میں اس مطلب کی بھی وضاحت کی ہے ۔

"امامت"کا مقصد لوگوں کی دنیا میں دین کی رہبری کرنا ہے اورپیشوا شخص کو "امام"کہتے ہیں۔

شیعوں کاعقیدہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد خدائے متعال کی طرف سے ایک امام معین ہونا چاہیئے تاکہ وہ معارف اوردینی احکام کا محافظ ونگہبان ہو اور حق کی طرف لوگوں کی راہنمائی کرے ۔

جب ایک ملک میں ایک حکومت تشکیل پاتی ہے اور وہ لوگوں کے عمومی کام کا نظم و نسق ہے ، تو وہ کام خودبخود انجام نہیں پاتا ،بلکہ اگر کچھ شائستہ افراد اور ماہر لوگ اس کی حفاظت کی کوشش نہ کریں تونظام باقی ہی نہ رہے اور لوگوں کو اپنے فوائد سے بہرہ مند بھی نہ کرسکے۔۔انسانی معاشرہ میں جو بھی ادارہ وجود میں آتا ہے ، جیسے ثقافتی اور مختلف اقتصادی ادارے ،وہ بھی یہی حکم رکھتے ہیں اورہرگز قابل وشائستہ مدیروں سے بے نیاز نہیں ہیں ورنہ بہت ہی کم مدت میں نابود ہو جائیں ۔یہ ایک واضح حقیقت ہے ،جسے سادہ لوح انسان بھی سمجھتا ہے اور بہت سے تجربوں اورآزمائشوں سے بھی اس کے صحیح ہونے کی گواہی ملتی ہے ۔

بیشک دین اسلام کا نظام بھی یہی حکم رکھتا ہے کہ جس کے بارے میں جرأت کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کا سب سے بڑانظام ہے اور وہ اپنی بقااور حفاظت میں بھی مدیروں کا محتاج ہے اور ہمیشہ شائستہ افراد کو چاہتا ہے تاکہ وہ اس کے قوانین اور معارف کو لوگوں تک پہنچائیں اور اس کے دقیق ضوابط اور قوانین کواسلامی معاشرہ میں نافذکریں اور ان کی رعایت اور حفاظت میں کسی قسم کی غفلت ولاپروائی نہ کریں ۔

دوسرے اعتبار سے، یہ کہ ہم نے نبوت کی دلیل میں ذکرکیا ہے ،کہ خلقت کے مقاصدمیں سے ایک مقصد لوگوں کی سیدھے راستہ پرہدایت کرنا ہے ۔جس طرح خدائے متعال نے اپنی تمام مخلوقات کی ضرورتوں کوپورا کیا ہے اور ان کی ترقی کے وسائل کو

ان کے اختیار میں دیدیا ہے ، اس طرح اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان کے صحیح عقائےد،پسندیدہ اخلاق اور نیک کامونکی ضرورتوں کوپور کرنے کے لئے انبیاء کو بھیجے تا کہ وہ اس کے پیغام کو لوگوں تک پہنچائیں۔

اسی دلیل کی بنا پر ، خدائے مہربان کو چاہیئے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ لیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد دین کی حفاظت اور لوگوں کی ہدایت کے لئے امام اورپیشوا معین کرے اور لوگوں کوان کی مرضی پر نہ چھوڑے ،جو اکثراوقات ہواوہوس سے مغلوب ہوتی ہے ۔جس طرح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لوگوں کی ضرورتوں اور انسان کی انفرادی و اجتماعی بیماریونکے علاج سے آگاہ کیا اور ان کو ہر طرح کے سہو ونسان سے محفوظ رکھا ،اسی طرح ضروری ہے کہ امام اور ایک دینی پیشواکو بھی علم و عصمت عطا کرے ۔اس عقلی دلیل سے واضح ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد لوگوں کی ہدایت ،دین کے تحفظ او راسلام کے قوانین کو نافذ کرنے کیلئے خدا کی طرف سے امام معین ہو ۔

امام کی ضرورت پر ایک نقلی دلیل

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مختلف طریقوں سے روایت کی گئی ہے کہ امت اسلامیہ کے لئے آپ ﷺ کی رحلت کے بعد بعض پیشوا اورامام ہیں جو آپ کے جانشین ہوں گے ۔ایک معروف روایت ،جسے شیعہ وسنی راویوں نے نقل کیا ہے ،آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

"امام بارہ افراد ہونگے اور سب کے سب قریش سے ہونگے "۔[(1)]

ایک اور مشہورروایت میں آنحضرت ﷺ نے جابر انصاری سے فرمایا:

"امام بارہ افراد ہیں"[(2)]

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ایک کرکے ان کے نام بتائے اور جابر سے فرمایا:

"تم اماموں میں سے پانچویں امام کو درک کروگے ، ان کو میرا سلام کہنا "[(3)]

اس کے علاوہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت امیرالمؤ منین علی علیہ السلام کو (خصوصاً)اپنے جانشین کے طور پر تعیین فرمایا ہے،آپ نے بھی اپنے بعدوالے امام کا تعارف کرایا ،اسی طرح ہر امام نے اپنے بعد والے امام کا تعارف کرایا ۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جب سے تاریخ بشریت کا آغاز ہوا اور انسانیت کے خاندان میں اجتماعی زندگی بڑھتی گئی ،تو دنیا کے اطراف واکناف میں ،چھوٹے یا بڑے ،ترقی یافتہ یا غیر ترقی یافتہ معاشرے وجود میں آتے گئے ، لیکن حاکم اور سرپرست کے بغیر کوئی معاشرہ زیادہ دنوں تک باقی نہ رہ سکا ۔جہاں پر بھی کوئی معاشرہ تشکیل پایا اس میں ایک حاکم اور سرپرست قہر و غلبہ یا انتخاب

کے ذریعہ ہوا کرتا تھا، یہاں تک کہ چھوٹے اور چند افراد پر مشتمل خاندانوں میں بھی یہی طریقہ رائج تھا۔ بیشک یہاںپر انسان اپنی خداداد فطرت سے سمجھتا ہے کہ ہر معاشرہ کے لئے ایک سرپرست کی ضرورت ہے۔ خدائے متعال فرماتا ہے:

(فاقم وجهک لِلدّیِن حنیفاً فطرت الله الّتی فطر النّاس علیها لا تبدیل لخلق الله ذلک الدِّینِ القیِّم ...) (روم ۳۰)

"آپ اپنے رخ کو دین کی طرف رکھیں اور باطل سے کنارہ کش رہیں کہ یہ دین وہ فطرت الہی ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اور خلقت الہٰی میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی ہے۔ یقینا یہی سیدھا اور مستحکم دین ہے"

پروردگار عالم، اس آیہ شریفہ میں اپنے دین کو دین فطرت سے تعبیر کرتا ہے اور بیان فرماتا ہے کہ اس مقدس دین کے احکام ان چیزوں کے مطابق ہیں کہ جن کو انسان اپنی خالص فطرت سے سمجھتا ہے۔

خدائے متعال، اس آیہ شریفہ میں، انسان کے تمام فطری ادراکات اور اس کی خالص فطرت کے فیصلوں کو معتبر قرار دیتا ہے اور ان کی تائید کرتا ہے ان فطری فیصلوں میں سے ایک معاشرہ کی سرپرستی اور اسکی باگ ڈور سنبھالنا ہے۔

ولایت کے بارے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بیان

خدائے متعال اپنے پیغمبر اکرم ﷺ کی توصیف میں فرماتا ہے:

(لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیزعلیه ما عنتّم حریص علیکم بالمئومنین رؤف رّحیم) (توبہ ۱۲۸)

"یقینا تمہارے پاس وہ پیغمبر آیا ہے جو تمھیںمیں سے ہے اور اس پر تمہاری ہر مصیبت شاق ہوتی ہے وہ تمہاری ہدایت کے بارے میں حرص رکھتا ہے اور مومنین کے حال پر شفیق اور مہربان ہے"

اس بات پر ہرگز یقین نہیں کیا جاسکتا ہے کہ وہ پیغمبر ﷺ جو قرآن مجید کی نص کے مطابق اپنی امت پر تمام لوگوں سے زیادہ ہمدردومہربان تھا، وہ احکام الہیٰ میں سے ایک حکم کے بارے میں اپنی پوری عمر خاموش رہے، اور اس کے بیان سے چشم پوشی کرے جو اسلامی معاشرہ میں بلا شک و شبہ پہلے درجہ کی اہمیت کا حاصل ہو اور عقل سلیم اور فطرت کے مطابق ہو۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام لوگوں سے بہتر جانتے تھے کہ اسلام کا تشکیل پایا ہوا یہ وسیع نظام (جو دنیا کے وسیع ترین نظاموں میں سے ہے) صرف دس بیس سال تک کے لئے نہیں ہے کہ اس کی سرپرستی کو آپ خود کریں، بلکہ یہ نظام عالم بشریت کو ہمیشہ چلانے والا ہے۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے بعد ہزاروں سال تک کے حالات کے بارے میں دور اندیشی فرماتے تھے، اور اس سلسلہ میں ضروری احکام جاری فرماتے تھے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جانتے تھے کہ دین، ایک اجتماعی نظام ہے اور کوئی بھی اجتماعی نظام حاکم اور سرپرست کے بغیر ایک گھنٹہ کے لئے بھی زندہ باقی نہیں رہ سکتا۔

اس بنا پر، سرپرستی ضروری ہے تاکہ دین کے معارف اور قوانین کی حفاظت کی جائے اور معاشرہ کے نظام کو چلایا جا سکے اور لوگوں کی دنیا وآخرت کی سعادت کی طرف رہنمائی ورہبری کی جائے ۔ لہذا کیسے ممکن ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی رحلت کے بعد آنے والے کل کو بھول جائیں یا اس کے بارے میں کوئی دلچسپی نہ رکھیں؟

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کبھی جنگ یاحج کے لئے صرف کچھ دنوں کے لئے مدینہ سے باہر تشریف لے جاتے تھے ،تو لوگوں کے امور کو چلانے کے لئے کسی نہ کسی کو اپنا جانشین مقرر فرماتے تھے اوراسی طرح مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوئے شہروں کے لئے گورنر مقرر فرماتے تھے اور جنگ پر روانہ ہونے والے فوجی لشکر یا گروہ کے لئے کمانڈر اورامیر مقرر فرماتے تھے اور کبھی اس حدتک فرماتے تھے کہ:"تم لوگوں کا امیر فلاں شخص ہے اگر وہ ماراگیا تو فلاں شخص ہوگا "۔پیغمبر اکرم ﷺ کی اس روش کے باوجود کیسے یقین کیا جاسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے سفر آخرت کے موقع پر اپنی جگہ پر کسی کو معیّن نہیں کیا ہوگا ؟

مختصر یہ کہ جو بھی شخص گہری نگاہ سے اسلام کے بلند مقاصد اور ان کولانے والے عظیم الشان پیغمبر کے مقصد پر نظر ڈالے ،توکسی شک وشبہہ کے بغیر تصدیق کرے گا کہ مسلمانوں کے لئے ولایت وامامت کا مسئلہ حل شدہ اور واضح ہو چکا ہے ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ جانشین کا تقرر

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بعد مسلمانوں کے امور کی سرپرستی اور مسئلہ ولایت کے سلسلہ میں صرف سربستہ بیانات پرہی اکتفا نہیں فرمایا بلکہ پہلے ہی دن سے توحید ونبوت کی دعوت کے ساتھ ساتھ مسئلہ ولایت کو بھی واضح طورپر بیان فرمایا اور دین ودنیا کے تمام امور میں حضرت علی علیہ السلام کی سرپرستی اور جانشینی کو تمام مسلمانوں میں اعلان فرمایا۔

جیسا کہ بیان ہوا، اس روایت کے مطابق جسے شیعہ وسنی راویوں نے نقل کیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب پہلے دن اعلانیہ دعوت دینے پر مامور ہوئے۔توآپ ﷺ نے اپنے رشتہ داروں کو دعوت دی اورانھیں ایک جگہ پر جمع کیا اوراس محفل میں حضرت علی علیہ السلام کے وزیر، وصی اور خلّیفہ ہونے کوآشکار طورپر ثابت اور مستحکم فرمایا اوراسی طرح اپنی زندگی کے آخری ایام میں غدیر خم کے مقام پر ایک لاکھ بیس ہزار کے ایک عظیم مجمع میں حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھ کو پکڑ کر بلند کرکے فرمایا :

"من کنت مولاہ فھذاعلی مولاہ"

"جس جس کا میں مولا ہوں، اس کے یہ علی بھی مولا ہیں "

امامت کی ضرورت پر ایک دلیل

چنانچہ نبوت کی بحث میں واضح ہوا کہ خالق کائنات کا اپنی مخلوق پر عنایت وتوجہ کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی مخلوقات میں سے ہر مخلوق کی معین مقصد (جو کمال کے درجہ تک پہنچنا ہے) کی طرف رہنمائی کرے مثال کے طور پر پھل دار درخت کی رشد، نمو، کونپلیں کھلنے اور پھل دینے کی طرف راہنمائی کی جائے اور اسکی زندگی کا طریقہ ایک پرندہ کی زندگی کے طریقہ سے جدا ہے۔اس طرح ایک پرندہ بھی اپنی زندگی خاص راستہ کو طے کرتا ہے اور اپنے خاص مقصد کے پیچھے جاتا ہے، نہ کہ درخت کے راستہ اور مقصد کے پیچھے، اسی طرح ہر مخلوق کی اپنی منزل مقصود تک پہنچنے اور مناسب راستہ کو طے کرنے کے علاوہ کسی اور چیز کی طرف راہنمائی نہیں کی جاتی اور معلوم ہے کہ انسان بھی خدا کی ایک مخلوق ہونے کے ناطے ہدایت کے اس کلی قانون میں شامل ہے۔

واضح ہوا کہ انسان کی زندگی کی سعادت چونکہ خود اس کے اختیار اور ارادہ سے حاصل ہوتی ہے، لہذا ہدایت الٰہی اور، دعوت وتبلیغ بھی انبیاء اور دین کو بھیجنے کے ذریعہ ہونی چاہئے تاکہ خدائے متعال پر انسان کی کوئی حجت باقی نہ رہے۔ذیل کی آیت اسی معنیٰ پر دلالت کرتی ہے:

(رسلاً مّبشِّرین ومنذرین لئلاّیکون للناس علی اللہ حجۃً بعد الرُّسّل) ۔۔۔)(نسائ ۱۶۵)

"یہ سارے رسول بشارت دینے والے اور ڈرانے والے اس لئے بھیجے گئے تاکہ رسولوں کے آنے کے بعد انسانوں کی حجت خدا پر قائم نہ ہونے پائے"

جو دلیل پیغمبرونکے بھیجنے اور دین کی دعوت کی برقراری کا تقاضا کرتی ہے وہی دلیل اس چیز کا بھی تقاضا کرتی ہے کہ، اپنی عصمت سے دین کی حفاظت اور لوگوں کی رہبری کرنے والے پیغمبر کی رحلت کے بعد، خدائے متعال کو چاہئے کہ اوصاف کمالی میں (وحی ونبوت کے علاوہ) آپ ﷺ کے مانند ایک شخص کو آپ ﷺ کا جانشین مقرر فرمائے تاکہ وہ دین کے معارف اور احکام کی کسی انحراف کے بغیر حفاظت کرے اور لوگوں کی رہنمائی کرے، ورنہ عام ہدایت کا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور خدائے متعال پر لوگوں کی حجت تمام ہوجائے گی۔

امام کی ضرورت

عقل میں چونکہ خطا و لغزش پائی جاتی ہے لہذا وہ لوگونکو خدا کے پیغمبروں سے بے نیاز نہیں کر سکتی، اسی طرح امت میں علمائے دین کی موجودگی اور انکی دینی تبلیغات، لوگوں کو امام کے وجود سے مستغنی نہیں کر سکتے، کیونکہ، جیسا کہ واضح ہوا کہ بحث اس میں نہیں ہے کہ لوگ دین کی پیروی کرتے ہیں یا نہیں، بلکہ بحث اس چیز میں ہے کہ خدا کا دین کسی قسم کی تحریف وتبدیلی یانابودی کے بغیر لوگوں تک پہنچ سکے۔معلوم ہے کہ علمائے امت کتنے بھی صالح اور متقی ہوں، لیکن خطا و گناہ سے محفوظ و معصوم نہیں ہیں

اور بعض معارف اوردینی قوانین کا ان سے پائمال ہونا یا تبدیل ہونا، اگرچہ عمداً نہ ہو، محال نہیں‌ہے ۔اس کی بہترین دلیل اسلام میں گوناگون مذاہب اوراختلافات کا وجود میں آنا ہے ۔

لہذا،ہر حالت میں امام کا وجودلازم اور ضروری ہےتاکہ دین خدا کے معارف اور اس کے حقیقی قوانین اس کے پاس محفوظ رہیں اور جب بھی لوگوں میں استعدادپیدا ہو جائے وہ ان کی رہنمائی سے استفادہ کر سکیں ۔

امام کی عصمت

مذکورہ بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ امام کو بھی پیغمبر کے مانند خطاو معصیت سے محفوظ ہونا چاہئے ،کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتو دین کی دعوت ناقص رہے گی اور الٰہی ہدایت اپنا اثر کھودے گی ۔

امام کے اخلاقی فضائل

امام میں شجاعت ،شہامت ، عفت ، سخاوت اور عدالت جیسی اخلاقی فضیلتیں موجود ہونی چاہئیں ،کیونکہ جو معصیت سے محفوظ ہے وہی تمام دینی قوانیں پر عمل کرتا ہے اور پسندیدہ اخلاق دین کی ضروریات میں سے ہیں اس لئے اس کو اخلاقی فضائل میں تمام لوگوں سے افضل ہونا چاہئے ،کیونکہ کسی کا اپنے سے برتر وبالاترکی رہبری کرنا بے معنی اور عدل الٰہی کے منافی ہے ۔

امام کا علم

چونکہ امام دین کا حامل اور تمام لوگوں کا پیشوا ہوتاہے ، لہذا ضروری ہے کہ وہ لوگوں کی دنیا وآخرت اور انسان کی سعادت سے متعلق تمام مسائل کا علم رکھتا ہو ،کیونکہ عقل کے مطابق جاہل کا پیشوا بننا جائز نہیں ہے اور عام الٰہی ہدایت کی روسے بھی یہ بے معنی ہے ۔

۱۔احمدبن حنبل،مسند،ج۵،ص۹۲۔

۲۔ینابیع المودہ ،باب ۷۷،ص۵۰۳۔

۳۔ینابیع المودہ،باب ۹٤،ص۵۵۳و۵۵٤۔

ائمہ ھدیٰ علیہم السلام

ائمہ ھدیٰ علیہم السلام، جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ ﷺ کے جانشین اور دین ودنیا کے پیشوا ہیں، بارہ ہیں ۔اس سلسلہ میں شیعہ وسنی دونوں نے پیغمبر اکرم ﷺ سے بے شمار روایتیں نقل کی ہیں اور ان ائمہ میں سے ہر ایک نے اپنے بعد آنے والے امام کو معین فرمایا ہے۔

ائمہ علیہم السلام کے اسمائے گرامی

۱۔حضرت امیر المؤمنین علی بن ابیطالب علیہ السلام

۲۔حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام

۳۔حضرت امام حسین سید الشہداء علیہ السلام

٤۔حضرت امام سجاد زین العابدین علیہ السلام

٥۔حضرت امام محمد باقر علیہ السلام

٦۔حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام

۷۔حضرت امام موسی کاظم علیہ السلام

۸۔حضرت امام علی رضا علیہ السلام

۹۔حضرت امام محمد تقی علیہ السلام

۱۰۔حضرت امام علی نقی علیہ السلام

۱۱۔حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام

۱۲۔حضرت امام عصر، حجۃ بن الحسن، عجل اللہ تعالی فرجہ الشریف

ائمۂ اطہار علیہم السلام کی عام سیرت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بارہ امام ۲٥۰ سال تک لوگوں کے درمیان تھے۔ لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے دن سے ہی ان کے مخالفین پیدا ہوئے اور ہر ممکن وسیلہ سے، خلافت کے عہدے کو غصب کرکے دین کے فطری راستہ کو منحرف کردیا اس کے علاوہ مذکورہ مخالفین کا گروہ ہر احتمالی خطرے کے مقابلہ میں اپنی حیثیت کو مستحکم کرنے

اوراپنی حکومت کی حفاظت میں ، اہل بیت پیغمبر اسلام کے نور کو ہر وسیلہ سے بجھانے کے در پے تھے ،ہر بہانہ سے ان پر دبائوڈالتے،جسمانی اذیتیں پہنچاتے ، حتیٰ یہاں تک کہ قتل کرنے کی کوششیںبھی کرتے تھے ۔اسی سبب سے ائمہ ھدی ، علیہم السلام عام اصلاحات کے سلسلہ میں کچھ نہیں کر سکتے تھے ، یا اسلامی معاشرہ میں اسلام کے معارف و قوانین اور سیرت پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وسیع پیمانے پر پھیلانے سے قاصر تھے ۔

یہاں تک کہ امیرالمئومنین حضرت علی علیہ السلام بھی اپنی ظاہری خلافت کے پانچ سال کے دوران ، اندورونی اختلافات اور طلحہ ، زبیر ، عائشہ اورمعاویہ جیسے دعویداروں اوردیگر بانفوذ صحابیوں کی رخنہ اندازیوں کی وجہ سے ان سے خونین جنگیں لڑتے رہے اوراپنے عالی مقاصداور اصلاحات تک دلخواہ صورت میں نہ پہنچ سکے ۔

یہی وجہ ہے کہ ائمہ ھدیٰ خدا کی طرف سے اپنی مسئولیت اورذمہ داری کے مطابق معاشرہ میں عمومی تعلیم وتربیت ، خاص افراد کی تعلیم وتربیت اور معاشرہ کی عمومی اصلاحات، جیسے(حتی الامکان) امر بالمعروف اورنہی عن المنکر کرنے پر اکتفا کی۔یعنی دین کے معارف وقوانین کو کھلم کھلا طورپر معاشرہ میں بیان کرنے اورزمام حکومت کو اپنے ہاتھ میں لیکر معاشرہ کو دین کی اعلی مصلحتوں کے مطابق چلانے کے بجائے بااستعداد اورخاص افراد کی تربیت پر اکتفا کرتے تھے کیونکہ اس کے علاوہ ان کے لئے ممکن ہی نہیں تھا ۔وہ لوگوں کی خاطر وقت کی حکومتوں کے سامنے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے قیام کیا کرتے تھے تاکہ اس طرح دین کو نابود ہونے سے بچالیں اورخدا کا نورانی دین ، تدریجی طورپر خاموشی کے ساتھ نورافشانی کرتا رہے اور آگے بڑھتا رہے اور ایک دن پھر سے پہلی حالت پیدا کرکے دنیا کواپنے نورسے منور کردے ۔

ائمہ ھدیٰ علیہم السلام میں سے ہر ایک کی زندگی کے حالات اور امامت کے زمانے میں ان کی روش کی تحقیقات سے یہ حقیقت مکمل طورپر واضح ہوجاتی ہے ۔

پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت علیہم السلام

عرف اورلغت میں "اہل بیت " اور مرد کا خاندان، مرد کے گھر کے چھوٹے معاشرے کے افرادکو کہا جاتا ہے،جن میں بیوی ،بیٹے،بیٹیاںاور نوکر شامل ہوتے ہیں جو مجموعی طورپر صاحب خانہ کے سائے میں زندگی بسر کرتے ہیں ۔

بعض اوقات"اہل بیت" کے معنی کو عمومیت دے کراس لفظ کو اپنے قریبی رشتہ داروں جیسے باپ ، ماں ، بھائی،بہن چچا ،پھوپھی ،ماموں ، خالہ اور ان کی اولاد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے ۔

لیکن قرآن مجید اور احادیث میں لفظ کلمہ"اہل بیت"سے مذکورہ دو عرفی و لغوی معنی میں سے کوئی بھی معنیٰ مراد نہیں ہے ۔کیونکہ شیعہ و سنی سے منقول متواتر احادیث کے مطابق "اہل بیت"ایک ایسا عطیہ ہے جو حضرت پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

،حضرت علی، حضرت فاطمہ زہرا، حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین علیہم السلام سے مخصوص ہے۔اس بنا پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل خانہ اور دوسرے رشتہ دار، اگرچہ عرف و لغت کے لحاظ سے اہل بیت شمار ہوتے ہیں، لیکن اس اصطلاح کے اعتبار سے اہل بیت نہیں ہیں، یہاں تک کہ حضرت خدیجہ کبریٰ سلام اللہ علیہا، جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سب سے زیادہ معزّز و محترم بیوی اور حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہاکی والدۂ گرامی تھیں اہل بیت میں شمار نہیں ہوتیں اور اسی طرح آنحضرت ﷺ کے صلبی بیٹے حضرت ابراہیم بھی "اہل بیت" کے اس زمرے میں شامل نہیں ہیں۔

لیکن ان روایتوں اور دیگر احادیث کی رو سے بارہ اماموںمیں سے دوسرے نو امام، جو فرزند امام حسین علیہ السلام کی اولاد اور آپ کی نسل میں ہیں، اہل بیت میں ہیں۔اس بناء پر اہل بیت چودہ معصومین علیہم السلام ہیں اور معمولا "اہل بیت پیغمبر" وہ تیرہ افراد ہیں جو پیغمبر کے بعد آپ ﷺ کی عترت کے طور پر مشہور ہیں۔

پیغمبر ﷺ کے اہل بیت علیہم السلام، اسلام میں بہت سے فضائل و مناقب اور نا قابل موازنہ مقامات کے مالک ہیں، کہ ان میں سے درج ذیل دو مقام سب سے اہم ہیں:

۱۔آیۂ شریفہ (...(انّما یرید اللہ لیذھب عنکم الرّجس اھل البیت ویطھّرکم تطھیراً) (احزاب ۳۳)

کی رو سے مقام عصمت وطہارت پر فائز تھے، اس مقام کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہرگز گناہ کے مرتکب نہیں ہو سکتے۔

۲۔حدیث ثقلین، جو متواتر حدیث ہے اور اس سے پہلے اسکی طرف اشارہ کیا گیا، کی رو سے، عترت ہمیشہ قرآن مجید کے ہمراہ ہیں اور ان میں کبھی جدائی پیدا نہیں ہو سکتی یعنی وہ قرآن مجید کے معنی اوردین مبین اسلام کے مقاصد کو سمجھنے میں کبھی خطا و لغزش سے دوچار نہیں ہوسکتے۔ان دو مقامات کا لازمہ یہ ہے کہ اسلام میں اہل بیت علیہم السلام کا قول وفعل حجت ہے (جیسا کہ شیعوں کا عقیدہ ہے)

اہل بیت علیہم السلام کی عام سیرت

اہل بیت علیہم السلام پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم وتربیت کے مکمل نمونہ ہیں اور ان کی سیرت بالکل پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت ہے۔

البتہ ۲۵۰ سال کا عرصہ (۱۱ھ یعنی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت سے، ۲۶۰ھ یعنی حضرت حجت عج کی غیبت تک) ائمہ ھدی علیہم السلام نے لوگوں کے ساتھ گزارا، اس مدت میں ان کی زندگی مختلف حالات اور مراحل سے گزری کہ جن میں ائمہ اطہارکی زندگی مختلف شکلوں میں ظاہر ہوئی، لیکن وہ اصلی مقصد، یعنی اصول دین وفروع دین کو انحرافات اور تبدیل ہونے سے بچایا اور حتی الامکان لوگوں کی تعلیم وتربیت سے دست بردار نہیںہوئے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ۲۳ سال کی تبلیغ کے دوران ، زندگی کے تین مراحل طے کیئے ۔ ابتدائی تین سال کے دوران مخفیانہ تبلیغ انجام دیتے تھے ، اس کے بعد دس سال تک کھلم کھلا تبلیغ میں مشغول رہے ، لیکن اس مدت کے دوران خود آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے پیرو انتہائی دبائو اور نہایت جسمانی اذیتوں میں زندگی گزارتے تھے اور ہر قسم کی عملی آزادی سے محروم تھے جو معاشرہ کی اصلاح میں اثر انداز ہوتی ہے ، اور اسکے بعد والے دس سال (جو ہجرت کے بعد میں ہیں)، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ایسے ماحول میں تھے کہ جس کا مقصد حق و حقیقت کو زندہ کرنا تھا، اور اسلام دن بہ دن فاتحانہ طورپر آگے بڑھ رہا تھا اور ہر لمحہ لوگوں کے لئے علم و کمال کا ایک نیا باب کھل رہا تھا ۔

البتہ واضح ہے کہ ان تین مختلف مراحل کے مختلف تقاضے تھے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کو۔جس کا مقصد حق و حقیقت کو زندہ کرنے کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ گوناگوں صورتوں میں ظاہر کرتے ہیں۔

ائمہ ھدیٰ کے زمانہ میں جو مختلف اور گوناگوں حالات رونما ہوئے ، وہ تقریباً پیغمبر اسلام ﷺ کی ہجرت سے پہلے تبلیغی زمانہ سے شباہت رکھتے ہیں ۔ کبھی ائمہ اطہار کے لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے پہلے تین سال کی طرح کسی بھی صورت میں اظہار حق ممکن نہیں تھا اور (وقت کے) امام بڑی احتیاط سے اپنا فریضہ انجام دیتے تھے،چنانچہ چوتھے امام کے زمانہ میں اور چھٹے امام کی آخری عمرمیں یہی حالت تھی ۔ کبھی ہجرت سے پہلے دس سال کے مانند، کہ جس مین پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ میں اعلانیہ طورپر دعوت دیتے تھے اور آپ ﷺ ہر طرف سے اپنے پیروئوں پر کفار کی اذیتوں کی وجہ سے پریشان تھے، امام بھی معارف دین کی تعلیم اوراحکام کی اشاعت میں مشغول ہو جاتے تھے، لیکن وقت کے حکام انھیں جسمانی اذیت وتکلیف پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہ رکھتے تھے اور ان کے لئے ہردن کوئی نہ کوئی مشکل ایجاد کرتے تھے۔

البتہ ،پیغمبر اکرم کی ہجرت کے بعد والے ماحول کے مانند جو زمانہ کسی حدتک ہے وہ امیرالمئومنین حضرت علی علیہ السلام کی خلافت ظاہری کے پانچ سال کا زمانہ ، حضرت فاطمہ زہرا سلام علیہا اور امام حسن علیہ السلام کی زندگی کا تھوڑا سا زمانہ اور امام حسین علیہ السلام اور آپ کے اصحاب کا مختصراورچند روزہ زمانہ تھا ، کہ جس میں حق و حقیقت اور کھلم کھلا طورپر ظاہر ہو رہی تھی اور صاف و شفاف آیئنہ کی طرح پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے جیسے حالات پیش کئے جارہے تھے ۔

خلاصہ یہ کہ ائمہ اطہار علیہم السلام ، مذکورہ مواقع کے علاوہ وقت کے حکمرانوں اور فرمانروائوں کی آشکارا طورپر بنیادی مخالفت نہیں کرسکتے تھے، اس لئے اپنی رفتار وگفتارمیں تقیہ کا طریقہ اپنانے پر مجبور تھے تاکہ وقت کے حکام کے ہاتھ کوئی بہانہ نہ آسکے ، اسکے باوجود ان کے دشمن گوناگوں بہانے بناکر ان کے نور کو خاموش کرنے اور ان کے آثار کو مٹانے میں کوئی دقیقہ فرو گزار نہیں کرتے تھے ۔

وقت کے حکّام کے ساتھ ائمہ اطہار کے اختلافات کا اصلی سبب

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے بعد اسلامی معاشرہ میں تشکیل پانے والی مختلف حکومتیں، کہ جو اسلامی حکومت کا لیبل لگائے ہوئے تھیں، وہ سب کی سب اہل بیت علیہم السلام سے بنیادی مخالفت رکھتی تھیں اور اس ختم نہ ہونے والی دشمنی کی ایک ایسی جڑ تھی جو کبھی خشک نہیں ہوتی تھی۔یہ سچ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اہل بیت علیہم السلام کے فضائل اور مناقب بیان فرمائے تھے کہ ان میں سے اہم ترین فضیلت معارف قرآن اور ان کا حلال و حرام کا جاننا تھا،جس کی وجہ سے ان کے مقام کا احترام اور تعظیم کرنا تمام امت پر واجب تھا، لیکن امت نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس نصیحت اور تاکید کا حق ادا نہ کیا۔

بیشک پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب پہلے دن دعوت دی تو سب سے پہلے اپنے رشتہ داروں کو اسلام کی دعوت دی اورحضرت علی علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر کیا اوراپنی زندگی کے آخری دنوں میں بھی غدیر خم میں اور دوسرے مقامات پر آپ کی جانشینی کا اعلان کیا۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد لوگوں نے دوسروں کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جانشین منتخب کیا اور اہل بیت علیہم السلام کو ان کے مسلم حق سے محروم کردیا، لہذا وقت کے حکام اہل بیت کو ہمیشہ اپنا خطرناک رقیب سمجھتے رہے اور ان سے خائف رہتے تھے،اور ان کا خاتمہ کرنے کے لئے گونا گوںامکانات اور وسائل سے استفادہ کرتے تھے۔

لیکن اہل بیت علیہم السلام اور اسلامی حکومتوں کے درمیان اختلافات کا سب سے بڑا سبب کچھ اور تھا اگرچہ حکومت اسلامی مسلۂ خلافت کے فروعات میں سے تھی۔

اہل بیت اطہار علیہم السلام امت اسلامیہ کے لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کی اطاعت کو ضروری سمجھتے تھے اور اسلامی حکومت کو اسلام کے آسمانی احکام کی رعایت، تحفظ اورنفاذ کے لئے ذمہ دار سمجھتے تھے، لیکن جو اسلامی حکومتیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد تشکیل پائیں،جیسا کہ ان کی کارکردگی سے ظاہر ہے،وہ اسلامی احکام کو مکمل طور پر نافذ کرنے کی رعایت اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کی اطاعت کرنے کی پابند نہیں تھیں۔

خدائے متعال اپنے کلام پاک میں کئی جگہوں پر،پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور اسی طرح امت کو آسمانی احکام میں تبدیلی ایجاد کرنے سے منع فرماتا ہے یہاں تک کہ دینی احکام اور قوانین میں چھوٹی سے چھوٹی خلاف ورزی کی تنبیہ فرماتا ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی انہی ناقابل تغییر احکام وقوانین کی روشنی میں، لوگوں کے درمیان ایک ایسی سیرت اختیار ہوئے تھے کہ دینی قوانین کو نافذ کرنے میں زمان ومکان اوراشخاص کے لحاظ سے کسی قسم کا فرق نہیں کرتے تھے۔آسمانی احکام کی رعایت

کرنا ہر ایک کے لئے یہاں تک کہ خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے واجب تھا اور یہ احکام ہر ایک کے حق میں لازم الاجرا تھے اور شریعت ہر حال میں اور ہر جگہ پر زندہ اور نافذ تھی ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی مساوات و عدالت کے نتیجہ میں لوگوں سے ہر قسم کے امتیاز و فرق کو ہٹایا تھا ۔ خود آنحضرت ﷺ جو خدا کے حکم سے واجب الاطاعت حاکم و فرمانروا تھے، اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں تمام لوگوں کی نسبت اپنے لئے کسی قسم کے امتیاز کے قائل نہیں تھے، عیش و عشرت سے پرہیز فرماتے تھے، اپنی حکومتی حیثیت میں کسی قسم کے تکلف سے کام نہیں لیتے تھے، اپنی حیثیت کی عظمت کو لوگوں کے سامنے ظاہر نہیں فرماتے تھے اور جاہ و حشم کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے اور آخر کار دوسروں سے ایک معمولی اور ظاہری امتیاز سے بھی پہچانے نہیں جاتے تھے ۔

لوگوں کے مختلف طبقات میں سے کوئی طبقہ امتیاز کے بل بوتے پر دوسروں پر فضیلت نہیں جتلاتا تھا، عورت و مرد، اونچے اور نچلے طبقہ کے لوگ، غنی و فقیر، قوی و کمزور، شہری و دیہاتی اور غلام و آزاد سب ایک صف میں تھے اور کوئی بھی اپنے دینی فرائض سے زیادہ کا پابند نہ تھا اور معاشرہ کے قوی لوگوں کے سامنے جھکنے اور ظالموں کے سامنے حقیر ہونے سے معاشرہ کا ہر فرد محفوظ تھا ۔

تھوڑا غور و فکر کرنے سے ہمارے لئے واضح ہو جاتا ہے (مخصوصاً پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد سے آج تک جو ہم نے اندازہ کیا ہے) کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنی سیرت سے صرف یہ مقصد تھا کہ اسلام کے آسمانی احکام لوگوں میں عادلانہ اور مساوی طور پر نافذ ہو جائیں اور اسلام کے قوانین انحراف اور تبدیل ہونے سے محفوظ رہیں، لیکن اسلامی حکومتوں نے اپنی سیرت کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت سے مطابق و ہم آہنگ نہیں کیا اور روش کو بدل دیا جس کے نتیجہ میں :

۱ ۔ اسلامی معاشرہ میں نہایت کم وقت کے اندر شدید ترین صورت میں طبقاتی اختلافات رونما ہوئے اور مسلمان طاقتور اور کمزور دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے اور اس طرح ایک گروہ کی جان و مال اور عزت دوسرے گروہ کے ہوا وہوس کا کھلونا بن گئی ۔

۲ ۔ اسلامی حکومتیں اسلامی قوانین میں تدریجی طور پر تبدیلیاں پیدا کرنے لگیں اور کبھی اسلامی معاشرہ کی رعایت کے نام پر اور کبھی حکومت اور حکومت کی سیاسی حیثیت کے تحفظ کے عنوان سے دینی احکام پر عمل کرنے اور اسلامی قوانین کے نفاذ سے پہلوتہی کی گئی ۔

یہ طریقہ دن بدن وسیع تر ہوتا گیا ۔ یہاں تک کہ اسلامی حکومت کے نام پر چلنے والے ادارے اسلامی قوانین کی رعایت اور انہیں نافذ کرنے میں کسی قسم کی ذمہ داری کا احساس نہیں کرتے تھے ۔ معلوم ہے جب عام قوانین و ضوابط کو نافذ کرنے والے افراد ہی مخلص نہ ہوں گے تو ان قوانین کا کیا حشر ہوگا!

خلاصہ اور نتیجہ

مذکورہ گفتگو سے معلوم ہوا کہ اہل بیت علیہم السلام کی معاصر اسلامی حکومتیں وقت کی مصلحتوں کے پیش نظر اسلامی قوانین میں تصرف کرتی تھیں اور ان ہی تصرفات کی وجہ سے ان کی سیرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت سے بالکل مختلف ہوتی تھی۔ لیکن اہل بیت علیہم السلام قرآن مجید کے حکم کے مطابق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کے احکام کو ہمیشہ کے لئے ضروری جانتے تھے۔

انہی اختلافات اور تضاد کے سبب وقت کی طاقتور حکومتوں نے اہل بیت علیہم السلام کا خاتمہ کرنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اور ان کے نور کو بجھانے کے لئے ہر ممکن وسیلہ سے استفادہ کرتے تھے۔

اہل بیت اطہار علیہم السلام بھی اپنی الہیٰ ذمہ داری کے مطابق، اپنے سخت اور منحوس دشمنوں کی طرف سے فراوان مشکلات سے دوچار ہونے کے باوجود، دین کے حقائق کی تبلیغ کر رہے تھے اور صالح افراد کو تعلیم دینے اور ان کی تربیت کرنے سے پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔

اس مطلب کو سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ ہم تاریخ کی طرف رجوع کریں اور حضرت علی علیہ السلام کی پانچ سالہ حکومت میں شیعوں کی اکثریت کو ملاحظہ کریں، کیونکہ تھوڑا غور کرنے سے ہم سمجھ لیں گے کہ، یہ اکثریت حضرت کی اسی ۲۵ سالہ گوشہ نشینی کے دوران وجود میں آئی۔ اسی طرح حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے گھر پر گروہ درگروہ آنے والے شیعہ تھے جو خاموشی کے ساتھ حضرت امام سجاد علیہ السلام کے تربیت یافتہ تھے، یہ حقائق کے ایسے خوشہ چین تھے کہ حضرت امام موسی ابن جعفر علیہ السلام حتی زندان کے ایک تاریک گوشہ میں بھی ان کی اشاعت فرماتے تھے۔

آخر کار اہل بیت علیہم السلام کی مسلسل تعلیم وتربیت کے نتیجہ میں، شیعہ جو پیغمبر اکرم کی رحلت کے وقت ایک معمولی تعداد میں تھے، ائمہ اطہار علیہم السلام کے آخری زمانے میں ایک بڑی تعداد میں تبدیل ہوئے۔

اہل بیت علیہم السلام کے کردار میں ایک استثنائی نکتہ

جیسا کہ بیان کیا گیا، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت علیہم السلام نے اپنی زندگی کا زمانہ مظلومیت اور محکومیت میں گزارا اور اپنی ذمہ داریوں کو تقیہ کے ماحول اور انتہائی سخت حالات میں انجام دیا۔ ان میں سے چار معصومین کی زندگی بہت کم مدت کے لئے نسبتاً آزادانہ اور بلا تقیہ نظر آتی ہے۔ لہذا ہم ان چار شخصیتوں، یعنی حضرت علی، حضرت فاطمہ اور حسنین علیہما اسلام کی تاریخ زندگی اور کردار کا اجمالی جائزہ پیش کرتے ہیں۔

اہل بیت علیہم السلام کے فضائل

شیعہ اور سنی راویوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اورآپ ﷺ کے اہل بیت کے مناقب میں ہزاروں احادیث نقل کی ہیں ہم یہاں پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت کے فضائل میں سے تین کو بیان کرتے ہیں کہ جن کے پہلے خود آنحضرت صلی‌اللہ‌علیہ‌وآلہ‌وسلم ہیں :

۱۔ ٦ ہجری میں ،شہر نجران کے نصرانیوں نے اپنے چند بزرگوں اوردانشوروں کو چن کر ایک وفد کی صورت میں مدینہ بھیجا ۔اس وفد نے پہلے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مناظرہ اورکٹ حجتی کی ، لیکن مغلوب ہوئے ، اور خدائے متعال کی طرف سے آیۂ مباہلہ نازل ہوئی :

(فمَن حاجَّک فیه من بعد ماجا ء ک من العلم فقل تعالَوا ندع ابنا ء نا وابنا ء کم ونساء نا ونساء کم وانفسنا و انفسکم ثم نبتهل فنجعل لعنت الله علی الکاذبین) (آل عمران ٦١)

"پیغمبر!علم کے آجانے کے بعدجو لوگ تم سے کٹ حجتی کریں ان سے کہدیجئے کہ آؤ ہم لوگ اپنے اپنے فرزند، اپنی اپنی عورتوں اور اپنے اپنے نفسوں کو بلائیں اورپھر خداکی بارگاہ میں دعاکریں اور جھوٹوں پرخداکی لعنت قراردیں ۔"

اس آیہ شریفہ کے حکم کے مطابق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نجران کے وفد کو مباہلہ کی دعوت دیدی ، اس طرح سے کہ آپ ﷺ ،عورتوں اور فرزندوں کے ساتھ حاضر ہو کر جھوٹوں پر لعنت کریں تاکہ خدائے متعال ان کے لئے عذاب نازل کرے۔

نجران کے وفد نے مباہلہ کی تجویز کو قبول کیا ، اوردوسرے ہی دن مباہلہ کا وقت مقرر کیاگیا ۔ دوسرے دن مسلمانوں کی بڑی تعداداور نجران کاوفد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تشریف لانے کا منتظر تھاکہ دیکھیں ،آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کس شان و شوکت کے ساتھ تشریف لاتے ہیں اورکن لوگوں کو مباہلہ کے لئے اپنے ساتھ لا رہے ہیں ۔

انہوں نے دیکھاکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس شان سے تشریف لارہے ہیں کہ آپ کی آغوش میں حسین علیہ السلام ہیں اور حسن علیہ السلام ہاتھ پکڑے ہوئے ہیں، آپ ﷺ کے پیچھے آپ کی بیٹی فاطمہ سلام اللہ علیہا اور ان کے پیچھے علی علیہ السلام ہیں اورآپ ﷺ ان سے فرمارہے ہیںکہ جب میں دعاکروں توتم لوگ آمین کہنا ۔

اس نورانی وفد، جن کے وجود سے حق و حقیقت نمایاں تھی ،جو خداکی پناہ گاہ کے سواکسی پناہ گاہ پر بھروسہ کئے ہوئے نہیں تھے ،نے نجران کے وفد کو لرزہ بر اندام کردیا ، ان کے سردار نے اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا:

"خدا کی قسم !میں ایسے چہروں کو دیکھ رہا ہوں کہ اگر یہ بارگاہ الٰہیٰ میں دعا کریں گے تو روئے زمین پر تمام نصاریٰ نابود ہو جائیں گے"اسکے بعد وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مباہلہ سے دست بردار ہونے کی عذر خواہی کی ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا : لہٰذا اسلام لائو۔

انہوں نے کہا :اسلام لانے سے بھی معذور ہیں ۔

آپ ﷺ نے فرمایا : تو پھر ہم تم لوگوں سے جنگ کریں گے۔

انہوں نے کہا: مسلمانوں سے لڑنے کی ہم میں طاقت نہیں ہے ، لیکن سالانہ جزیہ دیں گے اور اسلام کی پناہ میں زندگی کریں گے اسطرح اختلاف ختم ہوا ۔

مباہلہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ حضرت علی ، حضرت فاطمہ زہرااور حسنین کے آنے سے واضح ہوا کہ آیہ شریفہ(ابنائنا ونسائنا وانفسنا)، پیغمبر ﷺ ،علی ،فاطمہ،اورحسن وحسین علیہم السلام کے علاوہ کوئی اور نہ تھا ۔دوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے کہ جوپیغمبر نے "اپنے نفس" فرمایا اس سے مقصود خودآپ ﷺ اور علی تھے ،اوریہ جو فرمایا"اپنی عورتیں "اس سے مقصود فاطمہ تھیں اوریہ جوفرمایا"اپنے فرزند" اس سے مقصود"حسنین"تھے ۔

یہاں پر اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ علی علیہ السلام بمنزلۂ خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں ۔اوریہ بھی واضح ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت علیہم السلام چار افراد تھے ،کیونکہ شخص کے ہر اہل بیت وہ لوگ ہیں کہ جن کاتعارف وہ خود کلمہ "انفس ،نسائنا وابنائنا"(ہمارے نفس، ہماری عورتیں ،اور ہمارے بچوں) سے کرائے ہیں .اگر اہل بیت میں ان کے علاوہ کوئی اور ہوتا توپیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کوبھی مباہلہ کے لئے ہمراہ ضرور لے آتے ۔

اس سے ان چار ہستیوں کی عصمت ثابت ہوتی ہے،کیونکہ خدائے متعال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت علیہم السلام کی عصمت وطہارت کی گواہی دے رہا ہے :

(...(انّما یرید اللہ لیذھب عنکم الرّجس اھل البیت و یطھّرکم تطھیراً) (احزاب۳۳)

"بس اللہ کا ارادہ ہے اے اہل بیت ! تم سے ہر برائی کودور رکھے اور تم کو اس طرح پاک وپاکیزہ رکھے جو پاک وپاکیزہ رکھنے کا حق ہے ۔"

۲۔جیسا کہ عامہ وخاصہ (سنی وشیعہ)نے نقل کیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایاہے :

"مِثْلُ اَھْلُ بَیْتِیْ کَمِثْلِ سَفِیْنۃُ نُوْحَ مَنْ رَکَبَھَا نَجٰی وَمَنْ تَخَلّف عَنھا غَرَق"

"میرے اہل بیت کی مثال نوح کی کشتی کے مانند ہے ،جواس میں سوار ہوااس نے نجات پائی اور جس نے اس سے رو گردانی کی وہ غرق ہوگیا۔"

۳۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ایک اور متواترہ روایت میں ،جسے عامہ وخاصہ نے نقل کیا ہے، فرمایا ہے:
"انی تارک فیکم الثقلین :کتاب اللّٰہ وعترتی اھل بیتی لن یفترقا حتی یردا علیَّ الحوض ما ان تمسَّکُتم بِھما لن تضِلُّوابعدی"

میں تمہارے درمیان دوگراں قدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں ،جو کبھی ایک دسرے سے جدا نہیں ہو ں گی ،یہ دو چیزیں خدا کی کتاب اور میرے اہل بیت ہیں جب تک ان دو نوں سے متمسّک رہو گے ،گمراہ نہیں ہو گے۔

ائمہ علیہم السلام کی تقرری

حضرت علی علیہ السلام کی امامت (جیسا کہ معلوم ہوا)خدا کی طرف سے اور پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نص سے تھی،اور اسی طرح دوسرے ائمہ علیہم السلام جو حضرت علی کے بعد تھے ،ہر امام نے اپنے بعد والے امام کا خدا کے حکم سے لوگوں میں تعارف کیاہے۔چنانچہ حضرت علی علیہ السلام پہلے امام اور مسلمانوں کے پہلے پیشوا تھے ،آپ ﷺ نے اپنی شہادت کے وقت اپنے بیٹے امام حسن علیہ السلام کا تعارف کرایا اور امام حسن علیہ السلام نے بھی اپنی شہادت کے موقع پر اپنے بھائی حضرت امام حسین علیہ السلام کا تعارف کرایا اوراسی طرح بارہویں امام تک سلسلہ رہا۔

ہرامام سے اپنے بعد والے امام کے بارے میں نص کے علاوہ ،پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی (عامہ وخاصہ سے نقل کی گئی بہت سی حدیثوں کے مطابق)اماموں کے بارہ ہونے کے بارے میں یہاں تک کہ بعض حدیثوں میں ان کے ناموں کے ساتھ تعارف کرایا ہے۔

حضرت امام علی علیہ السلام

(مسلمانوں کے پہلے امام)

حضرت امیرالمومنین علی بن ابیطالب علیہ السلام پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم وتربیت کے پہلے کامل نمونہ تھے۔ علی علیہ السلام نے بچپن سے ہی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دامن میں پرورش پائی تھی، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے آخری لمحہ تک ایک سایہ کے مانند ساتھ ساتھ رہے اور آپ ﷺ کی شمع وجود کے گرد پروانہ کی طرح پرواز کرتے رہے۔جب آخری بار آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جدا ہوئے، یہ وہ لمحہ تھا جب آپ نے آنحضرت ﷺ کے جسد مطہر کو آغوش میں لے کر سپرد خاک کیا۔

حضرت علی علیہ السلام ایک عالمی شخصیت ہیں۔دعوی کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جتنی گفتگو اس عظیم شخصیت کے بارے میں ہوئی ہے، اتنی کسی بڑے سے بڑے عالمی شخصیت کے بارے میں نہیں ہوئی ہے۔شیعہ وسنی اور مسلم وغیر مسلم دانشوروں اور مصنفوں نے حضرت علی علیہ السلام کی شخصیت کے بارے میں ایک ہزار سے زائد کتابیں تالیف کی ہیں۔آپ کے بارے میں دوست ودشمن بے شمار تحقیق اور کھوج کے باوجود آپ کے ایمان میں کسی قسم کا کمزور نقطہ پیدا نہیں کر سکے یا آپ کی شجاعت، عفت، معرفت، عدالت اور دوسرے تمام پسندیدہ اخلاق کے بارے میں شمہ برابر نقص نہیں نکال سکے، کیونکہ آپ ایک ایسے شخص تھے، جو فضیلت وکمال کے علاوہ کسی چیز کو نہیں پہچانتے تھے اور اسی طرح آپ میں فضیلت وکمال کے علاوہ کوئی چیز نہیں پائی جاتی تھی۔

تاریخ گواہ ہے کہ، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت سے آج تک جتنے حکّام نے اسلامی معاشرہ میں حکومت کی ان میں صرف حضرت علی علیہ السلام ایسے ہیں کہ جنہوں نے اسلامی معاشرہ پر اپنی حکومت کے دوران پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت پر پوری طرح عمل کیا اور آنحضرت ﷺ کی روش سے ذرہ برابر منحرف نہیں ہوئے اور اسلامی قوانین اور شریعت کو کسی قسم کے دخل وتصرف کے بغیر اسی طرح نافذ کیا، جس طرح پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات میں نافذ ہوئے تھے۔

دوسرے خلیفہ کی وفات کے بعد نئے خلیفہ کو معین کرنے کے لئے خلیفہ دوم کی وصیت کے مطابق جو چھ رکنی کمیٹی بنائی گئی تھی، اس میں کافی گفتگو کے بعد خلافت کا مسئلہ علی اور عثمان کے درمیان تذبذب میں پڑا علی کو خلافت کی پیشکش کی گئی، لیکن اس شرط پر کہ "لوگوں میں خلیفہ اول اور دوم کی سیرت پر عمل کریں"حضرت علی نے ان شرائط کو ٹھکراتے ہوئے فرمایا:"میں اپنے علم سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھوں گا۔"

اس کے بعدوہی شرائط عثمان کے سامنے رکھی گئیں ، انھوں نے قبول کیا اور خلافت حاصل کی ، اگرچہ خلافت ہاتھ میں آنے کے بعددوسری سیرت پر عمل کیا ۔

علی علیہ السلام نے راہ حق میں جن جاں نثاریوں، فداکاریوں اور عفو و بخشش کا مظاہرہ کیا ہے ان میں آپ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب میں بے نظیر تھے ۔ اس حقیقت سے ہرگزانکار نہیں کیاجاسکتا ، کہ اگراسلام کا یہ جاں نثار اور سورمانہ ہوتا ،توکفارو مشرکین ہجرت کی رات کو، اس کے بعد بدرواحد، خندق وخیبر وحنین کی جنگوں میں نبوت کی شمع کوآسانی کے ساتھ بجھا کر حق کے پرچم کو سرنگوں کر دیتے۔

علی علیہ السلام نے جس دن سماجی زندگی میں قدم رکھا ، اسی لمحہ سے انتہائی سادہ زندگی گزارتے تھے ،پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات میں ،آپ ﷺ کی رحلت کے بعد ، یہاں تک کہ اپنی با عظمت خلافت کے دنوں میں فقیروں اور پسماندہ ترین افراد جیسی زندگی بسر کرتے تھے ، خوراک ، لباس اور مکان کے لحاظ سے معاشرہ کے غریب ترین افرادمیں اور آپ میں کوئی فرق نہیں تھا اور آپ فرماتے تھے ۔

"ایک معاشرے کے حاکم کواس طرح زندگی بسر کرنی چاہیئے کہ ضرورت مندوں اورپریشان حال افراد کے لئے تسلی کا سبب بنے نہ ان کے لئے حسرت اور حوصلہ شکنی کا باعث ہو۔"[(1)]

علی علیہ السلام اپنی زندگی کی ضروریات کوپورا کرنے کے لئے محنت و مزدوری کرتے تھے، خاص کر کھیتی باڑی سے دلچسپی رکھتے تھے ،درخت لگاتے تھے اور نہر کھودتے تھے ، لیکن جو کچھ اس سے کماتے تھے یا جنگوں میں جومال غنیمت حاصل کرتے تھے ، اسے فقرا اورحاجتمندوں میں تقسیم کردیتے تھے ۔جن زمینوں کو آباد کرتے تھے انھیں یا وقف کرتے تھے یا ان کو بیچ کر پیسے حاجتمندوں کو دیتے تھے ۔ اپنی خلافت کے دوران ایک سال حکم دیا کہ آپ کے اوقاف کی آمدنی کو پہلے آپ کے پاس لایا جائے پھر خرچ کیا جائے۔جب مذکورہ آمدنی جمع کی گئ تو یہ سونے کے ٢٤ ہزاردینار تھے ۔

علی علیہ السلام نے اتنی جنگوں میں شرکت کی لیکن کبھی کسی ایسے دشمن سے مقابلہ نہ کیا جسے موت کے گھاٹ نہ اتار دیا ہو ۔آپ نے کبھی دشمن کو پیٹھ نہ دکھائی اور فرماتے تھے :

"اگر تمام عرب میرے مقابلہ میں آجائیں اور مجھ سے لڑیں تو بھی میں شکست نہیں کھائوں گا اورمجھے کوئی پروا نہیں ہے ۔"

علی علیہ السلام ایسی شجاعت وبہادری کے مالک تھے کہ دنیا کے بہادروں کی تاریخ آپ کی مثال پیش نہ کرسکی ، اس کے باوجود آپ انتہائی مہربان، ہمدرد، جوانمرد اور فیاض تھے۔ جنگوں میں عورتوں ، بچوںاور کمزوروں کو قتل نہیں کرتے تھے اور ان کو اسیر نہیں بناتے تھے بھاگنے والوں کا پیچھا نہیں کرتے تھے۔

جنگ صفین میں معاویہ کے لشکر نے سبقت حاصل کر کے نہر فرات پر قبضہ کرلیا اور آپ کے لشکر پر پانی بند کر دیا ، حضرت علی علیہ السلام نے ایک خونین جنگ کے بعد نہر سے دشمن کا قبضہ ہٹا دیا، اس کے بعد حکم دیا کہ دشمن کے لئے پانی کا راستہ کھلا رکھیں ۔

خلافت کے دوران کسی رکاوٹ اوردربان کے بغیر ہر ایک سے ملاقات کرتے تھے اور تنہا اور پیدل راستہ چلتے تھے ،. گلی کوچوں میں گشت زنی کرتے تھے اور لوگوں کو تقوی کی رعایت کرنے کی نصیحت فرماتے تھے اور لوگوں کو ایک دوسروں پر ظلم کرنے سے منع کرتے تھے ، بے چاروں اور بیوہ عورتوں کی مہربانی اور فروتنی سے مدد فرماتے تھے ۔یتیموں اور لاوارثوں کو اپنے گھر میں پالتے تھے ، ان کی زندگی کی ضرورتوں کو ذاتی طور پر پورا کرتے تھے اور ان کی تربیت بھی کرتے تھے ۔

حضرت علی علیہ السلام علم کو بے حد اہمیت دیتے تھے اور معارف کی اشاعت کے میں خاص توجہ دیتے تھے ، اور فرماتے تھے:

"نادانی کے مانند کوئی درد نہیں ہے"(2)

جمل کی خونین جنگ میں آپ اپنے لشکر کی صف آرائی میں مشغول تھے ، ایک عرب نے سامنے آکر "توحید" کے معنی پوچھے۔ لوگ ہر طرف سے عرب پر ٹوٹ پڑے اور اس سے کہا گیا ایسے سوالات کا یہی وقت ہے؟! حضرت نے لوگوں کو اعرابی سے ہٹا کر فرمایا :

"ہم لوگوں سے ان ہی حقائق کو زندہ کرنے کے لئے لڑ رہے ہیں "(3)

اس کے بعد اعرابی کو اپنے پاس بلایا ، اپنے لشکر کی صف آرائی کرتے ہوئے اعرابی کو ایک دلکش بیان سے مسئلہ کی وضاحت فرمائی ۔

اس قسم کے واقعات حضرت علی علیہ السلام کے دینی نظم وضبط اور ایک حیرت انگیز خدائی طاقت کی حکایت کرتے ہیں ۔جنگ صفین کے بارے میں مزید نقل کیا گیا ہے کہ ،جب دو لشکر دو تلاطم دریائوں کے مانند آپس میں لڑ رہے تھے اور ہر طرف خون کا دریا بہہ رہا تھا۔ تو حضرت اپنے ایک سپاہی کے پاس پہنچے، اس سے پینے کے لئے پانی مانگا۔

سپاہی نے لکڑی کا ایک پیالہ نکالا اور اس میں پانی بھر کے پیش کیا ، حضرت نے اس پیالہ میں ایک شگاف مشاہدہ کیا اور فرمایا :"ایسے برتن میں پانی پینا اسلام میں مکروہ ہے۔"

سپاہی نے عرض کی : اس حالت میں کہ جب ہم ہزاروں تیروں اور تلواروں کے حملہ کی زد میں ہیں اس قسم کی دقت کرنے کا موقعہ نہیں ہے !

اس سپاہی کو آپ نے جو جواب دیا، اس کا خلاصہ یہ ہے:"ہم ان ہی دینی احکام و قوانین کو نافذ کرنے کے لئے لڑ رہے ہیں اور احکام چھوٹے بڑے نہیں ہوتے ہیں"

اس کے بعد حضرت نے اپنے دونوں ہاتھوں کو ملا کر سامنے کیا اور سپاہی نے پیالہ میں بھرا پانی آپ کے ہاتھوں میں ڈال دیا ۔

حضرت علی علیہ السلام پیغمبر اسلام کے بعد ایسے پہلے شخص ہیں کہ جنہون نے علمی حقائق کو فلسفی طرز تفکر ،یعنی آزاد استدلال میں بیان فرمایا اور بہت علمی اصطلا حیں وضع کیں اور قرآن مجید کی غلط قرأت اور تحریف سے حفاظت کے لئے عربی زبان کے قو اعد "علم نحو" وضع کئے اور ان کو مرتب کیا۔

آپ کی تقریروں ،خطوط اوردیگر فصیح بیانات میں ،معارف الہی، علمی، اخلاقی ،سیاسی یہاں تک کہ ریاضی کے مسائل میں جوباریک بینی پائی جاتی ہے ، یقینا وہ حیرت انگیزہیں۔

امام علی علیہ السلام کے فضائل کا خلاصہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کوچھ سال کی عمر میں حضرت ابوطالب کے یہاں سے اپنے گھر لے آئے اور ان کی پرورش اپنے ذمہ لے لی۔حضرت علی علیہ السلام اسی دن سے ایک سایہ کے مانند پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ساتھ رہے اورآنحضرت ﷺ سے آخری بار اس وقت جدا ہوئے ،جب آپ نے آنحضرت ﷺ کے جسد مطہر کوسپرد خاک کیا۔

حضرت علی علیہ السلام پہلے کامل نمونہ ہیں جو پیغمبر اسلام ﷺ کی تعلیم وتربیت کے مکتب میں پروان چڑھے ۔آپ پہلے شخص ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے اور آپ ہی سب سے آخر میں حضرت ﷺ سے جدا ہوئے ۔

بعثت کے پورے زمانہ میں جو خدمات حضرت علی علیہ السلام نے خدا کے دین کے لئے انجام دیئے ،دوست ودشمن گواہ ہیں کہ وہ خدمات کوئی اورانجام نہیں دے سکا ہے ۔

حضرت علی علیہ السلام نے اسلام کی سب سے اہم جنگوں میں شرکت فرمائی اور جنگ کے تمام خونین میدانوں میں مسلمانوں کے اندر بے مثال بہادری اور کامیابی کا راز آپ ہی تھے ۔چنانچہ بڑے بڑے صحابی جنگوں میں بارہا بھاگ جاتے تھے ، لیکن آپ نے کبھی دشمن کو پیٹھ نہیں دکھائی اور کوئی حریف آپ کی تلوار کی وار سے بچ نہ سکا ۔اس بے نظیر شجاعت ،جوضرب المثل بن چکی تھی ،کے باوجودآپ ہمدرداورمہربان تھے ، کبھی اپنے زخمی دشمن کوقتل نہیں کرتے تھے اور جنگ سے بھاگنے والوں کاپیچھا نہیں کرتے تھے ۔

حضرت علی علیہ السلام ،اپنی تقریروں، کلمات قصار اور اپنے گوہربار بیانات ،جویادگار کے طورپر مسلمانوں کے پاس موجودہیں ،کے اعتبار سے مسلمانوں میں قرآن مجید کے بلند مقاصد کے بارے میں معروف ترین شخص ہیں ۔آپ نے اسلام کے اعتقادی و علمی معارف کوکما حقّہ حاصل کر کے حدیث شریف:

"انا مدینةالعلم وعلی بابها"[4]

کوثابت کردیا اوراس علم کو عملی جا مہ پہنایا ۔ حضرت علی علیہ السلام کا دینداری، عفت نفس اورزھدوتقویٰ میں کوئی نظیر نہیں تھا۔آپ اپنے معاش کے لئے روزانہ محنت و مشقت کرتے تھے ، بالخصوص زراعت کو بہت پسند کرتے تھے ۔بنجر زمینوں کوآباد کرتے تھے ،نہریں کھودتے تھے ،درخت لگاتے تھے،جس جگہ کو آباد کرتے اسے مسلمانوںکے لئے وقف کر دیتے تھے یا اس کو بیچ کرپیسے فقراء میں تقسیم کر دیتے تھے اور خود نہایت زھدوقناعت کے ساتھ فقیرانہ زندگی گزارتے تھے۔ جس دن شہید ہوئے ۔باوجوداس کے کہ تمام اسلامی ممالک کے فرمانروا تھے ۔آپ کی پونجی صرف سات سودرہم تھی جنھیں آپ اپنے گھر کے لئے ایک خدمت گار پرصرف کرنا چاہتے تھے۔

حضرت علی علیہ السلام کی عدالت ایسی تھی کہ خداکے احکام کے نفاذاور لوگوں کے حقوق کو زندہ کرنے میں ہرگز کسی طرح کے استثناء کے قائل نہیں تھے ۔آپ ذاتی طور پر گلی کوچوں میں گشت لگاتے تھے اور لوگوں کو اسلامی قوانین کی رعایت کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔

حضرت امیرالمؤمنین کا طریقہ

چنانچہ ہم جانتے ہیں کہ پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد مسلمانوں کے مسائل میں ولی ہونا،آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نص کے مطابق خدائے متعال کی طرف سے حضرت علی علیہ السلام کے لئے مخصوص تھا ، لیکن اسے انتخابی خلافت میں تبدیل کیا گیا اور اس طرح خلافت کی کرسی پر دوسرے لوگوں نے قبضہ جمایا ۔

حضرت علی علیہ السلام اورآنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چند خاص صحابیوں جیسے سلمان فارسی ، ابوذرغفاری اورمقداد اسدی نے لوگوں سے ایک اعتراض کیا لیکن انھیں مثبت جواب نہیں ملا۔

حضرت علی علیہ السلام لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کرکے ایک مدت تک اپنے گھرمیں قرآن مجید جمع کرنے میں مصروف رہے ۔اس کے بعد کچھ خاص صحابیوںاورچنددیگرافراد کی تعلیم وتربیت میں مشغول ہوئے ۔

حضرت علی علیہ السلام کا ماضی درخشان اور بے مثال تھا ۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات میں آپ آنحضرت ﷺ کے وزیر اور اسلامی فتوحات کی کلید تھے. علم ودانش میں ، فیصلہ دینے میں ، سخن وری اور دیگرتمام معنوی فضائل میں آپ تمام مسلمانوں پر برتری رکھتے تھے ۔اس کے باوجودخلیفہ اول کے زمانے میں اجتماعی مسائل اور عمومی کام میں آپ سے کسی قسم کا استفادہ نہیں کیاگیا ،اس لئے آپ صرف خدا کی عبادت اورچند اصحاب کی علمی و عملی تربیت میں مشغول رہتے تھے اورایک عام انسان کی طرح زندگی گزارتے تھے ۔

خلیفہ دوم کے زمانے میں بھی کسی کام کو آپ کے حوالہ نہیں کیا جاتا تھا ، لیکن کسی حدتک آپ سے رجوع کرتے تھے اور اہم مسائل میں آپ کے نظریات سے استفادہ کیا جاتا اور آپ سے مشورہ لیا جاتا تھا ۔چنانچہ خلیفہ دوم نے بارہا کہا ہے:(اگر علی کی رہنمائی نہ ہوتی ،تو عمرہلاک ہوجاتا)۔[5]

خلیفہ سوم کے زمانہ میں لوگوں کی توجہ آپ کی طرف زیادہ ہوئی اوراس پوری ۲۵ سالہ مدت میں آپ کی تعلیم وتربیت کادائرہ دن بدن وسیع تر ہوتاگیایہاں تک کہ مکتب ولایت سے بالواسطہ اور بلاواسطہ تربیت پانے والوں کی ایک بڑی جماعت نے خلیفہ سوم کے قتل کے فورابعد آپ کے پاس ہجوم کیا اورآپ کوخلافت قبول کرنے پر مجبور کیا ۔

حضرت امیرالمومنین نے خلافت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت کو۔ جیسے مدتوں سے فراموش کیاگیا تھا۔پھر سے زندہ کیا۔آپ نے مساوات اوراجتماعی عدالت نافذ کرکے تمام بیجا امتیازات کوختم کردیا۔تمام لاابالی گورنروںاورفرمانرواؤں کو معزول کردیااورانکے بیت المال سے لوٹے گئے مال ودولت اور خلیفہ کی طرف سے مختلف لوگوں کوبے حساب دی گئی جاگیروں و املاک کوضبط کیا، اور دینی ضوابط اورقوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں کومناسب سزائیں سنائیں ۔

اثرو رسوخ رکھنے والے لیڈروںاورناجائز منافع حاصل کرنے والوں نے جب دیکھا کہ ان کے ذاتی منافع خطرے میں پڑ رہے ہیں،توانہوں نے مخالفت کاپرچم بلند کرکے عثمان کے خون کابدلہ لینے کے بہانے سے داخلی خونین جنگوں کی آگ بھڑکادی جوحضرت کی مشکلات کاسبب اوراصلاحات رکھنے میں رکاوٹ بن گئیں ۔

حضرت علی علیہ السلام نے اپنی خلافت کے پانچ سالہ دور میں کمر توڑ مشکلات کے باوجود بے شمار افراد کی تربیت کی اوراپنی تقریروں اور فصیح بیانات کے ذریعہ علمی میدان کے مختلف ہنروفنون کے گراں بہا خزانے یادگارکے طورپرچھوڑدئے ، ان میں سے ایک علم نحوکے اصولوںکا وضع کرنا ہے جو حقیقت میں عربی زبان کے قواعد وضوابط ہیں ۔

آپ کی برجستہ شخصیت کے اوصاف ناقابل بیان ہیں ،آپ کے فضائل بے انتہا اور بے شمارہیں ۔تاریخ ہرگز کسی ایسے شخص کوپیش نہیںکر سکتی جس نے آپ کے برابر دنیا کے دانشوروں، مصنفوں اور متفکروں کے افکار کو اپنی طرف جذب کیا ہو۔

۱۔نہج البلاغہ فیض الاسلام ،خطبہ ۲۰۰،ص۶۶۳۔

2۔شرح غرر الحکم ،ج۲،ص۳۷۷،ح۲۸۸۲۔

3۔ بحارالانوار،ج۳،ص۲۰۷ ،ح ۱۔

4۔بحارالانوار،ج۴۰،ص ۲۰۱۔

5۔بحارالانوار،ج۴۰ص۲۲۹۔

حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام

(دوسرے امام)

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے اپنے والد گرامی کی شہادت کے بعد خلافت کی باگ ڈور سنبھالی۔آپ معاویہ کے بلوے کو دبانے کے لئے ایک لشکر کو مسلح اور منظم کرنے میں لگ گئے۔آپ نے لوگوں میں اپنے نانا اور والدگرامی کی سیرت کو جاری رکھا ۔لیکن کچھ مدت کے بعد معلوم ہوا کہ معاویہ کی مخفیانہ سازشوں اور ریشہ دوانیوں کی وجہ سے آپ کی کوششیں ناکام ہورہی ہیں،آپ کے لشکر کے سردار معاویہ سے سازباز کر چکے ہیں،اوریہاںتک آمادہ تھے کہ آپ کو گرفتار کرکے معاویہ کے حوالہ کردیں یا قتل کردیں۔

بدیہی ہے کہ ایسے حالات میں معاویہ سے جنگ کرنے میں امام حسن مجتبیٰ کے لئے شکست و ناکامی یقینی تھی،یہاں تک کہ اگر امام تنہا یا اپنے نزدیک ترین افراد کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے قتل ہوتے،تو معاویہ کی سلطنت میں کسی قسم کی ہلچل نہ مچتی اور لوگوں کے دلوںپر بھی کوئی اثر نہ ہوتا،کیونکہ معاویہ اپنی مخصوص شاطرانہ چال سے آسانی کے ساتھ آپ کو مختلف ذرایع حتی اپنے ہی افراد کے ذریعہ قتل کرا سکتا تھا،اس کے بعد لباس عزا پہن کر آپ کی انتقام کادعویٰ کر کے فرزند پیغمبر ﷺ کے خون سے اپنے دامن کو دھوسکتا تھا۔ان ناگفتہ بہ حالات کے پیش نظر حضرت امام حسن مجتبی علیہ السلام نے معاویہ کی طرف سے صلح کی تجویز کو کچھ شرائط کے ساتھ قبول کیا اور خلافت سے دستبردار ہوگئے۔لیکن معاویہ نے تمام شرائط کو پامال کر کے ان میں سے کسی ایک پر عمل نہیں کیا۔

حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے اس طرح اپنی،اپنے بھائی حضرت امام حسین اور اپنے چند اصحاب کی جان کو یقینی خطرہ سے بچالیا اور اپنے خاص اصحاب کا ایک مختصر ومحدود لیکن حقیقت پر مبنی معاشرہ تشکیل دیا اور اصلی اسلام کو بالکل نابود ہونے سے بچالیا۔

البتہ معاویہ ایسا شخص نہیں تھا جو امام حسن مجتبیٰ کے مقصد اورآپ کے منصوبہ سے بے خبر رہتا،اس لئے صلح برقرار ہونے اورپورے طورپر تسلط جمانے کے بعد معاویہ نے حضرت علی علیہ السلام کے دوستوں اورحامیوں کو جہاں کہیں پایا ان کو مختلف ذرائع سے نابود کردیا،اگرچہ صلح کے شرائط میں سے ایک شرط یہ تھی کہ خاندان رسالت کے حامی اوردوست امان میں رہیں گے۔

بہر حال معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کی ولی عہدی کے مقدمات کو مستحکم کرنے کے لئے امام حسن مجتبی علیہ السلام کو آپ کی بیوی کے ہاتھوں زہر دلا کر شہید کرایا،کیونکہ صلح نامہ کے دوسرے شرائط میں یہ بھی تھا کہ معاویہ کے بعد خلافت پھر سے حضرت امام حسن مجتبی کو ملے گی۔

حضرت امام حسین علیہ السلام

(تیسرے امام)

حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے برادر بزرگوار کے بعد حکم خدا اور اپنے بھائی کی وصیت سے امامت کے عہدہ پرفائز ہوئے او رمعاویہ کی خلافت کے دوران تقریباًدس سال زندگی گزاری اوراس مدت میں اپنے بھائی حضرت امام حسن مجتبی علیہ السلام کی سیرت پر عمل کرتے رہے اور جب تک معاویہ زندہ تھا امام کوئی موثرکام انجام نہ دے سکے ۔تقریباً ساڑھے نوسال کے بعد معاویہ مر گیا ،اورخلافت جو سلطنت میں تبدیل ہو چکی تھی اس کے بیٹے یزید کو ملی ۔

یزید ،اپنے ریاکارباپ کے برعکس ،ایک مست ،مغرور،عیاش،فحاشی میں ڈوبا ہوا اور لاابالی جوان تھا ۔یزید نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی مدینہ کے گورنر کو حکم دیا کہ حضرت امام حسین علیہ السلام سے اس کے لئے بیعت لے ورنہ ان کا سر قلم کر کے اس کے پاس بھیجدے ۔اس کے بعد مدینہ کے گورنر نے حکم کے مطابق امام حسین علیہ السلام سے یزید کی بیعت کا تقاضا کیا،آپ نے مہلت چاہی اور رات کو اپنے اہل خانہ کے ساتھ راہی مکہ ہوئے ۔اورحرم خدا میں ،جواسلام میں ایک سرکاری پناہ گاہ ہے ،پناہ لی ،لیکن وہاں پر کچھ مہینے گزارنے کے بعد ،سمجھ گئے کہ یزید کسی قیمت پر آپ سے دست بردارہونے والا نہیںہے ،اوربیعت نہ کرنے کی صورت میں ،آپ کا قتل ہونا قطعی ہے۔اور دوسری جانب سے اس مدت کے دوران عراق سے کئی ہزار خطوط حضرت کی خدمت مین پہنچے تھے کی جن میں آپ کی مدد کا وعدہ دے کر ظالم بنی امیہ کے خلاف تحریک چلانے کی دعوت دی تھی ۔

امام حسین علیہ السلام عمومی حالات کے مشاہدہ سے اورشواہدوقرائن سے سمجھ چکے تھے کہ آپ کی تحریک ظاہری طورپر آگے نہیں بڑھ سکتی ہے،اس کے باوجودیزید کی بیعت سے انکار کرکے قتل ہونے پر آمادہ ہوئے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ تحریک کا آغاز کر کے مکہ سے کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔راستہ میں سرزمین کربلا (کوفہ سے تقریباً ستر کلومیٹر پہلے) دشمن کے ایک بڑے لشکر سے آپ کی مڈ بھیڑ ہوئی۔

امام حسین علیہ السلام راستہ میں لوگوں کو اپنی مدد کے لئے دعوت دے رہے تھے اوراپنے ساتھیوں سے تذکرہ کرتے تھے کہ اس سفرمیں قطعی طورپر قتل ہونا ہے اور اپنا ساتھ چھوڑنے پر اختیار دیتے تھے، اسی لئے جس دن آپ کا دشمن سے مقابلہ ہوا توآپ کے گنے چنے جان نثار ساتھی باقی بچے تھے جنہوں نے آپ پر قربان ہونے کا فیصلہ کیا تھا ،لہٰذاوہ بڑی آسانی کے ساتھ دشمن کی ایک عظیم فوج کے ذریعہ انتہائی تنگ محاصرہ میں قرار پائے اوریہاں تک کہ ان پرپانی بھی بندکیاگیا ،اور ایسی حالت میں امام حسین علیہ السلام کو بیعت کرنے یا قتل ہونے کے درمیان اختیار دیاگیا ۔

امام حسین علیہ السلام نے بیعت کرنے سے انکار کیا اورشہادت کے لئے آمادہ ہوگئے۔ ایک دن میں صبح سے عصر تک اپنے ساتھیوں کے ساتھ دشمن سے لڑتے رہے۔ اس جنگ میں خود امام، آپ کے بیٹے، بھائی، بھتیجے، چچیرے بھائی اورآپ کے اصحاب کہ جن کی کل تعدادتقریباستر افراد کی تھی، شہید ہوئے۔ صرف آپ کے بیٹے امام سجاد علیہ السلام بچے، جو شدید بیمار ہونے کی وجہ سے جنگ کرنے کے قابل نہیں تھے۔

دشمن کے لشکر نے، حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد مال کو لوٹ لیا اورآپ کے خاندان کو اسیر بنا لیا اورشہداء کے کٹے ہوئے سروں کے ہمراہ اسیروں کو کوفہ اور کوفہ سے شام لے جایا گیا۔

اس اسیری میں امام سجاد علیہ السلام نے شام میں اپنے خطبہ سے اسی طرح حضرت زینب کبری سلام اللہ علیہا نے کوفہ کے مجمع عام میں اور کوفہ کے گورنر ابن زیاد کے دربار میں اور شام میں یزید کے دربار میں اپنے خطبوں سے حق سے پردہ اٹھایا اور بنی امیہ کے ظلم وستم کو دنیا والوں کے سامنے آشکار اور واضح کردیا۔

بہرحال امام حسین علیہ السلام کی تحریک، ظلم، وزیادتی اورلاابالی کے مقابلہ میں خود آپ اورآپ کے فرزندوں، عزیزوں اوراصحاب کے پاک خون کے بہنے اورمال کی غارت اورخاندان کی اسیری پر ختم ہوئی۔ یہ تحریک اپنی خصوصیات و امتیازات کے پیش نظر اپنی نوعیت کا ایک ایسا واقعہ ہے انقلاب کی تاریخ کے صفحات پر رقم ہے۔ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام اس واقعہ سے زندہ ہے اور اگریہ واقعہ رونما نہ ہوتا تو بنی امیہ اسلام کا نام ونشان باقی نہ رکھتے۔

اس جانکاہ واقعہ نے نمایاں طورپر پیغمبر ﷺ کے اہل بیت علیہم السلام کے مقاصد کو بنی امیہ اوران کے طرفداروں کے مقاصد سے جدا کرکے حق وباطل کوواضح وروشن کردیا۔

یہ واقعہ نہایت کم وقت میں اسلامی معاشرہ کے کونے کونے میں منتشر ہوا اورشدیدانقلابوں اوربہت زیادہ خونریزونکا سبب بنا جو بارہ سال تک جاری رہے وآخرکار بنی امیہ کے زوال کا ایک بنیادی سبب بنا۔

اس واقعہ کا واضح ترین اثر لوگوں کی ایک بڑی تعداد کی معنوی پرورش کے نتیجہ میں رونما ہوا جن کے دلوں میں علی بن ابیطالب کی ولایت نے جڑ پکڑلی اوران لوگوںنے خاندان رسالت کی دوستی کو اپنالائحہ عمل بنالیا اوردن بدن ان کی تعداد اور طاقت بڑھتی گئی۔ اورآج کی دنیامیں تقریباًدس کروڑ مسلمان شیعہ کے نام سے موجود ہیں۔

کیاامام حسن اورامام حسین علیہما السلام کی روش مختلف تھی؟

اگرچہ ان دو محترم پیشوائوں کی روش۔ جونص پیغمبر ﷺ کے مطابق برحق امام ہیں۔ ظاہراً مختلف نظرآتی ہیں، بعض لوگوں نے اس حدتک کہا ہے کہ: ان دو بھائیوں کے درمیان اس حدتک نظریاتی اختلاف پایاجاتاتھا کہ ایک نے چالیس ہزار سپاہی ہونے کے

باوجود صلح کی اور دوسرے نے رشتہ داروں کے علاوہ چالیس دوست واحباب کے ساتھ جنگ کی حتی کہ شش ماہہ طفل شیر خوار کو بھی اس راہ میں قربان کیا۔

لیکن عمیق اوردقیق تحقیقات سے اس نظریہ کے خلاف ثابت ہوتا ہے، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ امام حسن علیہ السلام تقریباً ساڑھے نوسال معاویہ کی سلطنت میں رہے اور کھلم کھلا مخالفت نہیں کی۔ امام حسین علیہ السلام نے بھی اپنے بھائی کی شہادت کے بعد تقریباً ساڑھے نوسال معاویہ کی سلطنت میں زندگی گزاری اور تحریک کا نام تک نہیں لیا اور مخالفت نہیں کی۔

پس دونوں کی روش میں اس ظاہری اختلاف کی اصلی ابنیاد کو معاویہ اوریزید کی متضاد روشوں میں ڈھونڈنا چاہئے نہ کہ ان دو محترم پیشوائوں کے نظریاتی اختلاف میں۔

معاویہ کی روش بظاہرا ایک ایسی روش نہیں تھی جو بے دینی پر استوار ہو اوراپنی اعلانیہ مخالفت سے احکام دین کا مذاق اڑائے۔

معاویہ اپنے آپ کو ایک صحابی اور کاتب وحی کے طور پر پہچنواتا تھا اور اپنی بہن کے ذریعہ (جو زوجہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ام المئو منین تھیں) اپنے آپ کو "خال المومنین" کہلاتا تھا اور خلیفہ دوم کا مورد اعتماد تھا اورعام لوگ خلیفہ پر پورا اعتماداورخاص احترام رکھتے تھے۔

اسکے علاوہ اس نے لوگوں کی نظر میں پیغمبر ﷺ کے قابل احترام اکثر اصحاب (جیسے ابوہریرہ، عمروعاص، سمرہ، بسر اورمغیرۃبن شعبہ وغیرہ)کو گورنری اوردیگر حساس حکومتی عہدوںپر فائز کیا تھا جو لوگوں کے حسن ظن کو اس کی طرف مبذول کرتے تھے اور لوگوں میں اس کے فضائل اوردین کے سلسلہ میں صحابہ کے محفوظ ہونے کے بارے میں۔یعنی جو کام بھی انجام دیں معذورہیں۔ بہت سی روایتیں نقل کرتے تھے، لہذا معاویہ جو بھی کام انجام دیتا تھا وہ قابل توجیہ ہوتا تھا اور جب اس سے کام نہیں بنتا تھا تو معاویہ بھاری انعام واکرام اور لالچ دے کر اعتراض کرنے والوں کا منہ بند کرتا تھا۔جہاں پر یہ حربہ کارگر ثابت نہیں ہوتا تھا، تواپنے انہی حامیوں اور طرفداروں کے ذریعہ مخالفت کرنے والوں کو نابود کراتا تھا۔چنانچہ اس کے ان ہی حامی صحابیوں کے ہاتھوں ،دسیوں ہزاربے گناہ شیعیان علی اوردیگر مسلمانوں حتی کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابیوں کی ایک جماعت کو بھی قتل کیا گیا۔

معاویہ تمام کاموں میں ایک حق بجانب روپ اختیارکرتا تھا اور ایک خاص صبرو تحمّل سے قدم بڑھاتا تھا اورایک خاص مہربانی سے لوگوں کو اپنا محب اور مطیع بنا لیتا تھایہاں تک کہ کبھی اپنے خلاف گالیاں سنتا تھا اور جھگڑوں سے روبرو ہوتا تھا، لیکن خنداں پیشانی اور عفوو بخشش کے ساتھ جواب دیتا تھا،وہ اس طرح اپنی سیاست کو نافذ کرتا تھا۔

حضرت امام حسن اورامام حسین علیہما السلام کابظاہراحترام کرتاتھا اوردوسری طرف سے اعلان کرتاتھا جوبھی شخص اہل بیت علیہم السلام کے فضائل میں کوئی حدیث بیان کرے گا اس کی جان ومال اور عزت و آبرو کسی صورت میں محفوظ نہیں ہے اور جو شخص اصحاب کی منقبت میں کوئی حدیث بیان کرے گاتو اسے انعام واکرام سے نوازا جائیگا۔

اسی طرح یہ بھی حکم دیتا تھا کہ خطباء مسلمانوں کے منبروں سے علی کو(لازمی طورپر)گالیاں دیںؐاور اس کے حکم سے حضرت علی کے حامیوں کو جہاں بھی پاتے تھے موقع پر ہی قتل کرڈالتے تھے اوراس کام میں اس قدر زیادتی کی کہ حضرت علی علیہ السلام کے دشمنوں کی ایک بڑی تعداد کوبھی آپ کی دوستی کے الزام میں قتل کیا گیا ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام حسن علیہ السلام کے انقلاب سے اسلام کونقصان پہنچتا۔ اورآپ اورآپ کے ساتھیوں کا خون رایگان ہوتا۔

ان حالات میں بعید نہیں تھا معاویہ امام حسین کو اپنی ہی افرادمیں سے کسی کے ذریعہ قتل کرواتااور اس کے بعد عام لوگوں کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے اور افکار کو بدلنے کے لئے آپ کے ماتم میں اپنا گریبان چاک کرتا اورآپ کے خون کا بدلہ لینے کے بہانے سے آپ کے شیعوں کا قتل عام کرتا،کیونکہ اس نےیہی رویہ عثمان کے بارے میں اختیار کیا تھا ۔[1]

لیکن یزید کی سیاسی روش کسی صورت میں اس کے باپ کی روش سے مشابہ نہیں تھی ۔وہ ایک خود خواہ اورلا ابا لی و بے دین جوان تھا ،زور وزبردستی کے علاوہ کچھ نہیں جانتا تھا، لوگوں کے افکار و نظریات کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا ۔

یزید نے اسلام کوپس پردہ پہنچائے جانے والے نقصانات کو اپنے مختصر دور حکومت میں اچانک آشکار کیا اور اس سے پردہ ہٹادیا۔

اپنی حکومت کے پہلے سال میں ،خاندان پیغمبر ﷺ کا قتل عام کیا ۔

دوسرے سال مدینہ منورہ کو منہدم کیا اور تین دن تک لوگوں کی عزت،ناموس اورجان ومال کواپنے سپاہیوں کے لئے مباح قراردیا۔

تیسرے سال کعبہ کو منہدم کردیا۔

اسی وجہ سے ،امام حسین علیہ السلام کے انقلاب نے لوگوں کے ذہنوںؐاور افکار میں جگہ پائی اورروز بروز یہ اثر گہرا اورنمایاںؐہوتا گیا اور ابتدائی مرحلہ میں خونین انقلابوں کی صورت میں ظاہر ہوا اورآخر کار مسلمانوں کی ایک عظیم تعداد کو حق و حقیقت کے حامیوں اور محبان اہل بیت علیہم السلام کے عنوان سے وجود میں لایا۔

۱۔تاریخ گواہ ہے کہ عثمان نے معاویہ سے مسلسل مدد کی درخواست کی لیکن معاویہ نے اسکا مثبت جواب نہیں دیا ، لیکن جب عثمان قتل کئے گئے تو ان کے خون کا بدلہ لینے کے بہانہ سے امیرالمؤ منین حضرت علی علیہ السلام سے جنگ کی ۔

یہی وجہ تھی کہ معاویہ نے یزید کو اپنی وصیتوں کے ضمن میں تاکیدو نصیحت کی تھی کہ امام حسین علیہ السلام سے کوئی سروکار نہ رکھے اوران پراعتراض نہ کرے۔ لیکن کیا یزیدکی مستی اورخودخواہی اسے اس بات کی اجازت دیتی کہ وہ اپنے فائدے اور نقصان میں تمیزدے سکے ؟!

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام

(چوتھے امام)

امام سجاد علیہ السلام نے اپنی امامت کی مدت میں جس روش کو اختیار کیا اسے دوحصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے کہ جو مجموعی طورپر ائمہ اطہار علیہم السلام کی عام روش کے مطابق ہے۔ حضرت امام سجادعلیہ السلام کربلا کے جانکاہ واقعہ میں اپنے والد گرامی کے ہمراہ تھے اور حسینی انقلاب میں شریک تھے اور آپ کے والدگرامی کی شہادت کے بعد آپ اسیر کئےگئے اور کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام لے جائے گئے۔ امام سجاد علیہ السلام نے اپنی اسیری میں تقیہ سے کام نہیں لیا اور بلا جھجک حق و حقیقت کا اظہار کرتے تھے ،اور موقع و محل کے مطابق اپنی تقریروں اور بیانات کے ذریعہ خاندان رسالت کی حقانیت اوران کے فخر ومباہات کو عام وخاص تک پہنچاتے تھے اور اپنے والد بزگوارکی مظلومیت اوربنی امیہ کے دردناک ظلم وستم اور بے رحمی کو تشت ازبام کر کے لوگوں کے جذبات اور احساسات کو ایک پرتلاطم طوفان میں تبدیل کرتے تھے ۔

لیکن قید اور اسیری سے رہائی پانے کے بعد، امام سجاد علیہ السلام مدینہ لوٹے اورجانثاری کا ماحول آرام وسکون کے ماحول میں تبدیل ہوا ،گھرمیں گوشہ نشینی اختیارکی اور غیروں کے لئے دروازہ بندکردیا اور خدائے متعال کی عبادت میں مشغول ہوئے ۔اور خاموشی سے حق و حقیقت کے حامیوں کی تربیت کرتے رہے۔

حضرت امام سجاد علیہ السلام نے اپنی امامت کے ۳۵سال کے دوران بالواسطہ یا براہراست لوگوں کی ایک بڑی تعدادکی پرورش وتربیت کی اور ان کو اسلامی معارف کی تعلیم دی۔

جو دعائیں حضرت امام سجاد علیہ السلام محراب عبادت میں آسمانی لہجہ میں پڑھتے اور ان کے ذریعہ اپنے پروردگار سے رازونیاز فرماتے تھے، وہ عظیم اسلامی معارف کے ایک مکمل دورہ پر مشتمل ہیں ۔ دعائوں کے مجموعہ کو "صحیفۂ سجادیہ "کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام

(پانچویں امام)

حضرت امام محمدباقر علیہ السلام کی امامت کے زمانہ میں دینی علوم کی نشرو اشاعت کے لئے کسی حدتک ماحول سازگار ہوا ۔بنی امیہ کے دبائوکے نتیجہ میں اہل بیت علیہم السلام کی احادیث نابود ہو چکی تھیں .جبکہ احکام کے لئے ہزاروں احادیث کی ضرورت ہوتی ہے ،لیکن اصحاب کے ذریعہ پیغمبر اسلام ﷺ کی نقل کی گئی احادیث کی تعداد پانچ سوسے زیادہ نہ تھی ۔

مختصریہ کہ اس زمانے میں کربلا کے جانکاہ واقعہ اور حضرت امام سجاد علیہ السلام کی ۳۵سالہ کوششوں کے نتیجہ میں شیعوں کی ایک بڑی تعداد وجودمیں آگئی تھی۔ لیکن وہ فقہ اسلامی سے خالی ہاتھ تھے ۔چونکہ بنی امیہ کی سلطنت، اندرونی اختلافات، راحت طلبی اور حکّام کی بے لیاقتی کے نتیجہ میں کمزور ہورہی تھی اور اس کے پیکر میں روزبروز سستی کے آثار نمایاں ہوتے جارہے تھے، لہذ اامام محمد باقرعلیہ السلام نے اس فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے علوم اہل بیت علیہم السلام اور فقہ اسلامی کے نشرواشاعت کاکام شروع کیا اور تعلیم وتربیت کے بعد اپنے مکتب سے بہت سے دانشوروں کومعاشرے کے حوالے کیا۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام

(چھٹے امام)

چھٹے امام حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانہ میں اسلامی علوم کی نشرواشاعت کے لئے زمین زیادہ ہموار اورحالات زیادہ مناسب تھے ،کیونکہ حضرت امام محمد باقرکے ذریعہ احادیث کی نشرواشاعت اورآپ کے مکتب کے شاگردوں کی تبلیغ سے لوگوں میں اسلامی معارف اورعلوم اہل بیت علیہم السلام کے بارے میں شوق پیدا ہو چکا تھا اور حدیث سننے کے تشنہ تھے۔

اس کے علاوہ اموی سلطنت نیست ونابودہوچکی تھی اور عباسی سلطنت ابھی پوری طرح سے مستحکم نہیں ہو سکی تھی اور بنی عباس نے اپنے مقاصدکو حاصل کرنے اوربنی امیہ کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے اہل بیت علیہم السلام کی مظلومیت اور شہدائے کربلا کے خون کودستاویز قرار دیا تھا ، لہذا وہ اہل بیت علیہم السلام سے خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے ۔

اس فرصت کو غنیمت سمجھتے ہوئے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے مختلف علوم کی تعلیم و تربیت کا کام شروع کیا ۔تمام اطراف واکناف سے علماء ودانشور گروہ در گروہ آپ کے گھرپر آتے تھے اورآپ کی شاگردی کاشرف حاصل کر کے معارف اسلامی کے مختلف ہنر، اخلاق،تاریخ انبیاء وامم اور حکمت و موعظہ کے بارے میں سوالات کرتے تھے اورجواب حاصل کرتے تھے ۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے مختلف طبقات کے لوگوں سے بحثیں کیں اور گوناگوں ملل و نحل سے مناظرے کئے اور علوم کے مختلف شعبوںمیں کافی شاگردوں کی تربیت کی، آپ کی احادیث اور علمی بیانات سے سیکڑوں کتابیں تالیف ہوئی ہیں، جو "اصول" کے نام سے مشہور ہیں۔

شیعوںنے، جو اسلام میں اہل بیت علیہم السلام کی روش پر چلتے ہیں، اپنے دینی مقاصد اور مسائل سے آپ کی برکتوںسے مکمل طور پر ابہام کو دور کیا ہے اور اپنے مذہبی مجہولات کو آپ کے واضح اور روشن بیانات سے حل کردیا۔ اسی لئے شیعہ مذہب (کہ وہی مذہب اہل بیت ہے) لوگوں میں "مذہب جعفری" کے نام سے معروف ہوگیا۔

امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام کی تحریک

اگرچہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد اہل بیت علیہم السلام کے پیروئوں میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا جارہا تھا، لیکن بنی امیہ کے حکاّم کی طرف سے اہل بیت علیہم السلام کے پیروئوںپر زبردست دبائو کی وجہ سے امام سجاد علیہ السلام کے لئے ممکن نہیں تھا، کہ معارف اسلامی کی تعلیم کا کام عملی اور اعلانیہ طورپر انجام دیں، یہاں تک کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے زمانہ میں اموی سلطنت اندرونی اختلافات اور بنی عباس سے کشمکش کے نتیجہ میں کمزور ہونے کے بعد ختم ہوئی گئی۔

اس لئے شیعہ اور اہل بیت علیہم السلام کے پیرو اور حضرت امام سجاد علیہ السلام کی ۳۵ سالہ امامت کے دوران تربیت یافتہ شاگردوں کو موقع ملا اور وہ دوردراز علاقوں سے سیلاب کی طرح امام محمد باقر علیہ السلام کے گھر پر آکر دینی علوم اور اسلامی معارف کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔

امام محمد باقر علیہ السلام کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام نے بھی اسلامی معارف کی نشر و اشاعت کا کام شروع کیا، دنیا کے کونے کونے سے آنے والے دانشوروں کو قبول کر کے آپ ان کی تعلیم وتربیت فرماتے تھے اورآپ کی کوششوں کے نتیجہ میں ہزاروں دانشور مختلف علوم و فنون کو آپ سے سیکھ کر دنیا بھر میں ان علوم کی نشرواشاعت میں مشغول ہوئے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے شاگردوں کی تالیف کی ہوئی کتابوں کی تعداد چار سو ہے جو "اصول اربعمئاۃ" کے نام سے شیعوں میں معروف ہیں۔

ان کے بعد آنے والے باقی ائمہ علیہم السلام نے بھی ان دو اماموں کی روش پر عمل کرتے ہوئے معارف اسلامی کی نشرواشاعت کی، بنی عباس کے سخت اور شدید دبائو کے باوجود، انہوں نے بھی بہت سے دانشوروں کی پرورش و تربیت کی اور اسلام کے علمی خزانوں کو ان کے حوالے کیا۔ ان ہی ائمہ ھدیٰ علیہم السلام کی کوششوں کے نتیجہ میں آج، دنیا کے کونے کونے میں کروڑوں اہل حق موجود ہیں۔

حضرت امام موسی کاظم علیہ السلام

(ساتویں امام)

بنی عباس نے بنی امیہ کی حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد خلافت پر قبضہ جمایا۔پھر اس کے بعد بنی فاطمہ کی طرف رخ کیا اورپوری طاقت کے ساتھ خاندان نبوت کو نابودکرنے پر اترآئے ، کچھ لوگوں کے سر قلم کئے ، کچھ کو زندہ دفنادیا اور کچھ کو عمارتوں کی بنیادوں میں یادیواروں میں چن دیا۔

چھٹے امام حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے گھر کو جلادیا اور خودحضرت کوچند بارعراق بلایا۔اس طرح چھٹے امام کی زندگی کے آخری دنوں میں تقیہ اور سخت ہو گیا تھااورچونکہ حضرت پرشدیدپابندی تھی ، لہذاخاص شیعوں کے علاوہ آپ کسی سے ملاقات نہیں کرتے تھے اورآخرکارعباسی خلیفہ منصورکے ذریعہ زہرسے شہیدکئے گئے ۔اس طرح ساتویں امام حضرت موسی کاظم کی امامت کے زمانہ میں دشمنوں کا دبائو بہت سخت تھا اور روزبروز بڑھتاجارہا تھا ۔

حضرت امام موسی کاظم علیہ السلام نے شدید تقیہ کے باوجود علوم اسلامی کی نشرواشاعت کو جاری رکھا اور بہت سی احادیث کو شیعوں کے حوالہ کردیا ۔چنانچہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ آپ سے منقول فقہی احادیث پانچویں اور چھٹے امام کے بعددوسرے ائمہ کی نسبت سب سے زیادہ ہیں۔تقیہ کی شدت کی وجہ سے آپ سے منقول احادیث میں "عالم وعبدصالح "جیسی تعبیریں استعمال کی گئی ہیں اور حضرت کا نام صریحاً ذکرنہیں کیا گیا ہے ۔حضرت امام موسی کاظم علیہ السلام عباسی خلفاء کے چار افراد:منصور،ہادی ،مہدی، اورہارون کے معاصر تھے ۔آخر کارہارون کے حکم سے آپ کو گرفتارکر کے قید خانہ میں ڈال دیا گیا اوربرسوں تک ایک زندان سے دوسرے زندان میں منتقل ہوتے رہے اور سرانجام زندان میں ہی زہردے کرآپ کو شہید کیا گیا ۔

حضرت امام رضا علیہ السلام

(آٹھویں امام)

حالات پر غوروفکر کرنے سے ہر صاحب نظرکے لئے واضح تھا کہ خلفائے وقت اوردشمنان اہل بیت علیہم السلام جتنا ائمہ ھدیٰ کو جسمانی اذیتیں پہنچا کرنابود کرنے کی کوشش کرتے تھے اوران کے شیعوں سے سختی سے پیش آتے تھے ، اتنا ہی ان کے پیروئوں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی اور ان کا ایمان مزید مستحکم ہوتا جارہا تھا اوردربار خلافت ان کی نظروں میں ایک نجس اورناپاک دربار سمجھاجاتا تھا ۔

یہ مطلب، ایک باطنی عقیدہ تھا جو ائمہ اطہار علیہم السلام کے معاصر خلفاء کو ہمیشہ رنج وعذاب میں بتلا کر رہا تھا اور حقیقت میں انھیں بے بس اور بیچارہ کرکے رکھدیا تھا۔

مامون ،بنی عباس کا ساتواں خلیفہ تھا اور حضرت امام رضاعلیہ السلام کا معاصر تھا۔ اس نے اپنے بھائی امین کو قتل کرنے کے بعدخلافت پر اپنی گرفت مظبوط کرلی اور اس فکر میں پڑا کہ اپنے آپ کو باطنی رنج وپریشانی سے ہمیشہ کے لئے نجات دے اور زور وزبردستی اوردبائو کے علاوہ کسی اور راستہ سے شیعوں کو اپنے راستہ سے ہٹادے۔

اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جس سیاست کو مامون نے اختیار کیا، وہ یہ تھی کہ اپنا ولی عہد، حضرت امام رضا علیہ السلام کو بنایا تاکہ حضرت کو ناجائز خلافت کے نظام میں داخل کرکے، شیعوں کی نظروں میں آپ کو مشکوک کرکے ان کے ذہنوں سے امام کی عصمت وطہارت کو نکال دے۔ اس صورت میں مقام امامت کے لئے کوئی امتیاز باقی نہ رہتا ،جو شیعوں کے مذہب کا اصول ہے ، اس طرح ان کے مذہب کی بنیادخود بخودنابود ہو جاتی۔

اس سیاست کو عملی جامہ پہنانے میں ایک اور کامیابی بھی تھی وہ یہ کہ،بنی فاطمہ کی طرف سے خلافت بنی عباس کو سرنگوں کرنے کے لئے جو پے درپے تحریکیں سر اٹھارہی تھیں ، ان کو کچل دیا جاتا، کیونکہ جب بنی فاطمی مشاہدہ کرتے کہ خلافت ان میں منتقل ہوچکی ہے ،تو فطری طورپراپنے خونین انقلابوںسے اجتناب کرتے۔ البتہ اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے بعدامام رضاعلیہ السلام کو راستے سے ہٹانے میں مامون کے لئے کوئی حرج نہیں تھا۔

مامون نے حضرت امام رضاعلیہ السلام کو پہلے خلافت قبول کرنے اوراس کے بعدولی عہدی کاعہدہ قبول کرنے کی پیش کش کی۔ امام نے مامون کی طرف سے تاکید، اصرار اور دھمکی کے نتیجہ میں آخرکار اس شرط پر ولی عہدی کو قبول کیاکہ حکومت کے کاموں میں جیسے عزل ونصب میں مداخلت نہیں کریں گے۔

حضرت امام رضا علیہ السلام نے ایسے ماحول میں لوگوں کے افکارکی ہدایت کرنے کاکام سنبھالا اور جہاں تک آپ کے لئے ممکن تھا مختلف مذاہب وادیان کے علماء سے بحثیں کیں اوراسلامی معارف اوردینی حقائق کے بارے میں گراں بہا بیانات فرمائے (مامون بھی مذہبی بحثوںکے بارے میں کافی دلچسپی رکھتا تھا) اسلامی معارف کے اصولوں کے بارے میں جس طرح امیرالمومنین کے بیانات بہت ہیں اوردیگر ائمہ کی نسبت بیش ترہیں۔

حضرت امام رضاعلیہ السلام کی برکتوں میں سے ایک برکت یہ تھی ،کہ آپ کے آباء واجدادکی بہت سی احادیث جو شیعوں کے پاس تھیں ، ان سب کوآپ کی خدمت میں پیش کیا گیا اورآپ کے اشارہ اور تشخیص سے ان میں سے ،دشمنوں کے ناپاک ہاتھوں کی جعل اوروضع کی گئی احادیث کو مشخص کرکے مسترد کیاگیا۔

حضرت امام رضا علیہ السلام نے ولی عہدی کے طور پر جو سفر مدینہ منورہ سے "مرو" تک کیا، اس کے دوران، خاص کر ایران میں عجیب جوش وخروش پیدا ہوا اور لوگ ہر جگہ سے جوق در جوق زیارت کے لئے آپ کی خدمت میں آتے تھے اور شب و روز آپ کے شمع وجود کے گرد پروانہ وار رہتے تھے اور آپ سے دینی معارف و احکام سیکھتے تھے۔

مامون نے جب دیکھا کہ لوگ بے مثال اور حیرت انگیز طور پر حضرت امام رضا علیہ السلام کی طرف متوجہ ہیں تو اس کو اپنی سیاست کے غلط ہونے کا احساس ہوا، اسلئے اس نے اپنی غلط سیاست میں اصلاح کرنے کی غرض سے امام کو زہر دیکر شہید کیا اور اس کے بعد اہل بیت علیہم السلام اور ان کے شیعوں کے بارے میں خلفاء کی اسی پرانی سیاست پر گامزن رہا۔

حضرت امام محمد تقی علیہ السلام

(نویں امام)

حضرت امام علی نقی علیہ السلام

(دسویںامام)

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام

(گیارہویں امام)

ان تین ہستیوں کی زندگی کے حالات مشابہ تھے۔ امام رضا علیہ السلام کی شہادت کے بعد مامون نے آپ کے اکلوتے بیٹے حضرت امام محمد تقی علیہ السلام کو بغداد بلایا اور پیار و محبت سے پیش آیا، اپنی بیٹی سے آپ کی شادی کی اور پورے احترام کے ساتھ اپنے پاس رکھا۔

یہ طرز عمل، اگرچہ دوستانہ دکھائی دیتا تھا، لیکن مامون نے حقیقت میں اس سیاست کے ذریعہ امام علیہ السلام پر ہر لحاظ سے شدید پابندی لگائی تھی۔ حضرت امام علی نقی و حضرت امام حسن عسکری علیہما السلام کا اپنی امامت کے دوران سامرا میں۔ جو ان دنوں دارالخلافہ تھا۔ سکونت کرنا بذات خود ایک قسم کی نظر بندی تھی۔

ان تین اماموں کی امامت کی مدت مجموعی طور پر ۵۷ سال ہے، ان دنوں ایران، عراق اور شام میں رہنے والے شیعوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی تھی اور ان میں ہزاروں رجال حدیث بھی موجود تھے۔ اسکے باوجود ان تین ائمہ علیہم السلام سے منقول احادیث بہت کم ہیں اور ان کی عمریں بھی کم تھیں۔ نویں امام ۲۵ سال کی عمر میں دسویں امام ۴۰ سال کی عمر میں اور گیارہویں امام ۲۷ سال کی عمر میں شہید کئے گئے۔ یہ سب نکات اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ ان کے زمانے میں دشمنوں کی طرف سے ان پر شدید پابندی

تھی اور ان کے کام میں روڑے اٹکائے جاتے تھے، لہذا یہ ائمہ اپنی ذمہ داریوںکو آزادانہ طورپر انجام نہیں دے سکتے تھے ،پھر بھی دین کے اصول اورفروع کے بارے میں ان تین ائمہ سے بعض گراں بہا احادیث نقل ہوئی ہیں ۔

حضرت امام مہدی موعود عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف

(بارہویںامام)

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کے زمانہ میں خلافت کی انتظامیہ نے فیصلہ کیا تھا کہ ہر ممکن وسیلہ اورذریعہ سے حضرت کے جانشین کو نابود کریں ،تا کہ اس کے ذریعہ مسئلہ امامت اور اس کے نتیجہ میں مذہب تشیع کو ختم کردیں ۔حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام پر دوسری پابندیوں کے علاوہ یہ بھی ایک پابندی تھی ۔

اس لحاظ سے امام عصر عجل اللہ تعالی فرجہ الشریف کی پیدائش مخفی رکھی گئی اورآپ (عج) کی چھ سال کی عمر تک آپ (عج) کے پدربزرگوارزندہ تھے ۔آپ (عج) کو لوگوں کی نگاہوںسے پوشیدہ رکھا جاتا تھا اور شیعوں کے چندخاص افراد کے علاوہ آپ (عج) کو کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا ۔

والد گرامی کی شہادت کے بعد حضرت (عج) نے، خدا کے حکم سے غیبت صغری اختیار کی، اوراپنے چارخاص نائبوں کے ذریعہ جو یکے بعد دیگرے آپ (عج) کے نائب مقرر ہوئے تھے، شیعوں کے سوالات کا جواب دیتے تھے اوران کی مشکلات کو حل فرماتے تھے ۔

اس کے بعدسے حضرت(عج)آج تک غیبت کبری میں ہیں ،جب آپ(عج)کوخدا کا حکم ہو گاتو اس وقت ظہور فرماکرزمین کوعدل وانصاف سے بھردیں گے جو ظلم و ستم سے پھرچکی ہوگی ۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حضرت مہدی موعود(عج) اورآپ(عج)کی غیبت وظہور کے بارے میں شیعہ وسنی راویوں نے بے شما احادیث نقل کی ہیں اوراسی طرح شیعوں کی بزرگ شخصیتوں کی ایک بڑی تعدادآپ(عج) کے والد گرامی کی زندگی میں آپ(عج)کی خدمت میں پہنچ کرآپ(عج) کے نورانی جمال کادیدار کرچکی ہے اورآپ(عج) کے والدگرامی سے امامت کی خوش خبری سن چکی ہے۔

اسکے علاوہ نبوت اورامامت کی بحث میں ہم اس نتیجہ پرپہنچے ہیںکہ دنیاہرگز خدااوراس دین کی حفاظت کرنے والے امام سے خالی نہیں رہے گی۔

ائمہ دین کی روش کا اخلاقی نتیجہ

خدا کے انبیاء اور ائمہ دین کے بارے میں جو کچھ تاریخ سے خلاصہ کے طور پر حاصل ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ حقیقت پسند اور حق کے پیرو تھے اور عالم بشریت کو حقیقت پسندی اور حق کی پیروی کرنے کی دعوت دیتے تھے اور اس سلسلے میں ہر قسم کی جاں نثاری اور قربانی دینے سے گریز نہیں کرتے تھے۔

دوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے کہ وہ کوشش کرتے تھے کہ انسان اور انسانی معاشرہ کی کما حقّہ تربیت کریں۔ وہ چاہتے تھے کہ لوگوں پر جاہلانہ یا خرافاتی افکار کی حکمرانی کے بجائے صحیح افکار و عقائد حکم فرما ہوں، اور انسانیت کے پاک دامن کو حیوانی خصلتوں سے داغدار اور آلودہ نہ ہونے دیں درندوں کی طرح ایک دوسرے کو پھاڑنے اور اپنا اپیٹ بھرنے کے بجائے انسانی عادات کو اپنا کر زندگی کے بازار میں انسانیت کا سرمایہ لگا کر انسانیت کے نقد فائدے سے سعادت حاصل کریں۔ یعنی وہ ایسے تھے جو اپنی سعادت نہیں چاہتے تھے مگر معاشرے کی سعادت اور عالم انسانیت کے لئے اس کے علاوہ کسی فریضہ کو تشخیص نہیں دیتے تھے۔

انہوں نے اپنی بھلائی اور سعادت (کہ انسان اس کے علاوہ کوئی چیز نہیں چاہتا ہے) اس میں دیکھی تھی کہ سب کے خیر خواہ ہوں اور چاہتے تھے کہ دوسرے بھی ایسے ہی ہوں، یعنی جو شخص جس چیز کو اپنے لئے پسند کرتا ہے، اسے دوسرے کیلئے پسند کرے اور جس چیز کو اپنے لئے پسند نہیں کرتا ہے اسے دوسروں کے لئے بھی پسند نہ کرے۔

اسی حقیقت بینی اور حق کی پیروی کے نتیجہ میں ان حضرات نے اس عام انسانی فریضہ کی اہمیت "خیر خواہی" اور دیگر جزئی فرائض، جو اس کے فروع ہیں، کا پتہ چلایا ہے اور جاں نثاری و فداکاری جیسے صفات کے مالک بن گئے ہیں اور انہوں نے راہ حق میں جان و مال کی قربانی دینے سے گریز نہیں کیا اور بدخواہی پر مشتمل ہر صفت کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا۔ وہ اپنے مال و جان کے بارے میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ خود پرستی اور کنجوسی سے متنفر تھے، جھوٹ نہیں بولتے تھے، کسی پر تہمت نہیں لگاتے تھے، دوسروں کی عزت اور جان و مال پر تجاوز نہیں کرتے تھے۔ ان صفات کی تفصیلی وضاحت اور آثار کو اخلاق کے حصہ میں ہونا چاہئے۔

ائمہ معصومین علیہم السلام کے اجمالی حالات

پہلے امام

نام: امیرالمومنین حضرت علی بن ابیطالب علیہ السلام

پیدائش: ۲۳سال قبل ہجرت

خلافت: ۳۵ ہجری

شہادت: ٤٠ ہجری

مدت خلافت: تقریباًپانچ سال

مدت عمر: ٦۳سال

دوسرے امام

نام: حسن علیہ السلام

مشہور لقب: مجتبیٰ

کنیت: ابو محمد

والدگرامی: حضرت امیرالمومنین علی بن ابیطالب علیہ السلام

پیدائش: ۳ ہجری

شہادت: ۵٠ ہجری ،معاویہ کے ایماء پر اپنی زوجہ کے ذریعہ
زہرسے شہید کئے گئے۔

مدت عمر: ٤۸سال

مدت امامت: دس سال

تیسرے امام

نام : حسین علیہ السلام

لقب: سید الشہدائ

کنیت: ابو عبد اللہ

والدگرامی : حضرت امیرالمومنین علی بن ابیطالب علیہ السلام

پیدائش: ٤ ہجری

شہادت: ٦١ ہجری ،یزیدبن معاویہ کے حکم سے شہید کئے گئے۔

مدت عمر: ٥٧ سال

مدت امامت: دس سال

چوتھے امام

نام: علی علیہ السلام

لقب: سجاد اور زین العابدین

کنیت: ابو محمد

والدگرامی: حضرت امام حسین علیہ السلام

پیدائش: ٣٨ ہجری

شہادت: ٩٤ ہجری میں ہشام بن عبدالملک کے حکم سے
زہر دیا گیا۔

مدت عمر: ٦٦ سال

مدت امامت: ٣٥ سال

پانچویں امام

نام : محمد علیہ السلام

لقب: باقر

کنیت: ابو جعفر

والدگرامی: حضرت امام سجاد علیہ السلام

پیدائش: ۵۸ ہجری

شہادت: ۱۱۷ ہجری میں ابراہیم بن ولید کے حکم سے زہر دیا گیا۔

مدت عمر: ۵۹ سال

مدت امامت: ۲۳ سال

چھٹے امام

نام: جعفر علیہ السلام

لقب: صادق

کنیت: ابو عبد اللہ

والدگرامی: حضرت امام محمد باقر علیہ السلام

پیدائش: ۸۰ ہجری

شہادت: ۱۴۸ ہجری میں منصور عباسی کے حکم سے زہر دیا گیا

مدت عمر: ۶۸ سال

مدت امامت: ۳۱ سال

ساتویں امام

نام: موسی علیہ السلام

لقب: کاظم

کنیت: ابو الحسن

والدگرامی: حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام

پیدائش: ۱۲۸ ہجری

شہادت: ۱۸۲ ہجری

مدت عمر: ٥٤سال

مدت امامت: ۳٥سال

آٹھویں امام

نام: علی علیہ السلام

لقب: رضا

کنیت: ابوالحسن

والدگرامی: حضرت امام موسی کاظم علیہ السلام

پیدائش: ۱٤۸ ہجری

شہادت: ۲۰۳ ہجری میں مامون عباسی کے ہاتھوں زہر سے شہید کئے گئے

مدت عمر: ٥٥سال

مدت امامت: ۲۱سال

نویں امام

نام: محمد علیہ السلام

لقب: تقی اورجواد

کنیت: ابو جعفر

والدگرامی: حضرت امام رضا علیہ السلام

پیدائش: ۱۹٥ ہجری

شہادت: ۲۲۰ ہجری میں معتصم عباسی کے ایماپر اپنی زوجہ کے ہاتھوں زہر سے شہید کئے گئے

مدت عمر: ۲٥سال

مدت امامت: ١٧ سال

دسویں امام

نام: علی علیہ السلام

لقب: ہادی ونقی

کنیت: ابوالحسن

والدگرامی: حضرت امام محمدتقی علیہ السلام

پیدائش: ٢١٤ ہجری

شہادت: ٢٥٤ ہجری

مدت عمر: ٤٠ سال

مدت امامت: ٣٤سال

گیارہویں امام

نام: حسن علیہ السلام

لقب: عسکری

کنیت: ابومحمد

والدگرامی: حضرت امام علی نقی علیہ السلام

پیدائش: ٢٣٢ ہجری

شہادت: ٢٦٠ ہجری

مدت عمر: ٢٨ سال

مدت امامت: ٧سال

بارہویں امام

نام: م ح م د علیہ السلام

لقب: ہادی اور مہدی

کنیت: ابو القاسم

والدگرامی: حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام

پیدائش: ۲۵۶ ہجری

آپ خدا کے حکم سے نظروں سے غائب ہیں، جس دن خدا چاہے گا ظہور فرما کر دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔

اخلاق واحکام کے چند سبق

۱۔اخلاق کے چند سبق

۲۔احکام کے چند سبق

۱۔اخلاق کے چند سبق

جیسا کہ معلوم ہوا،دین مقدس اسلام ایک ایسا عام اور لافانی نظام ہے،جسے خدائے متعال نے انسان کی دنیوی واخروی زندگی کے لئے خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پرنازل فرمایا ہے ،تاکہ انسانی معاشرے میں نافذ ہوجائے،اورانسانیت کی کشتی کو جہالت وبدبختی کے بھنور سے نکال کر نجات کے ساحل پر لگادے۔

چونکہ دین،زندگی کا نظام ہے ، لہٰذاضروری ہے کہ زندگی سے مربوط چیزوں کے بارے میں انسان کے لئے ایک فریضہ کومعین کرے اور اس کے انجام کو انسان سے طلب کرے۔کلی طورپر ہماری زندگی تین امور سے مربوط ہے :

۱۔خدائے متعال سے ،کہ ہم اسکی مخلوق ہیں ،اسکی نعمت کاحق ہرحق سے زیادہ ہے اوراس کی ذات اقدس کے بارے میں فرض شناسی ہرواجب سے زیادہ واجب ہے۔

۲۔زندگی کارابطہ خودہمارے ساتھ۔

۳۔اپنے ہم جنسوں سے رابطہ،ہم اپنے ہم جنسوئکے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور ہیں تاکہ اپنے کاروکوشش کوان کے تعاون اورمدد سے انجام دیں۔اس بناپر، ہم قاعدے کے مطابق کلی طورپرتین فرائض رکھتے ہیں :

الف:خداکے بارے میں فریضہ۔

ب:اپنے بارے میں فریضہ۔

ج:دوسروں کے بارے میں فریضہ۔

خدا کے بارے میں انسان کافریضہ

خدا کے بارے میں ہمارا فریضہ،اہم ترین فریضہ ہے۔اس کو انجام دینے میں ہمیں پاک دل اورخالص نیت سے کوشش کرنی چاہیئے۔سب سے پہلے انسانی فریضہ یہ ہے کہ اپنے پروردگار کو پہچانے،کیونکہ خدائے متعال کا وجود،ہر مخلوق کے وجود کاسرچشمہ ہے

اور ہر وجود و حقیقت کا خالق ہے۔اس کے مقدس وجود کی معرفت اور اس کا علم ہر حقیقت بیں نگاہ کے لئے روشنی ہے ۔اس حقیقت سے بے اعتنائی اوردوری ،ہر قسم کی جہالت ،بے بصیرتی اور فریضہ کے نہ جاننے کا سر چشمہ ہے۔جو شخص حق کی معرفت سے بے اعتنائی کرے اور نتیجہ میں اپنے ضمیر کے روشن چراغ کو بجھادے،تو اس کے لئے حقیقی انسانی سعادت کو حاصل کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

چنانچہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں ،جو لوگ خدا شناسی سے رو گردانی کرتے ہیں اور اپنی زندگی میں اس حقیقت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ،وہ انسانی معنویات سے کلی طور پر دور ہیں اور ان کی منطق چوپایوں اور درندوں کی منطق ہے خدائے متعال اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے:

(فعرض عن مّن تولّی عن ذکرنا ولم یرد الاّ الحیوة الدنیا٭ذلک مبلغهم من العلم) ...)(نجم ۳۰۲۹)

"لہذا جو شخص بھی ہمارے ذکر سے منہ پھیرے اور زندگانی دنیا کے علاوہ کچھ نہ چاہے،آپ بھی اس سے کنارہ کش ہو جائیں،یہی ان کے علم کی انتہا ہے۔"

البتہ یہ یاددہانی ضروری ہے کہ،خدا شناسی ،انسان کے لئے۔جو ایک حقیقت بین اور استدلالی فطرت والی مخلوق ہے۔اضطراری اور قہری ہے،کیونکہ وہ اپنے خداداد شعور سے خلقت کے جس شئے پر بھی نگاہ کرتا ہے ،خالق کائنات کے وجوداور اس کے علم وقدرت کے آثار کا مشاہدہ کرتا ہے۔اس بناپر خدا شناسی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان نے خدا شناسی کو اپنے لئے ایجادکیا ہے،بلکہ مقصد یہ ہے کہ انسان اس واضح حقیقت کو ،کہ جس پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا ،بے اعتنائی کی نگاہ سے نہ دیکھے اوراپنے ضمیر کو،جو اسے ہر وقت خدا کی طرف دعوت دیتا ہے ،مثبت جواب دے اوراس معرفت کی تحقیق کر کے ہر قسم کے شک وشبہہ کواپنے دل سے نکال دے۔

خدا پرستی

خدا شناسی کے بعدہمارادوسرافریضہ خداپرستی ہے،کیونکہ حق کی معرفت کے ضمن میں یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ سعادت وخوشبختی۔جوہمارا تنہا مقصدہے۔ایک ایسے پروگرام پر عمل کرنے اورا سے نافذ کرنے میں پوشیدہ ہے،جسے خدائے متعال نے ہماری زندگی کے لئے معین فرمایا ہے اور اسے اپنے انبیاء کے ذریعہ ہم تک پہنچایا ہے ،پس خدائے متعال کے حکم کی اطاعت اور اسکی بندگی ایسافریضہ ہے کہ جس کے مقابلہ میں ہر فریضہ ناچیز اور حقیر ہے۔خدائے متعال فرماتا ہے :

(وقضی ربّک الاّ تعبدوا الاّ ایّاه) ـ..)(اسرائ۲۳)

"اور آپ کے پروردگار کا فیصلہ ہے کہ تم اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرنا..."

(الم اعهد اليكم يابنی آدم ان لّا تعبدواالشّیطن انّه لکم عدوّ مبین*وان اعبدونی هذا صراط مّستقیم) (نسائ۵۹)

"اولاد آدم !کیا ہم نے تم سے اس بات کا عہد نہیں لیا تھا کہ خبردار شیطان کی عبادت نہ کرناکہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے ۰اور میری عبادت کرنا کہ یہی صراط مستقیم اور سیدھا راستہ ہے"

اس بناپر، ہمارا فریضہ ہے کہ مقام بندگی اور اپنی ضرورت کو پہچانیں اور خدائے متعال کی لا محدود عظمت و کبریائی کو مد نظر رکھیں اور اس کو ہر جہت سے اپنے اوپر مسلط جان کر اس کے فرمان کی اطاعت کریں ۔ہم پر واجب ہے کہ خدائے متعال کے سوا کسی اورکی پرستش نہ کریں اور پیغمبر گرامی ﷺ اور ائمہ ھدی ۔کہ خدائے متعال نے ہمیں ان کی اطاعت کا حکم دیا ہے ۔کے علاوہ کسی اور کی اطاعت نہ کریں۔خدائے متعال فرماتا ہے :

(...(اطیعوااللہ واطیعواالرّسول واولی الامر منکم) ـ..)

(نسائ۵۹)

"...اللہ کی اطاعت کرو ،رسول اور صاحبان امر(ائمہ)کی اطاعت کرو"

البتہ،خدائے متعال اوراولیائے دین کی اطاعت کے اثر میں ، عملًا خدا سے منسوب ہر چیز کا مکمل احترام کرناچاہیئے ۔خدااوراولیائے دین کے نام کو ادب کے ساتھ لینا چاہیئے۔ خداکی کتاب (قرآن مجید)،کعبہ شریف،مساجد اوراولیائے دین کی قبور کا احترام کرنا چاہیئے ،چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے:

(...(ومن یعظِّم شعائر اللہ فانّھا من تقوی) (حج۳۲)

"جوبھی اللہ کی نشانیوں کی تعظیم کرے گا یہ تعظیم اس کے دل کے تقوی کا نتیجہ ہوگی."

اپنے بارے میں انسان کافریضہ

انسان ، اپنی زندگی میں جو بھی روش اختیار کرے اور جس راستہ پر چلے، حقیقت میں وہ اپنے لئے سعادت و کامیابی کے علاوہ کوئی چیز نہیں چاہتا ۔چونکہ سعادت کوپہچاننا، کسی اورچیز کی پہچاننے کے ضمن میں ہے ،یعنی جب تک ہم خود کو نہ پہچانیں گے اس وقت تک اپنی حقیقی ضرورتوں ۔کہ ان کوپورا کرنے میں ہماری سعادت ہے۔کو بھی نہیں پہچان سکیں گے ۔اس بناپر انسان کا سب سے اہم فریضہ یہ ہے کہ خود کو پہچان لے تاکہ اس کے سبب اپنی سعادت و خوشبختی کو سمجھے اور اپنے پاس موجود وسائل کے ذریعہ اپنی ضرورتوں کودور کرنے کی کوشش کرے اوراپنی گرانبہا عمر،جواسکا تنہا سرمایہ ہے،کومفت میں ضائع نہ ہونے دے ۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :

"جس نے اپنے آپ کوپہچان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا ہے"[1]

امیر المؤ منین حضرت علی فرماتے ہیں :

"جس نے اپنے آپ کوپہچان لیا، وہ معرفت کے بلند ترین مقام پر پہنچ گیا "[2]

انسان، اپنے آپ کوپہچاننے کے بعد متوجہ ہوتا ہے کہ اس کاسب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ وہ گوہرانسانیت کی قدر کرے ۔

اس گوہرتابناک کو ہوا وہوس کے ذریعہ پامال نہ کرے ، اپنی ظاہری و باطنی صفائی کے لئے کوشش کرے تاکہ ایک شیرین ، لذت بخش اورابدی زندگی کو حاصل کرسکے ۔

امیر المؤ منین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

"جو شخص اپنا احترام کرے گا ، اسکے سامنے نفسانی خواہشات حقیراورناچیز ہوں گی۔"[3]

انسانی وجود دوچیزوں کامرکّب ہے :"روح اوربدن"انسان کا فریضہ ہے کہ ان دونوں ارکان کی صحت واستحکام کے لئے کوشش کرے اوراسلام کے مقدس دین میں دونوں حصوں کے بارے میں بیان کئے گئے مفصل اورکافی احکام کے مطابق بدن اور روح کی صفائی کی کوشش کرے۔

بدن کی صفائی

دین مقدس اسلام نے کچھ قوانین و ضوابط کے ضمن میں ،جسمانی صفائی کی کافی تاکید کی ہے، جیسے :خون ،مردار ،بعض حیوانوں کا گوشت اورزہریلی غذائوں کو کھانے سے منع کی ہے ۔شراب نوشی ، نجس پانی پینے ،پُرخوری ، اوربدن کو ضرر پہنچانے کی نہی کی ہے اس کے علاوہ دوسرے احکامات ہیں کہ اس فصل میں ان سب کی تفصیل بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے ،خلاصہ کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اسلام نے انسان کو تمام نقصان دہ چیزوں سے پرہیز کرنے کا حکم دیا ہے ۔

صفائی کا خیال

صفائی، حفظان صحت کے اہم اصولوں میں سے ایک اصول ہے، اسی لئے دین اسلام میں اس اصول کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔جو اہمیت اسلام میں صفائی کو دی گئی ہے ، کسی اوردین میں نہیں پائی جاتی ہے۔پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے :

"النظافة من الايمان"[4]

"صفائی ایمان کاحصہ ہے"

اسکے علاوہ اسلام عام طورپر صفائی اورپاکیزگی کا حکم دیتا ہے ، بالخصوص ہرایک کے لئے صفائی کی نصیحت کرتا ہے ، جیسے :ہاتھ پائوں کے ناخن کاٹنا ،سراوربدن کے زائد بالوں کو صاف کرنا ،کھانا کھانے سے پہلے اوربعد میں ہاتھوں کو دھونا ،بالوںکو کنگی کرنا، کلی

کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا ،دن میں کئی بار مسواک کرنا ،گھر کو جھاڑو کرنا،راستوں ، گھر کے دروازوں اور درختوں وغیرہ کے نیچے کوصاف ستھرا رکھنا۔

اسکے علاوہ اسلام نے بعض عبادتوں کا حکم دیا ہے کہ جن کا تعلق صفائی وپاکیزگی وغیرہ سے ہے ، جیسے: لباس اور بدن کو نجاستوں سے پاک کرنا،دن میں کئی مرتبہ نماز کے لئے وضو کرنا اور نمازو روزہ کے لئے مختلف غسل کرنا۔

کُلّی اور مسواک

انسان منہ سے کھاناکھاتا ہے اور کھانا کھانے کی وجہ سے منہ آلودہ ہوتا ہے،دانتوں کے درمیان ،زبان پر اور منہ کی دوسری جگہوں پر کھانے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے رہ جاتے ہیں، اس لئے منہ کے اندر بدبو پیدا ہوجاتی ہے اور بعض اوقات کھانے کے ٹکڑوں میں کیمیائی عمل ورد عمل اور خمیر ہونے کی وجہ سے زہریلے مواد وجود میں آتے ہیں اور کھانے کے ساتھ مل کر معدے میں جاتے ہیں۔

اسکے علاوہ ایسا شخص لوگوں کے مجمع میں سانس لیکر بدبو پھیلاتا ہے اور دوسروں کو اذیت پہنچاتا ہے ۔

اس لئے شرع مقدس اسلام نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ ہر دن (خاص کرہر وضو سے پہلے) اپنے دانتوں کو مسواک کریں اورصاف پانی سے کلّی کریں اوراپنے منہ کوآلودگی سے پاک کریں۔

استنشاق(ناک میں پانی ڈالنا)

سانس لینا، انسان کی ضروریات زندگی میں سے ہے اور غالباًجو ہواانسان کے رہنے کی جگہ پر ہوتی ہے ، گردوغبار اور کثافت سے خالی نہیں ہوتی ، البتہ ایسی ہوامیں سانس لینا نظام تنفس کے لئے مضر ہے ۔اس ضرر کو روکنے کے لئے خدائے مہربان نے ناک کے اندر کچھ ایسے بال اگائے ہیں جو گرد وغبار کو پھیپھڑوں تک پہنچنے نہیں دیتے ،اس کے باوجود کبھی گرد وغبارناک کے اندر جمع ہو جا تا ہے جس کی وجہ سے ناک کے بال اپنی ذمہ داری نبھانے سے قاصر رہتے ہیں ۔اسلئے دین اسلام میں حکم دیاگیاہے کہ مسلمان دن میں کئی باروضو سے پہلے ناک میں پانی ڈالیں اور اپنی ناک میں صاف پانی ڈال کراپنے تنفس سے مربوط حفظان صحت کی رعایت کریں ۔

۱۔بحارالانوار،ج۶۱،ص۹۹۔

2۔غررالحکم،ج۲ص۱۲۸۷ص۶۹۸۔

3۔غررالحکم ،ج۲،ص۶۸۱،ح۱۱۰۹۔

4۔نہج الفصاحہ،ح۳۱۶۱،ص۶۳۶۔

تہذیب اخلاق

انسان، اپنے خداداد ضمیر سے پسندیدہ اخلاق کی قدرو قیمت کو سمجھتا ہے اور اسکی انفرادی واجتماعی اہمیت کو جان لیتا ہے ۔لہذا انسانی معاشرے میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے کہ جوپسندیدہ اخلاق کی تعریف اور پسندیدہ اخلاق رکھنے والے شخص کا احترام نہ کرے ۔

جواہمیت انسان پسندیدہ اخلاق کو دیتاہے وہ محتاج تعارف وبیان نہیںہے اوراسلام میں اخلاق کے بارے میں جو وسیع احکام بیان ہوئے ہیں وہ سب واضح ہیں ۔خدائے متعال فرماتا ہے :

(ونفس وماسوّٰ ھاۭفَلھَمَھافجورَھاوتقوٰھاۭقد افلح من زکّٰھاۭوقد خاب من دسّٰھا) (شمس۷۔۱۰)

"اورنفس کی قسم اور اس خداکی قسم جس نے اسے درست کیاہے .پھربدی اور تقویٰ کی ہدایت دی ہے .بیشک وہ کامیاب ہوگیاجس نے نفس کوپاکیزہ بنالیا۔اوروہ نامراد ہوگیا جس نے اسے آلودہ کردیاہے "

حصول علم

پسندیدہ معنوی صفات میں سے ایک علم ہے اورعالم کی جاہل پر فضیلت وبرتری اظہر من الشمس ہے ۔

جو چیز انسان کودوسرے حیوانات سے جدا کرتی ہے ،بیشک وہ عقل کی طاقت اور علم کا زیور ہے۔دوسرے حیوانات میں سے ہر ایک اپنی خاص بناوٹ کے مطابق ناقابل تغیر فطرت رکھتاہے اوریکساں صورت میں اپنی زندگی کی ضرورتوں کوپورا کرتا ہے اور اس کی زندگی میں ہرگزکسی قسم کی ترقی اور بلندی کی کوئی امید نہیں پائی جاتی .وہ اپنے اوردوسروں کے لئے کوئی نیا باب نہیں کھول سکتے ہیں یہ صرف انسان ہے جو عقل کی طاقت سے،ہرروز اپنے گزشتہ معلومات میں جدید معلومات کااضافہ کرتاہے اور طبیعت اورمادرای طبیعت کے قوانین کوکشف کرکے ہرزمانہ میں اپنی مادی اور معنوی زندگی کوتازگی اوررونق بخشتا ہے،اپنے ماضی کے ادوار پرنظرڈال کراپنے اوردوسروں کے مستقبل کی بنیاد ڈالتا ہے ۔

اسلام نے علم حاصل کرنے کے سلسلہ میں اس قدرتاکید کی ہے کہ پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :

"علم حاصل کرناہر مسلمان پر واجب ہے "[1]

"علم حاصل کرو،اگرچہ چین میں بھی ہو"[2]

"گہوارہ سے قبرتک علم حاصل کرنیکی کوشش کرو"[3]

اسلام، خلقت کے اسرار کو جاننے اور آسمانوں، زمین، انسان کی فطرت، تاریخ وملل اور اپنے اسلاف کے آثار (فلسفہ، علوم ریاضی وطبیعی وغیرہ) کے بارے میں غور وخوض کرنے کی بہت تاکید کرتا ہے اور اسی طرح اخلاقی اور شرعی مسائل (اسلامی اخلاق وقوانین) اور صنائع کے اقسام۔ جو انسان کی زندگی کو منظّم کرتے ہیں۔ کو سیکھنے کی اسلام بہت ترغیب دیتا اور تاکید کرتا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر میں علم کی اہمیت اس قدر ہے کہ جنگ بدر میں جب کفار کی ایک جماعت مسلمانوں کے ہاتھوں اسیر ہوگئی، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ اسیروں میں سے ہر فرد زیادہ رقومات ادا کرکے آزاد ہوسکتا ہے، لیکن اسیروں میں جو افراد تعلیم یافتہ تھے وہ یہ رقومات ادا کرنے سے اس شرط پر مستثنیٰ قرار دیئے گئے کہ ان میں سے ہر ایک دس جوان مسلمانوں کو لکھناپڑھنا سکھائے۔

اسلام کی نظر میں طالب علم کی اہمیت

ہر مقصد تک پہنچنے کے لئے سعی وکوشش کی اہمیت خوداس مقصدکی اہمیت کے برابر ہوتی ہے اور چونکہ ہر انسان اپنی خداداد فطرت سے عالم بشریت میں علم ودانش کو ہر چیز سے بالاتر جانتا ہے، لہذا طالب علم کی قدرو قیمت بالاترین قدرو قیمت ہوگی اس چیز کے پیش نظر کہ اسلام ایسادین ہے کہ جو فطرت کی بنیادوں پر مستحکم واستوار ہے لہذا بلاشبہہ طالب علم کی سب سے زیادہ قدرو قیمت کا قائل ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"جو علم حاصل کرنے کی راہ میں ہو، وہ خدا کا محبوب ہے "[(5)]

اس کے باوجود کہ جہاد، دین کی بنیادوں میں سے ایک بنیاد ہے اور اگر پیغمبر ﷺ یا امام حکم جہاد دیدیں تو عام مسلمانوں کا جنگ میں شریک ہونا ضروری ہوجاتا ہے، لیکن جو لوگ دینی تعلیم حاصل کررہے ہیں وہ اس حکم سے مستثنیٰ اور معاف ہیں۔ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو ہمیشہ علمی مراکز میں تعلیم حاصل کرنے میں مشغول رہنا چاہیئے۔ خدائے متعال فرماتا ہے:

(وما كان المؤمنون لينفروا كآفّةً فلولا نفر من كلّ فرقة منهم طائفة ليتفقّهوا فى الدّين ولينذروا قو مهم اذا رجعوااليهم لعلّهم يحذرون) (توبہ۱۲۲)

"صاحبان ایمان کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ سب کے سب جہاد کے لئے نکل پڑیں تو ہر گروہ میں سے ایک جماعت اس کام کے لئے کیوں نہیں نکلتی ہے کہ دین کا علم حاصل کرے اور پھر جب اپنی قوم کی طرف پلٹ کر آئے تو اسے عذاب الہی سے ڈرائے کہ شاید وہ اسطرح ڈرنے لگیں۔"

معلم اور مربی کی اہمیت

علم اور طالب علم کے بارے میں مذکورہ بیان سے اسلام میں معلم کی بھی اہمیت واضح ہوجاتی ہے ۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"من تعلّمت منه حر فا صرت له عبدا"[6]

"جومجھے ایک کلمہ تعلیم دیدے میں خود کو اس کا بندہ قراردوں گا"

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

"لوگوں کے تین گروہ ہیں :پہلا:عالم ربانی دوسرا:جواپنی اوردوسروں کی نجات کے لئے علم حاصل کرتا ہے ۔تیسرا:وہ لوگ جو عقل ودانش سے عاری ہوتے ہیں ان لوگوں کی مثال اس مکھی کی سی ہے جو جانوروں کے سر وصورت پر بیٹھتی ہے اورہوا کے چلنے پر ادھر ادھر اڑتی ہے یاجہاں سے بھی بدبو آتی ہے اسکی طرف دوڑتی ہے"۔

معلم اور شاگرد کا فریضہ

قرآن مجید، علم ودانش کو انسان کی حقیقی زندگی جانتا ہے ،کیونکہ اگر علم نہ ہوتاتوانسان اورجمادات اورمردوں میں کوئی فرق نہ ہوتا۔

اس بناپر، طالب علم کو چاہیئے کہ اپنے معلم کو زندگی کا مرکز تصور کرے تاکہ تدریجاً اپنی حقیقی زندگی کو اس سے حاصل کرسکے ،اس لحاظ سے اسے یہ تصور کرناچاہیئے کہ اس کے توسط سے اسے زندگی ملی ہے اس لئے اس کی عزت و تعظیم میں کوتاہی نہ کرے اوراگر تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں اس کی طرف سے اگر سختی بھی دکھائی دے تو اس کی زندگی اورموت کے بعد اس کے احترام میں کوتاہی نہ کرے ۔

اسی طرح معلّم کوبھی اپنے آپ کواپنے شاگرد کی زندگی کا ذمہ دار سمجھنا چاہیئے اورجب تک اسے ایک زندہ انسان اور فخرومباہات کے درجہ تک نہ پہنچا دے اس وقت تھکن محسوس نہ کرے اورآرام سے نہ بیٹھے۔

اگر کبھی اس کاشاگرد تعلیم وتربیت حاصل کرنے میں کوتاہی کرے تواستاد کاحوصلہ پست نہیں ہونا چاہیئے ،اگر وہ تعلیم وتربیت میں ترقی کا مظاہرہ کرے تواس کی ہمت افزائی کرنی چاہیئے،اگرلاپروائی کرے تواس کی حوصلہ افزائی کر کے اس میں شوق پیدا کرنا چاہیئے اور شاگرد کے جذبات کوہرگز اپنے طرز عمل سے مجروح نہ کرے ۔

ماں باپ کے بارے میں انسان کا فریضہ

ماں باپ اپنے فرزندکی پیدائش کا ذریعہ اوراس کے ابتدائی مربی ہیں اس سبب سے دین مقدس اسلام میں سب سے اہم نصیحت وتاکید ماں باپ کی اطاعت اوراحترام کے بارے میں کی گئی ہے ،یہاں تک کہ خدائے متعال توحید کے ذکر کے بعد والدین کے ساتھ نیکی کی نصیحت کرتے ہوئے فرماتا ہے :

(وقضی ربُّک اَلّا تعبدوااِلّا ایّاہ وبالوالدین احسٰناً) ...)

(اسرائ۲۳)

"اور آپ کے پروردگار کا فیصلہ ہے کہ تم سب اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرنا اورماں باپ کے ساتھ اچھا برتائو کرنا ..."

جن روایتوں میں گناہان کبیرہ کو گنوایا گیا ہے ان میں شرک کے بعدوالدین کے ساتھ برے برتائو کو گناہ کبیرہ شمار کیا گیا ہے .خدائے متعال مذکورہ آیہ شریفہ کے ضمن میں بھی فرماتا ہے :

(...(اِمّا یبَلغنَّ عندک الکبر احدھما اوکلاھمافلا تُقل لَّھمااُفٍّ ولا تنھرھما و قل لھما قولاً کریمًاواخفِض لھما جناح الذُّلّ من الَّرحمۃ) ...)(اسرائ۲۳۲٤)

"...اور اگرتمہارے سامنے ان دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوںبوڑھے ہوجائیں توخبرداران سے اف بھی نہ کہنا اور جھڑکنا بھی نہیں اوران سے ہمیشہ شریفانہ گفتگو کرتے رہنا ، اور ان کے لئے خاکساری کے ساتھ اپنے کندھوں کو جھکادینا۔"

چہ خوش گفت زالی بہ فرزند خویش

چو دیدش پلنگ افکن وپیل تن

گر از عہد خردیت یاد آمدی

کہ بیچارہ بودی درآغوش من

نہ کردی در این روز بر من جفا

کہ تو شیر مردی و من پیر زن

"کیاخوب کہا ہے ایک بوڑھیا نے اپنے بیٹے سے جب اس کو ایک طاقتور شیر اورہاتھی کے مانندديکھا اگرتجھے وہ اپنا بچپن یاد آتاجب کہ تم میری آغوش میں ایک بیچارہ طفل تھے؟توآج تم مجھ پریہ ظلم نہ کرتے کہ تم ایک شیرمردبن چکے ہو اورمیں ایک بوڑھی عورت ہوں۔"

دین مقدس اسلام میں، ماں باپ کی اطاعت، واجب کے ترک ہونے یا حرام میں مرتکب ہونے کے علاوہ، واجب ہے، اور تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ جن لوگوں نے اپنے ماں باپ کو رنج و تکلیف پہنچائی ہے، وہ اپنی زندگی میں خوشبخت اور کامیاب وکامران نہیں ہوئے ہیں ۔

بزرگوں کا احترام

بوڑھوں کا احترام بھی لازم ہے ۔چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے :

"بوڑھوں کا احترام اور تعظیم کرنا خدا کی تعظیم اور احترام کرنا ہے "[7]

اپنے رشتہ داروںکے بارے میں انسان کا فریضہ

انسان کے ماں باپ کے ذریعہ جو رشتہ دار نسبی رابطہ رکھتے ہیں، وہ طبیعی خاندان کو تشکیل دینے کا سبب بنتے ہیں اور خونی رشتہ اور انسانی خلیوں کے اشتراک کی وجہ سے انسان کو خاندان کا جزو قرار دیتے ہیں ۔ اس طبیعی اتحاد اور ارتباط کی وجہ سے اسلام نے اپنے پیروئوں کو صلہ ء رحم کا حکم دیا ہے اور قرآن مجید اور ائمہ دین کی روایتوں میں اس سلسلہ میں بہت ہی تاکید کی گئی ہے ۔ خدائے متعال فرماتا ہے:

(...وَاتّقوااللہ الّذی تسا ئلون به وَالارحام ان اللہ کان علیکم رقیباً) (نسائ١)

"اور اس خدا سے بھی ڈرو جس کے ذریعہ ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور قرابت داروںکی بے تعلقی سے بھی ۔ اللہ سب کے اعمال کا نگراں ہے ۔"

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :

"میں اپنی امت کو صلہ ء رحم کی نصیحت کرتا ہوں اور اگر رشتہ داروں کے درمیان ایک سال کی دوری کا فاصلہ ہو تو بھی اپنے رشتہ کے پیوند کو نہ توڑیں ۔"[8]

ہمسایوں کے بارے میں انسان کا فریضہ

چونکہ ہمسایہ زندگی بسر کرنے کی جگہ پر ایک دوسرے سے نزدیک ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے زیادہ رابطہ رکھتے ہیں اور گویا ایک بڑے خاندان کے حکم میں ہوتے ہیں لہذا ان میں سے کسی ایک کا اچھا اور برا طرز عمل ہمسایوں پر دوسروں کی نسبت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے ۔

جورات کو اپنے گھر میں صبح ہونے تک شور و غل مچاتا ہے ،وہ شہر کے آخر میں رہنے والوں کوتکلیف نہیں پہنچاتا ہے ، لیکن اپنے ہمسایہ کے آرام وآسائش میں خلل ڈالتا ہے ۔

جو مالدار اپنے خوب صورت محل میں عیش وعشرت میں زندگی گزار رہا ہے،دور رہنے والے مفلسوں کی نگاہوں سے دور ہے ،لیکن ہر لحہ اپنے ایک تنگ دست اور غریب ہمسایہ کی جھونپڑی میں اُگے ہوئے ایک پھول کے پودے کو آگ لگاتا ہے ،تو یقینا ایک دن ایسا آئے گا جب وہ اپنے کیفر کردار تک پہنچ جائے گا ۔اس لحاظ سے دین مقدس اسلام میں ہمسایہ کے حالات کی رعایت کرنے کی بہت تاکید کی گئی ہے ۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :

"جبرئیل امین نے ہمسایہ کے بارے میں اس قدرمجھے نصیحت کی کہ مجھے گمان ہونے لگاکہ خدائے متعال ہمسایہ کو وارثوں میں قرار دے گا "[(9)]

نیزفرمایا:

"جو شخص اپنے ہمسایہ کو تکلیف پہنچائے گا ، اس تک بہشت کی خوشبو نہیں پہنچے گی ۔جو اپنے ہمسایوں کے حق کی رعایت نہیں کرے گا ، وہ ہم میں سے نہیں ہے، اور جو سیر ہوگا اور وہ جانتا ہو اس کا ہمسایہ بھوکا ہے اور اسے کچھ نہ دے تو وہ مسلمان نہیںہے ۔"[(10)]

ماتحتوں اور بیچاروں کے بارے میں انسان کا فریضہ

بیشک معاشرے کی تشکیل لوگوں کی ضرورتوں کوپورا کرنے کے لئے ہوتی ہے اور ایک معاشرے کے افراد کا سب سے اہم فریضہ یہ ہے کہ محتاجوں اور بے چاروں کی دستگیری کریں اور جو لوگ اپنی زندگی کی ضروریات کوپوراکرنے کی طاقت نہیں رکھتے ہیں ،کسی نہ کسی طرح ان کی مدد کرکے ان کی مشکلات کو حل کرے ۔

آج تو یہ مسئلہ واضح ہوچکا ہے کہ مالداروں کے مفلس ونادار افراد کی طرف توجہ نہ کرنے کی وجہ سے ایسا بڑا خطرہ لاحق ہے کہ ،جو معاشرے کو نابود کرسکتا ہے اورسب سے پہلے مالدار ہی اس خطرے کے شکار ہوں گے۔

اسلام نے اس خطرہ کے پیش نظرچودہ سوسال پہلے ہی حکم دیا ہے ،کہ مالداروں کو اپنی آمدنی کے ایک حصہ کو ہر سال کمزوروں اور حاجتمندوں میں تقسیم کرنا چاہئے اور اگراس سے ان کی ضرورت پوری نہ ہو سکے تو مستحب ہے کہ غریبوں کی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے جتنا ممکن ہوسکے راہ خدا میں انفاق کریں ۔

خدائے متعال فرماتا ہے :

(لن تنالواالبرّ حتّٰی تنفقوا مِمّاتُحِبّون) ...)(آل عمران ۹۲)

"تم نیکی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتے جب تک اپنی محبوب چیزوں سے راہ خدا میں انفاق نہ کرو"

لوگوں کی خدمت و مدد کے بارے میں نقل کی گئی حدیثیں بے شمار ہیں۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :

"خیرالنّاس انفعهم للنّاس"[11]

"لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو سب سے زیادہ لوگوں کے لئے فائدہ مند ہو۔"

نیز فرماتے ہیں :

"قیامت کے دن خدا کے نزدیک اس شخص کا مقام سب سے بلند ہو گا جو خدا کے بندوں کی حاجت روائی کی راہ میں سب سے زیادہ اقدام کرے۔"[12]

در بلا یار باش یاران را

تا کند فضل ایزدت یاری

به همه حال بدروی روزی

تخم نیکی که این زمان کاری

معاشرے کے بارے میں انسان کا فریضہ

چنانچہ ہم جانتے ہیں کہ لوگ ایک دوسرے کی مدد سے کام کرتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں ایک دوسرے کے کام و کوشش سے استفادہ کرتے ہیں اور اپنی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں ۔ان افراد سے تشکیل پانے والا معاشرہ ایک بڑے انسان کے مانند ہے اور تمام افراد اس بڑے انسان کے اعضاء کے مانند ہیں ۔

انسان کے بدن کا ہر عضو، اپنے مخصوص کام کو انجام دیتا ہے اور اپنے کام کے نفع کے علاوہ دوسرے اعضاء کے منافع سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے ،یعنی اپنی سرگرمی کی حالت میں اپنے نفع کو دوسرے اعضاء کے منافع کے ضمن میں حاصل کرتا ہے اوردوسروں کی زندگی کے سائے میں اپنی زندگی کو جاری رکھتا ہے ۔اگر سارے اعضاء خود غرض ہوتے اور دوسروں کے کام نہ آتے، مثلا جہاںپرہاتھ پائوںاپنے کام میں مشغول ہیں ،آنکھ اپنی نگاہ سے ان کا تعاون نہ کرتی یا منہ غذا کو چبانے اوراس سے لذت حاصل کرنے پر اکتفا کرتا اور معدہ کی ضرورت کو پورا نہ کرتا یعنی کھانے کو نہ نگلتا توانسان بلا فاصلہ مر جاتا اور نتیجہ کے طور پر خود غرض وانحصار طلب اعضاء بھی مر جاتے۔

معاشرہ کے بارے میں معاشرے کے افراد کا فریضہ بھی ایک انسان کے بدن کے اعضاء کے مانند ہے ۔یعنی انسان کو اپنا منافع معاشرے کے منافع کے ضمن میں حاصل کرنا چاہئے اور اپنے کام و کوشش سے معاشرے کو فائدہ پہنچانے کا خیال ہونا چاہئے تاکہ اپنی محنتوں سے بہرہ مند ہو سکے اور سبھی کو فائدہ پہنچائے تاکہ خود بھی بہرہ مند ہو سکے ۔تمام لوگوںکے حقوق سے دفاع کرے تاکہ خود اسکے حقوق نابود نہ ہوں ۔یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہم اپنی خداداد فطرت سے سمجھتے ہیں اور دین مقدس اسلام بھی ۔جو فطرت و خلقت پر استوار ہے۔اس کے علاوہ کوئی اور حکم نہیں رکھتا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :

"مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور اجنبیوں کے مقابلہ میں ایک دست، ایک دل اور یک جہت ہیں "[13]

مزید فرماتے ہیں :

"المسلم من سلم المسلمون من یده ولسانه"[14]

"مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان امان میں رہیں"

مزید فرماتے ہیں:

"من اصبح ولم یهتم باامورالمسلمین فلیس بمسلم"[15]

"جو مسلمانوں کے مسائل کو اہمیت نہ دے وہ مسلمان نہیں ہے۔"

اسی وجہ سے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگ تبوک میں لشکر اسلام کو لے کر روم کی سرحد کی طرف روانہ ہوئے تو اس وقت تین افراد نے اس جنگ میں شرکت نہیں کی تھی۔اسلامی لشکر کے جنگ سے واپس آنے پر جب یہ تینوں آدمی ان کے استقبال کے لئے گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سلام کیا، توآنحضرت ﷺ نے اپنے رخ کو موڑ لیا اور ان کے سلام کا جواب نہیں دیا اور اسی طرح مسلمانوں نے بھی ان سے اپنا منھ موڑ لیا، نتیجہ میں مدینہ منورہ میں کسی نے حتی ان کی عورتوں نے بھی ان سے بات نہیں کی انہوں نے بے بس ہو کر مدینہ کے پہاڑوں میں پناہ لی اور توبہ واستغفار کیا۔چند دنوں کے بعد خدائے متعال نے ان کی توبہ قبول کی پھر وہ شہر کے اندر آگئے ۔

۱۔اصول کافی، ج۱، ص۳۰۔

۲۔نہج الفصاحہ، ح۳۲٤، ص٦۳۔

4۔نہج الفصاحہ، ح۳۲۷، ص٦٤۔

5۔بحارالانوار، (ج۱ ص۱۷۸، ح٦۰)

6۔ عوالی اللئالی ،ج ا ،ص۲۹۲،ح۱۹۳۔

7۔ بحارالانوار،ج۷۵،ص۱۳۶ح۲۔

8۔ اصول کافی .ج۲،ص۱۵۱۔

9۔ مستدرک الوسائل ،ج۸،ص۴۲۷۔

10۔ سفینتہ البحار،ج ا،ص۱۹۰۔

11۔ نہج الفصاحہ،ح۱۵۰۰،ص۳۱۵۔

12۔ کنزالعمال ،ج۶،ص۵۹۵۔

13۔ نہج الفصاحہ ، ص ۶۲۵، ح ۳۰۸۱ و ۳۰۸۲۔

14۔ بحارالانوارج۷۷ص۵۳۔

15۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۱۶۳۔

عدالت

قرآن مجید اور ائمہ دین کی روایتوں کے مطابق عدالت کی دو قسمیں ہیں: انفرادی عدالت اور اجتماعی عدالت ۔ عدالت کی یہ دونوں قسمیں دین مبین اسلام کی نظر میں نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔

انفرادی عدالت

انفرادی عدالت سے مرادوہ عدالت ہے کہ انسان جھوٹ ، غیبت اور دوسرے گناہان کبیرہ سے پرہیز کرے اور دوسرے گناہوں کو باربار انجام نہ دے. جس میں یہ صفت ہو ، اسے عادل کہتے ہیں اور اسلام کے قوانین کے مطابق ایسا شخص جج ، حاکم ، تقلید ، اور دیگر اجتماعی ذمہ داریوں کو سنبھال سکتا ہے ۔ لیکن جس میں یہ دینی صفات موجود نہ ہوں وہ ان اختیارات سے بہرہ مند نہیں ہو سکتا ہے۔

اجتماعی عدالت

"اجتماعی عدالت" سے مرادوہ عدالت ہے کہ انسان دوسروں کے حقوق کے بارے میں افراط وتفریط نہ کرے اور سب کو قانون الٰہی کے مقابلہ میں مساوی قرار دے اور اجتماعی عدالت کو نافذ کرنے میں دینی مقررات کے حق سے تجاوز نہ کرے، جذبات میں نہ آئے اور سیدھے راستہ سے منحرف نہ ہو ۔ خدائے متعال فرماتا ہے:

(انّ اللہ یامربالعدل) ...)(نحل ۹۰)

"بیشک اللہ عدل کا حکم یتا ہے ..."

بیشمار آیتوں اور روایتوں میں گفتار وکردار میں عدالت کے بارے میں حکم ہوا ہے اور خدائے متعال نے اپنے کلام پاک میں چند مواقع پر ظالموں پر صراحتاً لعنت بھیجی ہے ۔

علم اخلاق میں "عدالت" سے مرادملکات وصفات نفسانی میں میانہ روی ہے اور یہ صفت اس میں پائی جاتی ہے جو انفرادی واجتماعی عدالت کی رعایت کرتا ہو۔

سچائی

لوگوں کے درمیان آپس میں رابطہ، جو انسان کی اجتماعی بنیاد ہے، "گفتگو" سے برقرار ہوتی ہے ۔ اس بنا پر سچ بات جو انسان کیلئے پوشیدہ حقیقت کو ظاہر کرتی ہے ، اجتماع کے ضروری ارکان میں سے ایک ہے ، اور اہم فائدے ۔ جن سے اجتماع ہر گز بے نیاز نہیںہے ۔ سچ بات سے حاصل ہوتے ہیں ۔ سچائی کے فوائد کو مندرجہ ذیل چند جملوں میں بیان کیاجاسکتا ہے :

١ ۔ سچ بولنے والا، اپنے ہم جنسوں کے لئے قابل اعتماد ہوتا ہے اور ان کو اس کی ہر بات کے بارے میں تحقیق کی ضرورت نہیں ہوتی ۔

٢ ۔ سچ بولنے والا، اپنے ضمیر کے مقابلہ میں سربلند اور جھوٹ کے رنج سے آسودہ ہوتا ہے ۔

٣ ۔ سچ بولنے والا، اپنے عہدوپیمان کی وفا کرتا ہے اور جو امانت اسکے حوالہ کی جاتی ہے، اس میں خیانت نہیں کرتا ہے ، کیونکہ رفتار میں سچائی، گفتار کی سچائی سے جدا نہیں ہے ۔

٤ ۔ سچ بولنے سے، اکثر اختلافات اور لڑائی جھگڑے ختم ہوجا تے ہیں، کیونکہ اکثر اختلافات اور جھگڑے اس لئے وجود میں آتے ہیں کہ ایک طرف یا دونوں طرف کے لوگ حق و حقیقت سے منکر ہوتے ہیں ۔

٥ ۔ سچ بولنے سے ، اخلاقی عیوب اور قانون کی خلاف ورزی کا ایک بڑا حصہ خود بخود ختم ہوجاتا ہے ، کیونکہ اکثر لوگ اسی قسم کے کردار کو چھپانے کیلئے جھوٹ بولتے ہیں امیرالمؤمنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

حقیقی مسلمان وہ ہے جو سچ بولنے کو ۔ خواہ اس کے نقصان میں ہو ۔ جھوٹ بولنے پر ترجیح دیتا ہے چاہے وہ اس کے لئے مفید ہی کیوں نہ ہو اور اس طرح وہ اندرونی سکون حاصل کرتا ہے ۔[1]

جھوٹ

"جھوٹ" اسلام میں گناہ کبیرہ ہے، جس کے لئے خدائے متعال کے کلام میں یقینی عذاب کا وعدہ دیا گیا ہے ۔

جھوٹ، صرف شرع میں ہی گناہ اور برا عمل نہیں ہے بلکہ عقل کی رو سے بھی اس کی برائی واضح ہے ۔ یہ ناپسندیدہ عمل ، معاشرے میں پھیلنے سے، تھوڑی ہی مدت میں لوگوں کے اجتماعی رابطہ یعنی اعتماد کو ختم کر دیتا ہے ، اور اس قسم کے رابطہ کے ختم ہونے سے ، لوگوں کا ایک دوسرے پر اعتماد نہیں ہوتا لہذا ، انفرادی طور پر زندگی گزارتے ہیں ، اگرچہ بظاہر اجتماعی صورت دکھائی دیتی ہے ۔

جھوٹ کے نقصانات

سچ بولنے کے بارے میں مذکورہ بیان سے جھوٹ بولنے کے نقصانات بھی واضح ہو جاتے ہیں۔جھوٹ بولنے والا انسانی معاشرے کا نابکاردشمن ہوتا ہے اوراپنے جھوٹ سے،جو ایک بڑا جرم ہے،معاشرے کوخراب کرڈالتا ہے،کیونکہ جھوٹ،نشہ آورچیز کے مانند ہے جومعاشرے کی عقل وشعورکی طاقت کونابود کرکے حقائق پرپردہ پوشی کرتا ہے یاشراب کے مانند ہے جو لوگوں کو مست کرکے عقل کی طاقت کو برے اور بھلے میں تمیز کرنے سے بیکار بنادیتا ہے۔اسی لئے اسلام نے جھوٹ کوگناہان کبیرہ میں شمار کیا ہے اور جھوٹ بولنے والے کے لئے کسی قسم کی دینی شخصیت کاقائل نہیں ہے۔

پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"تین طائفے منافق ہیں،اگرچہ وہ نماز بھی پڑھیں اورروزہ بھی رکھیں:

جھوٹ بولنے والا،اپنے وعدہ پر وفانہ کرنے والااورامانت میں خیانت کرنے والا ہے"۔[2]

امیرالمؤمنین حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

"انسان جب ایمان کی لذت کوچکھ لیتا ہے،تو جھوٹ کو ترک کر دیتا ہے اگرچہ مذاق میں بھی ہو۔"[3]

غیبت و تہمت

دوسروں کی"بدگوئی"کرنا اوران کی سرزنش کرنا،اگرسچ ہوتو"غیبت"ہے اور اگرجھوٹ ہوتو"تہمت"ہے کبھی اسے"بہتان"بھی کہا جاتا ہے۔

البتہ پروردگار عالم نے انسان کو(پیغمبروںاورائمہ اطہار کے علاوہ)معصوم خلق نہیں کیاہے اورہر شخص خودمیں موجودنقائص کی وجہ سے خطاو لغزش سے محفوظ نہیں ہے اور عام لوگ اس پردہ کے پیچھے زندگی کرتے ہیں جسے اللہ نے اپنی حکمت سے ان کے اعمال پر کھینچا ہے۔چنانچہ اگر ایک لمحہ کے لئے اس الہیٰ پردے کوان کے نقائص اور عیوب سے ہٹا دیا جائے تو سب ایک دوسرے سے متنفرہو کربھاگ جائیں گے،اور ان کے معاشرے کی عمارت زمین بوس ہوکرویران ہو جائیگی۔اس لئے خدائے متعال نے غیبت کوحرام قراردیا ہے تاکہ لوگ ایک دوسرے کے پیچھے امان میں رہیں۔اور ان کی زندگی کاظاہری ماحول آراستہ ہوجائے تاکہ یہی ظاہری زیبائی تدریجاًباطنی برائی کی اصلاح کرے۔

خدائے متعال فرماتا ہے:

(...(ولایغتب بعضکم بعضًاأیحبّ احدُکم ان یا کلَ لحم اخیه میتاً) ...)(حجرات۱۲)

"...ایک دوسرے کی غیبت بھی نہ کروکہ کیاتم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گاکہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے؟.."

"تہمت"کا گناہ اور اس کی برائی غیبت سے زیادہ شدید ہے اوراس کی برائی عقل کی رو سے واضح ہے ۔خدائے متعال نے اپنے کلام پاک میں اس کی برائی اورناجائز ہونے کو مسلم جاناہے اوربلا چون وچراذکر فرماتاہے:

(انّمایفتری الکذب الّذین لایؤمنون) ...)(نحل۱۰۵)

"بیشک جوایمان نہیںرکھتے ہیں وہ افتراکہتے ہیں..."

لوگوں کی عزت پر تجاوز

اسلام میں عصمت دری، گناہان کبیرہ میں سے ہے اورمواقع کے فرق کے مطابق اس جرم کے لئے سخت سزائیں، جیسے کوڑے، سنگسار اورقتل وضع ہوئی ہیں۔

اس برے عمل کی راہ کا کھلاہونا، اگرچہ طرفین کی رضامندی سے ہی ہو نسلوں کو۔جسے اسلام نے زیادہ اہمیت دی ہے، متزلزل کرکے رکھدیتا ہے اور وراثت وغیرہ کے احکام کو معطل کردیتاہے اورآخر کارماں باپ اور فرزند کے پیار کو بے اثر کرکے رکھدیتا ہے اورمعاشرے کے حقیقی ضامن زادو ولدکی فطری دلچسپی کونابود کردیتاہے۔

رشوت

کسی ایسے حکم یا کام کے انجام دینے کے لئے پیسے یا کوئی تحفہ لینا، جبکہ وہ کام پیسے یا تحفہ لینے والے کافریضہ ہو، تو اس کو "رشوت "کہتے ہیں۔

اسلام میں "رشوت "گناہ کبیرہ ہے اوراس کامرتکب ہونے والا، اجتماعی اوردینی فوائد(عدالت) سے محروم اورعذاب الہیٰ کا مستحق ہوتاہے۔کتاب وسنت اسکے گواہ ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رشوت دینے اور لینے والے اوران کے درمیان واسطہ بننے والے، پر لعنت کی ہے۔[4]

چھٹے امام حضرت امام جعفرصادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"کسی کی حاجت پورا کرکے رشوت لینا خدا سے کفرکے برابر ہے"[5]

البتہ یہ سب سرزنش اورمذمت اس رشوت کے بارے میں ہے جو حق بجانب حکم اور عادلانہ عمل کے بارے میں لی جائے اورجو رشوت غیرحق بجانب حکم اورظالمانہ عمل کے لئے لی جائے، اس کاگناہ بہت بڑا اوراس کی سزاشدیدتر ہے۔

حسن معاشرت

انسان جو سماج میں زندگی بسر کرتا ہے ، اس کے لئے لوگونکے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے ۔بیشک یہ مل جل کر رہنا اس لئے ہے تاکہ انسان اپنی انسان اپنی اجتماعی زندگی کا تحفظ کرسکے اور روز بروزاپنی مادی و معنوی ترقی میں اضافہ کرے اورزندگی کی مشکلات کوبہتروآسان ترصورت میں حل کرے۔

لہذا، لوگوںسے ایسا برتائو کرناچاہئے جو محبوبیت کا سبب بنے اور دن بدن انسان کے اجتماعی وزن کو بڑھاوادے اوراس کے دوستوں میں اضافہ ہو ،کیونکہ اگرلوگ کسی سے مل کر سنگینی یاتلخی کا احساس کریں گے تو ان کے دلوں میں نفرت اورتنگی پیدا ہوجائے گی اورآخر کارایک ایسادن آئے گا جب سب لوگ اس سے دوری اختیار کریں گے اورایسا شخص معاشرے میں منفورومبغوض ہو جائے گا اور اس کو سماج میں ہونے کے باوجود تنہائی کی حالت میں اوراپنے وطن میں ہوتے ہوئے بھی غریب الوطنی کی زندگی بسر کرنا پڑے گی اوریہ حالت انسان کی بدبختی کا تلخ وتاریک ترین نمونہ ہے۔

اس لئے دین مقدس اسلام نے اپنے پیروئوں کے لئے حسن معاشرت کی نصیحت وتاکید کی ہے اور اس کے بارے میں بہترین آداب ورسوم بیان فرمائے ہیں۔ منجملہ حکم دیاہے کہ مسلمانوں کوملاقات کے وقت ایک دوسرے کوسلام کرناچاہئے اور فضیلت اس کے لئے ہے جو سلام کرنے میں سبقت حاصل کرے۔

پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ،سلام کرنے میں پہل کرتے تھے حتی عورتوںاور بچوں کو بھی سلام کرتے تھے ۔اگرکوئی شخص آپ ﷺ کوسلام کرتاتوآپ ﷺ اسکا بہترین جواب دیتے تھے۔خدائے متعال فرماتا ہے:

(واذاحيّيتم بتحية فحيّوابا حسن منهااوردُّوها) ...)

(نسائ۸٦)

"جب تم لوگوں کوسلام کیاجائے،تو تم اس سے بہتریاویساہی جواب دو"

مزید حکم دیاہے کہ انسان لوگوں سے ملتے وقت تواضع اورانکساری سے پیش آئے اورہرایک کا اسکی اجتماعی حیثیت کے مطابق احترام کرے۔خدائے متعال فرماتا ہے :

(وعباد الرَّحمن الّذين يمشون على الارض هوناً) ...)

(فرقان٦۳)

"اور اللہ کے بندے وہی ہیں جوزمین پرآہستہ فروتنی اورانکساری سے چلتے ہیں ۔"

قابل ذکرنکتہ یہ ہے کہ تواضع اورانکساری کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان خود کو لوگوں کے سامنے ذلیل وخوار کرے اوراپنی انسانیت کو نقصان پہنچائے ،بلکہ مقصدیہ ہے کہ اپنی قدرومنزلت اورفخرومباہات کو لوگوں کے سامنے ظاہرنہ کرے اوردوسرے

عظیم فخر ومباہات کو خود سے مخصوص نہ کرے اور لوگوں کو حقیرو ناچیز نہ سمجھے ۔اسی طرح لوگوں کے احترام کا معنی یہ ہیں کہ لوگوں کا اس حدتک احترام کرے کہ چاپلوسی نہ ہو بلکہ ہرایک کا اس کی دینی واجتماعی قدرو منزلت کی حد میں احترام کرے،بزرگوں کا ان کی بزرگی کے مطابق احترام کرے اوردوسروں کا بھی ان کی انسانیت کے مطابق احترام کرے ۔

نیز احترام واکرام کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اگرکسی سے کوئی ناشائستہ کام سرزدہوتے دیکھے توآنکھیں بند کرکے گزرجائے یاایک ایسی محفل میں جہاں پراہل محفل انسانی شرافت کے خلاف کام انجام دیتے ہوں یاکوئی خلاف شرع عمل انجام دیتے ہوں تو رسوائی سے ڈرکران کے ساتھ ہم رنگ و جماعت ہوجائے ۔لوگوں کا احترام حقیقت میں انسانی شرافت اوران کی دینی قدروں کا احترام ہے نہ کہ ان کے جسم اوراعضاء کا احترام ۔اگرکوئی شخص اپنی انسانی شرافت اوردینی ترجیحات کونابودکردے تو کوئی دلیل نہیں بنتی کہ اس کااحترام کیا جائے ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :

دوسروں کی اطاعت کے ذریعہ خدا کی معصیت انجام نہیں دیناچاہئے ۔[6]

۱۔نہج البلاغہ صالح، کلمات قصار نمبر ٤٥٨ دتھوڑے سے اختلاف کے ساتھ ۔

2۔میزان الحکمہ،ج۱۰،ص١٥٤۔

3۔اصول کافی،ج۲،ص۳٤۰،ح۱۱۔

4۔سفینۃ البحائج ۱،ص۵۲۳۔

5۔سفینۃ البحائج ۱،ص۵۲۳۔

6۔وسائل الشیعہ،ج۱۱،ص٤۲۲۔

نیکوں کی مصاحبت

اس کے باوجود کہ انسان بہت سے لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہتا ہے، مگر وہ زندگی کے تقاضے کے مطابق مجبور ہے کہ کچھ لوگوں کے ساتھ دوسروں کی نسبت زیادہ مل جل کر رہے، یہ وہ لوگ ہیں جو"دوست" کے نام مشہور ہیں۔

البتہ اس دوستی کا سبب اخلاق، روش، اورپیشہ وغیرہ میں ایک قسم کی یکسانیت ہے جودویاچند افراد کے درمیان پائی جاتی ہے اورچونکہ وابستگی اورمصاحبت کے نتیجہ میں رفتہ رفتہ دو ہم نشین افراد کے عادات واخلاق ایک دوسرے میں منتقل ہوتے ہیں، لہذا انسان کونیک انسانونکی دوستی اختیار کرنی چاہئے، کیونکہ اس صورت میں ان کے نیک اخلاق اس میں سرایت کریں گے اس کی بے لوث اور خیر خواہانہ دوستی سے استفادہ کرے گا اوراس کی دوستی کی پائداری سے مطمئن رہے گا۔اس کے علا وہ لوگونکی نظروں میں اس کی اجتماعی حیثیت بھی بڑھ جائے گی۔

امیرالمؤمنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"خير الاصحاب من يَد لُّکَ علی الخير"

"بہترین دوست وہ ہے جوتجھے نیک کام کی طرف راہنمائی کرے۔"

مزید فرماتا ہے:

"المرء يوزن بخليله "

"مرداپنے دوست کے ذریعہ تولا جاتا ہے"[1]

تو اول بگوباچہ کس زیستی

کہ تامن بگویم کہ تو کیستی

ہمان قیمت آشنایان تو

بود قیمت و ارزش جان تو

تم پہلے یہ بتاوکہ تم کس کے ہم نشیں ہوتاکہ میں بتاسکوں کہ تم کون ہوتیری قدروقیمت بھی وہی ہوگی جو تیرے دوست کی ہے۔

بروں کی مصاحبت

بروں اور گنہگاروںکے ساتھ اٹھنا بیٹھنا بدبختی اور برے انجام کا سبب بنتا ہے۔اس مطلب کی وضاحت کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اگر ہم مجرموں اور بدکرداروں جیسے چوروں اورڈاکوئوں سے ان کے انحراف وگمراہی کے سبب کے بارے میں پوچھیں تو وہ کسی شک وشبہہ کے بغیر جواب دیں گے کہ برے لوگوں کی مصاحبت اورمعاشرت نے ہمیں

اس مصیبت میں گرفتار کیا ہے۔ہزاروں بدکرداروں میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملے گا کہ جس نے خودبخودناشائستہ راستہ کوانتخاب کیا ہو۔

امیرالمؤمنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"بروں کی ہم نشنی سے پرہیز کرو،کیونکہ برادوست تم کو اپنے جیسا بنادے گا، اور وہ تمہارے جیسا نہیں بنے گا"[2]

مزید فرماتے ہیں:

"ایاک ومصادقة الفاجر فانه یبیع مصادقه بالتّا فة"[3]

"بدکردارکی دوستی سے پرہیز کروکیونکہ وہ تم کو معمولی چیز کے مقابلہ میں بیچ دے گا."

بابدان کم نشین کہ درمانی

خوپذیراست نفس انسانی

"بروں کی ہم نشنی کم اختیار کرو،کیونکہ انسان دوسروں کی عادت کوقبول کرنے والا ہوتا ہے"

ماں باپ پر اولاد کے حقوق

انسان کو جوکام انجام دیناچاہئے جس کے بارے میں انجام دیتا ہو او راس کو اس کانفع ملتا ہوتو اسے "حق"کہتے ہیں اور جس کے لئے اسے انجام دینا چاہئے اسے "فریضہ، حکم اور تکلیف"کہتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص کسی کے لئے اجرت پر کوئی کام انجام دیتا ہے،تو اجرت ادا کرنا صاحب کار کا فرض ہے اور مزدور کا حق ہے۔ اگر صاحب کار نے اجرت ادا نہ کی تو

مزدور اس سے مطالبہ کر سکتا ہے اور اپنے حق کا دفاع کر سکتا ہے،کیونکہ انسان اس طرح خلق کیا گیا ہے کہ اس دنیا میں اس کی زندگی ابدی نہیں ہے اور خواہ نخواہ کچھ مدت کے بعد، رخت سفر باندھتا ہے، خدائے تعالے نے انسان کی نسل کو نابودی سے بچانے کے لئے تناسل وتوالد کی روش کو قرار دیا ہے اور انسان کو تناسل کے وسائل مہیا کئے ہیں اور اس کے باطنی جذبات کو اس کام کی طرف متوجہ کیا ہے۔

اسی مکمل آمادگی کا نتیجہ ہے کہ انسان فطری طور پر اپنی اولاد کو اپنے بدن کاٹکڑا سمجھتا ہے اور اس کی بقا کو اپنی بقا جانتا ہے او راس کی آسائش و کامیابی کی راہ میں ہر قسم کی تلاش و کوشش کرتا ہے اور گوناگوں رنج و الم برداشت کرتا ہے، کیونکہ وہ اس کی ذات یا شخصیت کی نابودی کو اپنی ذات یا شخصیت کی نابودی جانتا ہے۔ حقیقت میں وہ خالق کائنات کے حکم کی تعمیل کرتا ہے جو بشر کی بقا چاہتا ہے۔ لہذا ماں باپ کا فرض ہے کہ جس حکم میں ضمیر و شرع متفق ہیں اس کو اپنے فرزند کے بارے میں نافذ کریں اور اس کی اچھی پرورش کریں تا کہ وہ ایک شائستہ انسان بن جائے، اس کے لئے اسی چیز کا انتخاب کریں جس کو انسانیت کی نگاہ میں اپنے لئے انتخاب کرتے ہیں۔ یہاں پر ہم ان میں سے بعض حقوق کو بیان کرتے ہیں:

۱۔ پہلے ہی دن سے جب بچہ بات یا اشارہ کو سمجھنے لگے، اس کے ضمیر میں پسندیدہ اخلاق او رشائستہ صفات کی بنیاد ڈال کر انھیں مستحکم کریں اور حتی الامکان اسے بیہودہ باتوںکے ذریعہ نہ ڈرائیں اور اسے بُرے اور عفت کے خلاف کاموں سے روکیں اور خود بھی اس کے سامنے جھوٹ بولنے ،گالیاں دینے اور برے الفاظ استعمال کرنے سے پرہیز کریں اور اس کے سامنے پسندیدہ کام انجام دیں تا کہ شریف او رعالی مزاج بن جائے اور اپنی طرف سے سنجیدگی، ہمت او رعدالت کا مظاہرہ کریں تا کہ ان کی عدالت دوستی اورانسان پروری "انتقال اخلاق" کے قانون کے تحت اس میں منتقل ہوجائے اور زیادتی ، حوصلہ شکنی اور خودپرستی سے محفوظ رہے۔

۲۔ جب تک ممیزنہ ہوجائے کھانے پینے، سونے اور اس کی دوسری ضرورتوں میں اس کا خیال رکھیں اور اس کے جسمی حفظان صحت کی رعایت کریں تا کہ وہ ایک سالم بدن اور قوی دماغ اور اچھا مزاج والابن کر تعلیم و تربیت کے لئے آمادہ ہوجائے۔

۳۔ جب بچہ میں تعلیم و تربیت کی استعدادپیدا ہو جائے(عام طور پر یہ مرحلہ سات سال کی عمر میں آتا ہے) اسے معلم کے حوالہ کریں اور کوشش کریں کہ ایک شائستہ معلم کی تربیت میں رہے تا کہ جو کچھ اس سے سنے اس کا اس پر اچھا اثر پڑے اور وہ اس کے روح کی شرافت ، تزکیہ نفس او رتہذیب اخلاق کا سبب بنے۔

٤۔ جب بچے کی عمر اتنی ہوجائے کہ وہ عام پروگراموں یا خاندانی نشست و برخاست میں شرکت کر سکتا ہو، تو اسے اجتماعی رسومات سے آشنا کرنے کے لئے اپنے ساتھ پروگراموں میں لے جاناچاہیئے اور پسندیدہ معاشرتوں کے طرز عمل سے اسے آگاہ کرنا چاہیئے۔

اولاد پر ماں باپ کے حقوق

وہ آواز جو ضمیر اور شرع کے منادی کی طرف سے ماں باپ کے کانوں میں پہنچی اور انھیں اولاد کے بارے میں ذمہ دار بنادیا، اسی طرح ضمیر اور شرع کی آوازنے اولاد کو بھی متوجہ کیا اور اس پر فرض کردیا کہ اپنے ماں باپ کی نیکیوں کا ۔ ہاتھ، زبان یا ہر وسیلہ سے۔ شکریہ بجالائے۔

ماں باپ وہ ہیں جو خدا کے ارادہ سے اپنے فرزند کو وجود میں لائے ہیں اور اپنے آرام و سکون اس کے معنوی اور جسمانی آرام و سکون پر قربان کرکے ایک عمر راتوں کو جاگ کر اور دن میں رنج و غم برداشت کرکے اسے ایک قوی انسان بناتے ہیں۔

کتنی نامردی، پستی اور نمک حرامی ہے کہ انسان اپنے ماں باپ کو اذیت پہنچائے یا ان کے بوڑھاپے اور ناتوانی کے دنوں میں ان کی مدد نہ کرے!!

خدا کی توحید، جو انسان کا پہلا فریضہ ہے، کے بعددوسرا فریضہ جو اسلام نے انسان کے لئے معین کیا ہے، وہ ماں باپ کے ساتھ اچھا برتاؤ ہے:

(وقضی ربُّک الاّ تعبد وا آلّاا ایّاہ و بالوالدین احساناً) ...)

(اسرائ/ ٢٣)

"اور آپ کے پروردگار کا فیصلہ ہے کہ تم سب اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا..."

اسلام میں مقرر شدہ فریضے کے مطابق، فرزند کوکسی صورت میں یہ حق نہیں ہے کہ اپنے ماں باپ کو ذلیل و خوار سمجھے اور ایک ایسا کام انجام دے جو ان کی رنجیدگی کا سبب بنے، اسے ہمیشہ اپنے ماں باپ کا احترام کرنا چاہئے اوران کی نسبت فروتنی اور انکساری او راحسان و نیکی کے ساتھ پیش آنا چاہئے، خاص کر ان کی ضرورت کے وقت ان کی مدد کرنے میں کوتاہی نہ کرے۔ لیکن جاننا چاہئے کہ ماں باپ کی مرضی کی رعایت کرنا صرف مستحب اور مباح کاموں میں ہے، واجبات میں ان کی مرضی کے مطابق انجام دینا لازم نہیں ہے۔

بھائیوںاور بہنوں کے باہمی حقوق

قرآن مجید میں، رشتہ داروں کے بارے میں بارہاتا کید کی گئی ہے اور قطع رابطہ سے منع کیاگیاہے۔ ماں باپ اور اولاد کے بعد انسان کے قریبی ترین رشتہ دار بھائی اور بہن ہیں اور ان کے درمیان اجتماعی رابطہ فطری ہے اور یہ رابطہ تمام رابطوں سے مستحکم اور بنیادی تر ہے۔ بھائی بہنوں کا فریضہ ہے، کہ ضرورت پر رشتہ کے ناطوں کو نہ توڑیں اور آپس میں تعاون کرکے حتی

الامکان ایک دوسرے کی مدد کریں اور ضرورت پر ایک دوسرے کی دستگیری کریں ۔ بڑے ، چھوٹوں کے ساتھ مہربانی اورہمدردی سے پیش آئیں اورچھوٹے بھی بڑوں کا احترام کریں۔

عاق والدین

خاندانی اجتماع میں اولاد کی ماں باپ سے وہی نسبت ہے جو ایک درخت میں شاخوں کی جڑ سے ہوئی ہے، چونکہ جس طرح درخت کی شاخوں کا وجود جڑ پر منحصر ہوتاہے، اسی طرح فرزند کی زندگی بنیاد ڈالنے والے اس کے ماں باپ ہوتے ہیں۔چنانچہ انسانی معاشرہ والدین اوراولاد کے دوگروہ سے تشکیل پاتا ہے ، اسلئے معاشرے کی اصلی بنیاد والدین ہی ہیں ۔

ماں باپ کے ساتھ برا سلوک کرنا اورانھیں اذیت وآزارپہنچانا ، نمک حرامی اورنامردی کے علاوہ انسانیت کے انحطاط اور معاشرے کی نابودی کا سبب بنتا ہے ۔ کیونکہ اولاد کی طرف سے ماںباپ کی بے احترامی ،ماں باپ کی طرف سے بھی عدم محبت اوربے توجہی کی صورت میں ظاہر ہوگی اوردوسرے یہ کہ جو اولاد اپنے ماں باپ کو ذلیل وخوار اور پست نگاہ سے دیکھتے ہیں وہ اپنی اولاد سے اپنے سے زیادہ توقع نہیں رکھیں گے اوراپنے بوڑھا پے اورناتوانی کے دنوں میں ان کی طرف سے دستگیری اور مدد کی کوئی امید نہیں رکھیں گے اوراسطرح لامحالہ خاندان کی تشکیل سردمہری کا شکار ہوگی ،جیسا کہ آج کل بہت سے نوجوانوں میں ایسی حالت کا مشاہدہ ہوتا ہے۔

اس طرزفکر کا عام ہونا قطعی طورپر تناسل اورتوالد کی راہ کو مسدود کرتا ہے،کیونکہ کوئی عقل مند اپنی گراں بہا عمرکوایک ایسے پودے کی پرورش میں صرف نہیں کرتا جس کا نہ وہ پھل کھاسکے گا اورنہ اس کے سایہ میں بیٹھ سکے گا اور نہ اس کو دیکھنے میں غم واندوہ کے علاوہ اسے کوئی فائدہ ہو گا ۔ ممکن ہے ہم تصور کریں کہ حکومت مختلف انعامات سے لوگوں کو خاندان کی تشکیل میں تشویق کرے اور اسطرح ،تناسل وتوالد کا مسئلہ حل ہو جائے ، لیکن یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ اجتماعی رسومات میں سے اگر کوئی بھی طریقہ اور رسم فطری پشت پنا ہی (جیسے ماں باپ اور اولاد کے جذبات)نہ رکھتی ہو تو وہ پائدار نہیں ہے۔

اس کے علاوہ فطری جبلتوں میں سے کسی ایک جبلت کو چھوڑنا انسان کومعنوی لذتوں سے محروم کرتا ہے۔

عزت نفس اور کامیابی

یہ بات مسلم اوریقینی ہے کہ ہر معاشرے میں بے چارے اورنادار،مدداوردستگیری کے مستحق ہوتے ہیں ۔ سرمایہ داروں کافرض ہے کہ ان کی مدد کریں اوران کے اس مسلم حق کو پامال نہ کریں اورشرع مقدس میں اسلام نے بھی اس حق کی رعایت کے سلسلہ میں تاکید و نصیحت کی ہے ، اور دولتمندوں پر ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ ناداروں اور بیچاروں کی مدد کریں ۔

خدائے متعال نے قرآن مجید میں خود کو نیکی کرنے والا، بخشش وعطا کرنے والا اور معاف کرنے والا کہا ہے. اور اپنے بندوں کو یہ پسندیدہ صفتیں پیدا کرنے کی ترغیب وتشویق فرماتا ہے ۔

"خدائے متعال نیک کام انجام دینے والوں کے ساتھ ہے ۔"[4]

نیز فرماتا ہے :

"جس چیز کو انفاق کرتے ہووہ خودتمہارے فائدے میں ہے ۔"[5]

دوسری جگہ پر فرماتا ہے :

"جو کچھ انفاق کرتے ہو،وہ تمھیں پلٹادیا جاتا ہے اور تم نے کسی قسم کانقصان نہیں اٹھایا ہے"[6]

احسان اور محتاجوں کی مدد

اجتماعی حالات اوراحسان کے فوائد کے بارے میں غور وفکر اور مطالعہ ان آیات کے مضمون کوواضح کردیتا ہے ،کیونکہ حقیقت میں تمام اجتماعی توانائیاں سارے افراد کے لئے

کام کرتی ہیں اور جس معاشرے میں کچھ غریب ونادار فقر وتنگ دستی کی وجہ سے کام اور کوشش سے ہاتھ کھینچ لیتے ہیں تو ان کی تعداد کے اعتبار سے مال وثروت کی پیداوار میں کمی واقع ہوتی ہے اور اس کے نامطلوب نتائج تمام لوگوں کواپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں اورنوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ دولت مند دوسروں سے زیادہ بیچارے ہوجاتے ہیں، لیکن اگر مالدار اپنی نیکی اور بخشش سے ناداروں کی دستگیری کریں تو ان کے حق میں بہت اچھے نتائج نکلتے ہیں کہ من جملہ ان کے:

۱۔اس کام سے دوسروں کے دلوں میں اپنے بارے میں محبت پیدا کرتے ہیں اورایک گروہ کو اپناعاشق بناتے ہیں ۔

۲۔ایک ناچیز مال سے اپنے لئے زیادہ احترام حاصل کرتے ہیں ۔

۳۔تمام لوگوں کی پشت پناہی کو اپنے لئے حاصل کرتے ہیں ،کیونکہ لوگ نیکی کرنے والے کی طرف داری کرتے ہیں ۔

٤۔اس دن کے خطرے سے محفوظ رہتے ہیں کہ جس دن تمام ناداروں کی ناراضگی جمع ہو کر ہر خشک وتر کوبہادے گی۔

٥۔وہی ناچیز مال جوانفاق کیا ہے ،اقتصاد کا پہیہ حرکت میں آنے کا سبب بنتا ہے اور معاشرے کے مال میں اضافہ ہو کر خود ان کی طرف پلٹتا ہے ۔

خدا کی راہ میں انفاق کرنے کی فضیلت اور اسکی طرف ترغیب اور تشویق کرنے کے بارے میں بہت سی آیات وروایات موجودہیں ۔

تعاون

احسان ونیکی کامسئلہ جو بیان ہوچکا ،تعاون کے مختلف شعبوں میں سے ایک ہے جو انسانی معاشرے کی بنیاد ہے ،کیونکہ سماج کی حقیقت، افراد کا ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دینا ہے تاکہ ایک دوسرے کی مدد سے سبھی کاکام ٹھیک ہو جائے اور سبھی کی زندگی مستحکم اور سبھی کی ضرورتیںپوری ہوجائیں ۔ لیکن یہ تصور نہیں کرناچاہئے کہ دین مقدس اسلام نے نیکی کو صرف مال کی صورت میں چاہا ہے ،بلکہ ہر بیچارے کی دستگیری ،اگرمال کی ضرورت بھی نہ ہو،دین مقدس اسلام کامقصدہے اورانسانی ضمیر کا مطلوب بھی ہے ۔

ایک جاہل کو علم سکھانا، ایک اندھے کاہاتھ پکڑنا، ایک گمراہ کی راہنمائی کرنا اورگرے ہوئے کی مدد کرناوغیرہ سب احسان اورنیکی کے مصادیق اور اس تعاون میں سے ہیں،کہ ہم نے اجتماع کو تشکیل دینے کے پہلے دن اس کے اعتبارکی تصدیق اورتائید کی ہے اور واضح ہے کہ اگرانسان ،بعض جزئی کام انجام نہ دے تو وہ بنیادی کام بھی انجام نہیں دے گا ،اگرغیراہم اور جزئی فرائض کی رعایت نہ کرے،تو وہ کلی اور اہم فرائض کوبھی انجام نہیں دے گا ۔

خیرات اورنیکیوں کی طرف سبقت کرن

نیک کام کا پسندیدہ ہونا ان نتائج کی بنا پر ہے جواس سے حاصل ہوتے ہیں البتہ جس قدریہ نتائج وآثارعوامی تراورپائندہ ترہوں ،اسی قدر نیکی بھی پسندیدہ تر وعالی تر ہوگی ،ایک بیمار کا علاج کرنا نیک کا م اوراحسان ہے ،لیکن ایک ہسپتال کوتعمیر کرنااور اسے چالو کرناجس میں روزانہ سیکڑوں بیماروں کاعلاج کیا جائے،اس کے ساتھ قابل موازنہ نہیںہے ۔ایک طالب علم کی تعلیم پسندیدہ ہے ،لیکن ایک ادارہ کی تاسیس کے ساتھ قابل موازنہ نہیں ہے جس میں سالانہ سیکڑوں دانشور علم حاصل کرکے فارغ ہو جائیں۔یہی وجہ ہے کہ عام اوقاف اور عوامی سطح کے خیرات و نیکیاں احسان ونیکیوں کے عالی مراتب شمار ہوتے ہیں ۔

شرع کی زبان میں ان عمومی خیرات کو"صدقہ جاریہ"سے تعبیر کیاگیا ہے۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :

"مردکی سربلندی کاسبب دوچیزیں ہیں ،ایک فرزند صالح اوردوسرے صدقہ جاریہ "

چنانچہ کتاب وسنت سے معلوم ہوتاہے کہ جب تک"صدقہ جاریہ" باقی رہتاہے خدائے متعال ،صدقہ دینے والے کے نام ثواب لکھتا ہے ۔

یتیم کا مال کھان

جس طرح لوگوں کے ساتھ نیکی کرنا عقلاً و شرعاًپسندیدہ ہے اسی طرح خدا کے بندوں کے ساتھ بُرائی کرنا ناروا اورقابل مذمت کام ہے ، لیکن شرع مقدس اسلام میں ظلم کے چند مواقع کی شدت کے ساتھ نہی کی گئی ہے، کہ ان میں سے ایک "مال یتیم میں تفریط" ہے۔

اسلام نے یتیم کا مال کھانے کو گناہان کبیر میں شمار کیا ہے اور قرآن مجید میں صراحت سے بیان کیا گیا ہے، کہ جو یتیم کا مال کھاتا ہے، حقیقت میں وہ آگ کھاتا ہے اور اسے جلتی ہوئی آگ میں ڈال دیا جائے گا۔چنانچہ ائمہ اطہار علیہم السلام کے بیانات سے معلوم ہوتاہے کہ اس قدر تاکید کا سبب یہ ہے کہ اگر کسی بوڑھے انسان سے ظلم کیا جائے تو ممکن ہے وہ مقابلہ کرنے کے لئے اٹھ کر اپنے حق کا دفاع کرے گا، لیکن کم عمر یتیم اپنے حق کا دفاع کرنے سے عاجز ہے۔

کسی کو قتل کرن

ظلم کا ایک اور مقام جسے شرع مقدس اسلام میں بہت ناپسند و قابل مذمت سمجھاگیاہے وہ "قتل نفس اور بے گناہ کو قتل کرنا" ہے۔

قتل نفس گناہان کبیرہ میں سے ہے، اور خدائے متعال نے اپنے کلام میں ، ایک انسان کو قتل کرناپوری انسانیت کو قتل کرنے کے برابر جاناہے، یہ اس لئے ہے کہ انسان کو قتل کرنے والا انسانیت کے ساتھ سروکار رکھتا ہے اور انسانیت ایک آدمی اور ہزار آدمی میں یکساں ہے۔

رحمتِ خدا سے مایوسی

اسلام میں ایک خطرناک ترین گناہ "خدا کی رحمت سے مایوسی ہے خدا ئے تعالے فرماتاہے:

(قل یٰعبادی الّذین اَسرفُوا علی انفسھم لاتقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذُّنوب جمیعا انّہ ھو الغفور الرّحیم)

(زمر۵۳)

"پیغمبر! آپ پیغام پہنچادیجئے کہ اے میرے بندو اجنھوں نے اپنے نفس پرزیادتی کی ہے رحمت خدا سے مایوس نہ ہونا اللہ تمام گناہوں کا معاف کرنے والاہے اور وہ یقینا زیادہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔"

ایک دوسری جگہ پر رحمت خدا سے مایوس شخص کو قرآن کافر جانتا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص خدا کی رحمت اور بخشش سے مایوس ہوا، تو پھر اس کے پاس باطنی طور پر تحریک کرنے والا محرک نہیں ہے کہ اچھے اور پسندیدہ کام انجام دے یا گناہا

ن کبیرہ و صغیرہ اور بُرے کردار سے اجتناب کرے، کیونکہ ان دونوںچیزوں میں اصلی محرک عذاب خدا سے بچنے کے لئے "رحمت و نجات کی امید" ہے۔ اورچونکہ یہ امید اس شخص میں نہیں پائی جاتی ہے لہذایہ شخص اس کافر سے کسی قسم کا فرق نہیں رکھتا ہے جو کسی دین کا پابند نہیں ہے۔

جہاد اور دفاع سے فرار کی سزا

میدان جنگ سے بھاگنے اور دشمن کو پیٹھ دکھانے کے معنی یہ ہیں کہ، بھاگنے والا، اپنی جان کو معاشرے کی زندگی سے زیادہ قیمتی جانتا ہے اور حقیقت میں یہ دشمن کے سامنے دینی مقدسات اور معاشرے کی جان و مال کو پیش کرنے کے مترادف ہے جو اس کی زندگی کی حیثیتیوں کو دھمکاتا ہے۔

اسی لئے جہاداوردفاع سے بھاگنے کوگناہان کبیرہ میں شمارکیاگیا ہے اور خدائے متعال اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے:

(ومَن یولّھم یومئذ دبرہ الامتحِرفا لقتال اومتحّیزاالی فئةفقد باء بغضب من اللہ وماوٰہ جھنم) ...)(انفال١٦)

"اورجوآج کے دن پیٹھ دکھائیگا وہ غضب الہیٰ کا حقدار ہوگا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا علاوہ ان لوگوں کے جو جنگی حکمت عملی کی بناپرپیچھے ہٹ جائیں یاکسی دوسرے گروہ کی پناہ لینے کے لئے اپنی جگہ چھوڑدیں۔"

١۔میزان الحکمۃ،ج٢،ص٣٢٧۔

2۔شرح غررالحکم ،ج٢،ص٢٨٩۔

3۔غررالحکم ،ح١٠٧،ص١٥٩۔

4۔(عنکبوت ٦٩)۔

5۔(بقرہ٢٧٢)۔

6۔(انفال ٦٠)۔

وطن کادفاع

مذکورہ بیانات کے پیش نظر اسلامی معاشرہ اور مسلمانوں کے گھر بار کادفاع اہم ترین واجبات میں سے ہے ۔خدائے متعال فرماتا ہے :

(ولاتقولوا لمن یقتل فی سبیل الله اموات بل احیا ء ولکن لاتشعرون) (بقرہ۱۵٤)

"اورجولوگ راہ خدا میں قتل ہوجاتے ہیں انھیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمھیں ان کی زندگی کاشعور نہیں ہے "

اسلام کی ابتداء میں جان ہتھیلی پرلے کر خونین جنگوں میں شرکت کرنے والے مجاہدوں اوراپنے پاک خون میں غلطاں ہونے والے شہیدوں کے بارے میں انتہائی حیرت انگیزاور عبرتناک داستانیں موجودہیں ،یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے اپنے پاک خون اورٹکرے ٹکڑے ہوئے بدن سے اس دین مقدس اسلام کو مستحکم بنایا ہے ۔

حق کا دفاع

ایک دوسرادفاع جوآب وخاک کے دفاع سے عمیق تراوروسیع ترہوتا ہے ،وہ حق کادفاع ہے ۔یہ دین اسلام کا تنہامقصدہے۔اس خدائی روش کابنیادی مقصد حق و حقیقت کوزندہ کرنا ہے ،اسی لئے اس دین پاک کو"دین حق"کہاگیا ہے ۔یعنی وہ دین جوحق کی طرف سے ہے، حق کے سوا کچھ نہیں ہے اور حق کے علاوہ کسی چیز کو اپنا مقصد قرار نہیں دیتا ہے ۔

خدائے متعال اپنی کتاب کی توصیف میں ،جوتمام حقائق کی جامع کتاب ہے فرماتاہے:

(...یهدی الی الحق والی طریق مستقیم) (احقاف۳۰)

"...قرآن مجید راہنمائی کرتاہے حق کی طرف اورسیدھے راستہ کی طرف جس میں کسی قسم کاتناقض اورتضادنہیں پایاجاسکتاہے"

اسلئے ہر مسلما ن پرلازم ہے کہ وہ حق کی پیروی کرے اورحق بات کہے حق سنے اوراپنی تمام توانائیوں اورہر ممکن راہ سے حق کادفاع کرے۔

غیظ وغضب

غیظ و غضب ایک ایسی حالت ہے کہ اگر انسان میں پیدا ہوجائے تو اسے انتقام کی فکر میں ڈالتی ہے اور اس کے باطنی آرام کو انتقام لینے کی صورت میں ظاہر کرتی ہے۔ اگر انسان اس حالت میں اپنے نفس کو قابو میں رکھنے کے سلسلہ میں تھوڑی سی سستی اور کوتاہی کرے تو بلافاصلہ اس کی عقل سلیم غیظ و غضب کے سامنے ہتھیا رڈال دیتی ہے اور ہر جرائی اورنارواوناشائستہ

چیزاسے صحیح نظر آتی ہے اور وہ اس حد تک پہنچتا ہے کہ انتقامی جذبہ کی وجہ سے ہر درندہ سے بڑا درندہ و اور ہر آگ سے زیادہ شعلہ ور ہوتا ہے۔

اسلام میں انتقام لینے کے سیلاب کو روکنے کے لئے بہت ہی تاکید ہوئی ہے اور اس کی پیروی کرنے کی زبردست مذمت کی گئی ہے۔ خدائے متعال ان لوگوں پر بہت عنایت کرتا ہے اور انھیں عفو کرتا ہے جو اپنے غیظ و غضب پر قابو پاتے ہیں اور غصہ کی حالت میں بردباری سے کام لیتے ہیں۔ فرماتا ہے:

(...(والکاظمین الغیظ و العافین عن النّاس) (آل عمران/۱۳٤)

"...اور غصہ کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں۔"

(...(و اذاما غضبوا هم یغفرون) (شوری/۳۷)

"... اور جب غصہ آتا ہے تو معاف کرتے ہیں۔"

کام کا واجب ہونا اور صنعت و حرفت کی اہمیت

کام اور سرگرمی، وہ بنیادیں ہیں، جن پر نظام خلقت استوار ہے اور یہ ہر مخلوق کی بقاء کے ضامن ہیں۔ خدائے متعال نے اپنی مخلوقات میں سے ہر ایک کو اس کے حالات کے مطابق کچھ وسائل سے مسلح کیا ہے کہ ان سے استفادہ کرنے پر وہ منافع کو حاصل کرتا ہے اور نقصانات سے بچتا ہے۔

انسان خدا کی مخلوقات میں حیرت انگیز ترین اور پیچیدہ ترین مخلوق ہے، دوسری مخلوقات کی نسبت اس کی حاجتیں زیادہ ہیں اور لہذا زیادہ سرگرمی کی ضرورت ہے تاکہ اس کے ذریعہ، اپنی بے شمار ضرورتوں کو پورا کر سکے اور اپنے خاندانی نظام جسے فطرتاً تشکیل دینا چاہئے کو بھی برقرار کر سکے۔

اسلام چونکہ ایک فطری اور اجتماعی دین ہے، لہذا اس نے کاروکسب کو واجب قرار دیا ہے اور بیکار انسانوں کی اہمیت کا قائل نہیں ہے۔

اسلام میں ،ہرفرد کو اپنے سلیقہ اورشوق کے مطابق صنعت وحرفت جس کی طرف خدائے متعال نے انسانی فکر کی ہدایت کی ہے ان میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنا چاہئے اوراس طریقہ سے اپنی روزی کمائے اورمعاشرے کی ذمہ داریوں میں سے کسی ایک کو اپنے ذمہ لے لے اور لوگوں کی آسودگی کے بارے میں کوشش کرے ۔خدائے متعال فرماتا ہے :

(وأن لیس للانسان اِلّا ماسعی) (نجم۳۹)

"اور یہ کہ انسان کے لئے کوئی فائدہ نہیں ہے ،مگر یہ کہ سعی و کوشش کرے۔"

بیکاری کے نقصانات

مذکورہ بیانات سے واضح ہوا کہ کاروکوشش ایک راستہ ہے جسے خالق کائنات نے انسان کے اختیارمیں قراردیا ہے تاکہ اسے طے کرکے اپنی زندگی کی سعادت کو پاسکے ، البتہ خلقت و فطرت کی راہ سے انحراف چاہے کم ہی کیوں نہ ہوانسان کے لئے نقصان کے علاوہ کوئی فائدہ نہیں دیتا ۔ اس صورت میں جس چیزپرنظام زندگی استوار ہے ، اس سے انحراف کرنے میں دنیاوآخرت کی بد بختی کے علاوہ کچھ نہیں ہے ۔

اسی لئے ساتویں امام حضرت موسی بن جعفر علیہ السلام فرماتے ہیں :

"کام میں سستی اورتھکاوٹ کا اظہارنہ کرناورنہ دنیاوآخرت تیرے ہاتھ سے چلی جائیگی ۔"[1]

خوداعتمادی

عقائد کے باب میں باربایاددہانی کرائی گئی کہ اسلام کاعام پروگرام یہ ہے کہ انسان خدائے یکتا کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کرے اور خالق کائنات کے علاوہ کسی کے سامنے سرتعظیم خم نہ کرے ۔

سب خدا کی مخلوق اور اس کی پرورش یافتہ ہیں اوراس کا رزق کھاتے ہیں اور کسی کو کسی پر فضیلت کا حق نہیں ہے ، سوائے اس چیزکے جوخدا کی طرف پلٹے ۔

ہر مسلمان کو اپنے نفس پر اعتماد کرنا چاہیئے اورجوآزادی خدانے اسے دی ہے اس سے استفادہ کرے ، اورجو وسائل اسے فراہم کئے ہیں ان سے بھرپورا فائدہ اٹھائے اور زندگی کی راہ کوطے کرے ، نہ یہ کہ دوسروں پرامید باندھ کرہر روز خدا کے لئے ایک شریک ٹھہرائے اور ایک تازہ بت بنائے ۔

نوکر کو جاننا چاہیئے کہ وہ اپنی روٹی کھاتا ہے نہ مالک کی ۔ مزدورکو جاننا چاہیئے کہ وہ اپنی کمائی کی اجرت حاصل کرتا ہے نہ صاحب کار کی مفت میں دی گئی بخشش .ہرملازم کو ایمان رکھنا چاہیئے کہ وہ اپنے کام کی مزدوری حاصل کرتا ہے نہ رئیس یا حکومت مربوطہ ادارہ یامعاشرے کا تحفہ ۔

آخرکارآزاد انسان کو خدا کے علاوہ کسی سے امید نہیں باندھنی چاہیئے اور کسی کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرنا چاہیئے ورنہ اس کے باطن میں وہی پستی اورشرک کی غلامی پیدا ہوجائے گی جس کے آشکارا طورپربت پرست شکارہیں ۔

پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے، بیکاری کی عادت کرنے والوں اوراپنا بوجھ دوسروں پرڈالنے والوں پرلعنت بھیجی ہے ۔

دور حاضر میں اجتماعی اور نفسیاتی تحقیقات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی برائیوں کا ایک بڑا حصہ ۔بیکاری کی وجہ سے ہے ۔یہی ۔بیکاری ہے جو معاشرے کے اقتصاد اورثقافت کے پہیے کو چلنے سے روکتی ہے اور ہر قسم کے اخلاقی زوال اور خرافات پرستی کو رواج بخشتی ہے ۔

کھیتی باڑی اور اس کے فائدے

کھیتی باڑی جس کے ذریعہ معاشرے کے لئے اناج مہیا کئے جاتے ہیں اپنی اہمیت کے پیش نظر انسان کے پسندیدہ ترین مشغلوں میں شمار ہوتی ہے ، اسی لئے اسلام میں اس شغل کو اختیار کرنے کی بہت تاکید کی گئی ہے ۔

چھٹے امام، حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :

"قیامت کے دن کاشت کاروں کا مقام ہر مقام سے بلندتر ہوگا ۔"[2]

پانچویں امام حضرت امام محمدباقرعلیہ السلام فرماتے ہیں :

"کوئی بھی کام کھیتی باڑ ی سے بہتراور اس کا فائدہ اس سے زیادہ عمومی نہیں ہے۔کیونکہ نیک وبد،چرند وپرند سب اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اورزبان حال سے کسان کے لئے دعا کرتے ہیں ۔[3]

دوسرونکے سہارے زندگی گزارنے کے نقصانات

"طفیلی زندگی"یعنی دوسروں کی امید اور پشت پناہی میں زندگی گزارنا۔ حقیقت میں ایسی زندگی، انسانی فخر،شرافت اورآزادی کو کھودینے اور تمام اجتماعی برائیوں اور جرم وگناہ کا باعث ہے کہ جس کا سرچشمہ ذلت وخواری ہے ۔

جودوسرو ں کے سہارے ہوتا ہے اس کی نگاہ لوگوں کی دست کرم پر ہوتی ہے ، وہ حقیقت میں اپنے ارادہ و ضمیر کو اس راہ میں بیچ دیتا ہے ، اسے کرم فرما کی چاپلوسی کرنی پڑتی ہے وہ اس سے جو کچھ چاہتا ہے خواہ "حق ہو یا باطل اچھا ہویابُرا"وہ اسے انجام دینے پر مجبورہوتا ہے۔اورہر ننگ وعار کو قبول کرنے ، اجنبی پرستی ،ہر ظلم و بے انصافی پر راضی ہو جانے اورآخر کار، تمام انسانی قواعد وضوابط کو پامال کرنے پر بھی مجبور ہوتا ہے۔

اسلام میں ضرورت کے بغیر سوال کرنا حرام ہے ،فقراء کی مالی امداد،جو اسلامی ضوابط میں ہے ،صرف ان فقیروں سے مربوط ہے کہ جن کی آمدنی ان کے اخراجات کے لئے کافی نہ ہو یا کوئی کاروبارنہ ہو۔

ناپ تول میں کمی کی سزا

اسلام کی نظر میں ناپ تول میں کمی کرنا گناہ کبیرہ ہے ۔خدائے متعال اس گناہ کے مرتکب افراد کی سرزنش اور مذمت کرتے ہوئے فرماتا ہے :

(ویل للمطفّفینo اَلاَ یظُنّ اولئک أنھم مبعوثونo لیوم عظیم) (مطفّفین ۱ ـ ۵)

"ویل ہے ان کے لئے جو ناپ تول میں کمی کرنے والے ہیں...کیا انھیں یہ خیال نہیںہے کہ یہ ایک روز دوبارہ اٹھا ئے جانے والے ہیں؟۔"

ناپ تول میں کمی کرنے والا، لوگوں پر ظلم کرنے کے علاوہ، ان کے مال کو چوری کے راستہ سے لوٹتا ہے، لوگوں میں اپنے اعتماد کو کھودیتا ہے اور رفتہ رفتہ اپنے گاہکوں اور اس کے بعد اپنے مال سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

ظلم و ستم کی برائی

خدائے متعال نے اپنے کلام پاک میں سیکڑوں بار "ظلم" کا ذکر کیا ہے اور اس بری صفت جو درندوں کی خصلت ہے کی مذمت کی ہے(قرآن مجید کے دوتہائی سوروں میں ، جو مجموعاً ۱۱٤ سورے ہیں، ظلم کا ذکر کیا گیا ہے)

ایسا کوئی انسان پایانہیں جاسکتا کہ جس نے اپنی فطرت سے ظلم کی برائی کو درک نہ کیا ہو، یا کم ازکم یہ نہ جانتاہوکہ ظلم و ستم نے انسانی معاشرے کے پیکر پر کتنی دردناک مصیبتیں ڈھائی ہیں اور کتنا خون بہایاہے اور کتنے گھروں کو ویران کیا ہے۔

تجربے سے یقینی طورپرثابت ہوا ہے کہ ظلم و ستم کے محل کتنے ہی مضبوط کیوںنہ ہوں پائدار نہیں ہوتے اور کسی نہ کسی وقت ظالموں کے سروں پر گر کرڈھیر ہوجاتے ہیں۔ خدائے متعال فرماتاہے:

(...ان اللہ لا یھدی القوم الظّٰلمین) (انعام/۱٤٤)

"...خدائے متعال ہرگز ظالموں کی ہدایت نہیں کرتا ہے."

اولیائے دین فرماتے ہیں:

"سلطنت اور ملک ، کفر سے باقی رہ سکتا ہے، لیکن ظلم و ستم سے باقی نہیں رہ سکتا"(4)

مردم آزاری اور شرارت حرام ہے

یہ دو صفتیں ایک دوسرے کے نزدیک ہیں، کیونکہ "اذیت"پہنچانا، دوسروں کو زبان سے رنج و تکلیف پہنچاناہے، جیسے گالی دینا اور ایسی بات کہنا جس سے مخاطب رنجیدہ ہوجائے یا ہاتھ سے کوئی ایسا کام انجام دینا جس سے لوگ ناراض ہوجائیں۔ "شرارت" ایسا کام انجام دینا جو لوگوںکے لئے "شر" کا باعث ہو۔

بہر حال یہ دو صفتیں انسان کی ان آرزؤں کے مقابلہ میں قرار پائی ہیں، کہ انسان جن تک پہنچنے کے لئے اجتماع کو وجود میں لایا ہے، کہ وہ زندگی کی آرام و آسائش ہے۔

یہاں پر اسلام کا شرع مقدس، معاشرے کی مصلحت کو پہلے درجہ میں قرار دیتا ہے اور مردم آزاری و شرارت کو حرام قرار دیتا ہے، چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے:

(وَالَّذین یُوذون المؤمنین و المومنات بغیر ما اکتسبوا فقد احتملوا بھتٰنا و اثماً مبیناً) (احزاب۵۸)

"اور جو لوگ صاحبان ایمان مرد یا عورت کو بغیر کچھ کئے دھرے اذیت دیتے ہیں، انہوں نے بڑے بہتا ن اور کھلے گناہ کا بوجھ اپنے سرپر اٹھا رکھا ہے۔"

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"جس شخص نے کسی مسلمان کو اذیت پہنچائی، اس نے مجھے اذیت پہنچائی اور میری اذیت خدا کی اذیت ہے، ایسے شخص پر توریت، انجیل اور قرآن مجید میں لعنت کی گئی ہے۔"[5]

چوری

چوری ایک برا اور نامناسب مشغلہ ہے جو معاشرے کی اقتصادی حیثیت کو خطرہ میں ڈالتا ہے۔ بدیہی ہے کہ انسان کی زندگی کے ابتدائی ضروریات میں سے مال و ثروت ہے جسے انسان اپنی عمر کی قیمت پر حاصل کرتا ہے او راس کی حفاظت کے لئے اس کے گرد ایک حفاظتی دیوار بنادیتا ہے تا کہ ہر قسم کے تجاوز سے محفوظ رہے اور اس طرح اس کا مال معاشرے کی زندگی کی ضمانت او ر اس کا پشت وپناہ بن جائے۔ البتہ اس دیوار کو توڑنا اور اس نظم کو ختم کرنا ایک ایسی عمر کے سرمایہ کو تباہ کرنے کے مترادف ہے کہ جس کو حاصل کرنے میں اس کی پوری عمر خرچ ہوئی ہے اور لوگوں کی سرگرمیوں کے ایک بڑے حصہ کو معطل کرنا لوگوں کے ہاتھ کاٹنے کے برابر ہے۔

اسی لئے اسلام نے اس نفرت انگیز عمل کے لئے کہ خود چور کا ضمیر بھی اس کے جرم ہونے کی گواہی دیتا ہے، یہ سزا مقرر کی ہے کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ (یعنی دائیں ہاتھ کی چار انگلیاںکاٹ دی جائیں) خدائے متعال فرماتا ہے:

(والسّارق والسّارقة فاقطعوا ایدیھما جزائً بما کسبا) ...)

(مائدہ۳۸)

"چو رمرد او رچور عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو کہ یہ ان کے لئے بدلہ اور خدا کی طرف سے ایک سزا ہے..."

فرض شناسی

زندگی کے یہ بے شمار وسائل جو آج کل ہم انسانوں کے اختیار میں ہیں اور ہم ان کو حاصل کرنے اور ان سے استفادہ کرنے کے لئے دن رات کوشش کرتے ہیں، ابتداء میں انسان کے اختیار میں نہیں تھے، بلکہ انسان کی سرگرمیوں کے نتیجہ میں تدریجاً وجود میں آئے ہیں اور ان سے استفادہ کیا جارہاہے۔ لیکن بہر صورت ابتدائی بشر سے لیکر آج کے متمدن انسان تک ہرگز کار و کوشش کا سلسلہ نہیں رکاہے بلکہ انسان نے اپنی خدا داد فطرت کے ذریعہ اپنی زندگی کے وسائل فراہم کرنے کی کوشش کی ہے، کیونکہ جس انسان کی وجودی توانائی کی سرگرمی ٹھپ ہو جاتی ہے تو اس کو مسلح کرنے کے داخلی و خارجی وسائل، آنکھ ، کان، منہ، ہاتھ ، پاؤں، دماغ،دل ، پھیپھڑے اور جگر وغیرہ بے کار ہوجائیں گے، اور وہ مردہ کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا۔

اسی لئے انسان نہ صرف مجبور ہو کر کام کرتا ہے ،بلکہ اس جہت سے بھی کہ وہ انسان ہے لہذا گوناگونسرگرمیاں انجام دیتا ہے ،کیونکہ وہ اپنے انسانی شعور سے درک کرتا ہے کہ جس راہ سے بھی ممکن ہو ،وہ اپنی زندگی کی سعادت اور خوشبختی کو حاصل کرے ،اس لئے کاروکوشش میں لگ جاتا ہے اوراپنے مطالبات کی راہ میں قدم رکھتا ہے ، لہذا انسان جس ماحول اور جس روش پر زندگی گزارتا ہے خواہ:دینی ہویا غیردینی ،قانونی ہو یا استبدادی اورشہری ہویاخانہ بدوشی کی، اس میں اپنے لئے کچھ تکالیف وفرائض (وہ کام جن کا زندگی میں انجام دینا لازم جانتا ہے) کااحساس کرتا ہے کہ ان کوانجام دینے میں انسان کی حقیقی آرزوئوں کوپورا کرسکتا ہے اوراس کے لئے خوشحالی کی اور آسودہ و سعادتمندانہ زندگی فراہم کرسکتا ہے ۔

البتہ ان تکالیف اور فرائض ،جوسعادتمندی کی تنہا راہ ہے ،کی قدروقیمت خود انسانیت کی قدر و قیمت ہے کہ ہم اس سے زیادہ گراں بہا کسی چیز کا تصور نہیں کرسکتے اوراسے کسی دوسری چیز سے بدل نہیںسکتے ۔

اس بناپر "فرض شناسی"اور اسکا انجام دینا عمل کے میدان میں اہم ترین مسئلہ ہے کہ اس کا سروکار انسان کی زندگی سے ہے ،کیونکہ اس کی اہمیت خود انسان کی اہمیت ہے ،جو شخص اپنے مسلمہ فرائض کوانجام دینے میں پہلو تہی کرتا ہے ،یا کبھی کوتاہی کرتا ہے ،تو وہ اسی کے مطابق انسانیت کی بلندی سے گرجاتا ہے اور فطری طورپر اپنی پستی اور بے قیمتی کا اعتراف کرتا ہے یا جوبھی خلاف ورزی کرتا ہے ،وہ اپنے معاشرے کے پیکر پر بلکہ حقیقت میں اپنے پیکر پر ایک کاری ضرب لگاتاہے ۔

خدائے متعال فرماتاہے :

(والعصرٌانّ الانسٰن لفی خسرٌالا الّذین آمنوا وعملواالصّٰلحت وتواصوا بِالحق وتواصوابالصّبر)

(عصر ۱ ۳)

"قسم ہے عصر کی بیشک انسان خسارہ میں ہے .علاوہ ان لوگوں کے جوایمان لائے اورانہوں نے نیک اعمال انجام دئے اور ایک دوسرے کو حق اورصبر کی وصیت و نصیحت کی۔"

نیز فرماتا ہے :

(ظهر الفساد فی البرّوالبحر بماکسبت ایدی النّاس) ...)

(روم ٤١)

"لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی کی بناپر فساد خشکی اورتری ہر جگہ غالب آگیا ہے ۔"

فریضہ کی تعیین میں مختلف روشوں کا اختلاف

عالم انسانیت میں فریضہ کوپہچاننے اور اس پر عمل کرنے کی اہمیت بذات خود ایک پائدارو مسلم فریضہ ہے اورہرگز کوئی ایسا انسان نہیں پایاجاسکتا جواپنی انسانی فطرت سے اس حقیقت کامنکر ہو ۔

جی ہاں ،چونکہ انسانی فرائض انسان کی زندگی کی سعادت سے مکمل رابطہ رکھتے ہیں اوردین انسانی زندگی کے بارے میں غیردینی طریقوںسے نظریاتی اختلاف رکھتا ہے لہذادینی فرائض،دوسرے فرائض کی روشوں سے اختلاف رکھیں گے۔

دین کا عقیدہ ہے کہ انسان کی زندگی ایک لامحدوداورابدی ہے ،جوموت سے ختم نہیںہوتی اور موت کے بعداس ابدی زندگی کاسرمایہ وہی صحیح عقائد،پسندیدہ اخلاق اوراعمال صالحہ ہیں جنھیں انسان نے دنیا میں حاصل کیا ہے۔

اس لحاظ سے دین نے جو فرائض اورتکالیف فرداورمعاشرہ کے لئے مرتب کئے ہیں، ان میں اس ابدی دنیاکی زندگی کو بھی مدنظر رکھا ہے ۔

دین اپنے قوانین کوخداشناسی اورخداکی عبادت وبندگی کی روشنی میں مقرّر کرتا ہے جس کاواضح اثرموت کے بعد قیامت کے دن ظاہر ہو گا ۔

غیر دینی طریقے (جوبھی ہوں)صرف اس دنیا کی چند روزہ زندگی کو مدنظر رکھتے ہیں اور انسان کے لئے کچھ فرائض وضع کرتے ہیں تا کہ ان کے ذریعہ مادی زندگی اور جسمانی قوای جو تمام حیوانوں میں مشترک ہیں،سے بہتر استفادہ کریں۔ حقیقت میں یہ طریقے ایک حیوانی زندگی کو انسان کے لئے مرتب کرتے ہیں کہ جس کی منطق کا سرچشمہ چرندوں اوردرندوں کے جذبات ہوتے ہیں اور انسان کی حقیقت پسندی اور اس کی معنویات سے بھری ابدی زندگی کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے۔

یہی وجہ ہے کہ انسانیت کے بلند اخلاق (جیسا کہ قطعی تجربات سے ثابت ہے) غیر دینی معاشروں سے رفتہ رفتہ ختم ہورہے ہیں اور روزبروز ان کا اخلاقی انحطاط و اضح و آشکارتر ہوتاجارہاہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں: دین کی بنیاد، تقلید پر ہے، یعنی چون وچرا کے بغیر فرائض اور قوانین کے ایک سلسلہ کو قبول کرنا، لیکن اجتماعی طریقے وقت کی منطق کے ساتھ قابل مطابقت ہیں۔

جنہوں نے یہ بات کہی ہے، انہوں نے اس نکتہ سے غفلت کی ہے کہ جو قوانین و ضوابط معاشرے میں نافذ ہوتے ہیں، ان کو بلا چون و چرا نافذ ہونا چاہئے۔

ہرگز یہ نہ دیکھا گیا ہے اور نہ ہی سنا گیا ہے کہ کسی ملک میں لوگ ملک میں لاگو قوانین پر مناظرہ اور بحث و گفتگو کے بعد ان پر عمل کرتے ہوں اور جو بھی ان قوانین کے فلسفہ کو نہ سمجھ سکا وہ اس پر عمل کرنے سے معاف ہو اور ان کو قبول کرنے میں مختار ہو، اس سلسلہ میں دینی اور غیر دینی روش میں کوئی فرق نہیں ہے۔

لیکن کسی ملک کے فطری اور اجتماعی حالات کا مطالعہ اور اس کی عام روش میں جستجو کرکے اس ملک کے قوانین کے کلیات کی حکمت کے کچھ جزئیات معلوم کئے جاسکتے ہیں۔

دینی قوانین میں بھی یہی خاصیت پائی جاتی ہے۔ حقیقت پسندانہ راہ سے اور خلقت اور انسان کی فطری ضرورتوں کے بارے میں جستجو کرکے دین کے قوانین کے کلیات جو فطری روش ہے کے بارے میں بعض جزئیات کو معلوم کیا جاسکتا ہے۔

قرآن مجید اور بہت سی روایتیں انسان کو سوچنے، غور و فکر اور تدبر کی دعوت دیتی ہیں اور بعض احکام میں اجمالی مصلحت کے بارے میں حکم یا اشارہ کیا جاتا ہے، چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم اور اہل بیت اطہار علیہم السلام سے احکام کے فلسفہ کے بارے میں بہت سی روایتیں نقل ہوئی ہیں اور در دست ہیں۔

دفاع کی اہمیت

جس طرح ایک انسان اپنی زندگی میں خوشبختی اور سعادت کا شیدائی ہوتا ہے اور ان کو حاصل کرنے میں سرگرم عمل ہوتا ہے، اسی طرح وہ ہر طرف سے بے شمار خطرات سے بھی دوچار ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض خطرے اس کے اصل وجود کو اور بعض اس کی زندگی کی سعادت و خوشبختی کو نشانہ بناتے ہیں، اس لئے انسان ان کو دور کرنے کے لئے مقابلہ اور دفاع کرنے پر مجبور ہے۔

انسان کی خلقت میں بھی ان ہی دو مرحلوں "جذب و دفع" کی پیشنگوئی کی گئی ہے، اور اس کے وجود کی عمارت میں مناسب وسائل استعمال ہوئے ہیں۔ اسی طرح معاشرہ کے کچھ فوائد ہیں کہ جنھیں حاصل کرنا چاہئے اور بعض خطرات سے بھی دوچار ہے کہ بہر حال ان کے مقابلہ میں کھڑے ہوکر اپنی زندگی کے مقدسات کا دفاع کرنا چاہئے۔

جس نے لوگوں کی جانوں کو ختم کرنے ، آزادی کے پرچم کو سرنگوں کرنے یا ان کی آزادی کو ختم کرنے کو اپنا مقصد قرار دیا ہے، وہ معاشرے کا دشمن ہے۔ انسان کا فقر و ایمان کی کمزوری اور نادانی معاشرے کے دشمن ہیں ، جو اپنے معاشرے ، یعنی زندگی کی سعادت اور انسانی حقیقت کا پابند ہے، اسے اپنے ان خطرناک دشمنوں کے مقابلہ میں دفاع کرنا چاہئے۔

بخش دین

اس میں کوئی شک و شبہہ نہیں ہے کہ انسان کے ضمیر میں ، اصل زندگی اور شرافت مندانہ زندگی کی ایک ہی بنیاد ہے اور جو زندگی شرافت کے ساتھ ہو لیکن انسان کی سعادت اس میں نہ ہو، تو وہ حقیقت میں زندگی نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی موت ہے جو طبیعی موت سے تلخ و ناگوار ہے، جو انسان اپنی شرافت و سعادت کی اہمیت کا قائل ہے، اسے اس پست زندگی سے موت کی طرح فرار کرنا چاہئے۔

انسان جس ماحول میں بھی رہ رہا ہو اور جس روش کی طرف بھی مائل ہو، وہ اپنی خدا داد فطرت سے سمجھتا ہے کہ محترم و مقدس میں موت، بذات خود ایک سعادت ہے، دین کی منطق میں یہ مسئلہ دوسری ہر منطق سے زیادہ واضح اور وہم و گمان کے خرافات سے نہایت دور ہے، جو شخص دین کے حکم سے اپنے دینی معاشرے کا دفاع کرتے ہوئے اپنی جان نچھاور کردے ،وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ کسی چیز سے محروم نہیں ہوا ہے بلکہ اس نے اپنی چند روزہ زندگی کو خدا کی راہ میں پیش کرکے ایک نہایت شیرین، گراں بہا اور ابدی زندگی کو حاصل کیا ہے اور یقینا اس کی سعادت ناقابل زوال ہے .چنانچہ خدائے متعال اپنے کلام میں فرماتا ہے :

(ولاتحسبن الّذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتاً بل احیائ عند ربّھم یرزقون) (آل عمران ١٦٩)

"اور خبردار راہ خدا میں قتل ہونے والوں کو مردہ خیال نہ کرنا وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے یہاں رزق پارہے ہیں"

لیکن غیر دینی طریقے،جو انسان کی زندگی کو اسی دنیا کی چند روزہ زندگی تک محدود جانتے ہیں،ہرگز نہیں کہہ سکتیں کہ انسان مرنے کے بعد بھی زندہ ہوتا ہے یا سعادت و خوشبختی حاصل کرتا ہے ، مگر یہ کہ وہم و گمان اور خرافات سے سمجھ میں آجائے کہ جو وطن یا قومی مقدسات کی راہ میں قتل ہوجاتا ہے ،اس کا نام جاں نثاروں اور قوم کے فداکاروں کی فہرست میں قرار پاسکتا ہے اور تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جاسکتا ہے اور ہمیشہ کے لئے زندہ وجاوید رہ سکتا ہے ۔

لیکن جو تمجید اور تعظیم اسلام میں خدا کی راہ میں شہید ہونے اور قتل کئے جانے کے سلسلے میں کی گئی ہے ،وہ کسی اور صالح عمل کے لئے نہیں کی گئی ہے ۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :

"ہرنیکی سے بالاتر ایک نیکی ہے یہاں تک کہ راہ خدامیں شہید ہو جائے ،اس کے بعد کوئی نیکی نہیں ہے ۔"[6]

صدر اسلام کے مسلمان پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے استغفار کی درخواست کرتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا کے نتیجہ میں شہادت کے اعلی درجہ پر فائز ہوتے تھے اور شہادت کے ذریعہ دنیا سے چلے جانیوالوں کے لئے گریہ نہیں کرتے تھے، کیونکہ وہ زندہ ہیں اور نہیں مرے ہیں۔

مال کی زکواۃ

مال سے انسان کی زندگی میں جو اعتدال پیدا ہوتا ہے، وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ اسکی اہمیت کا عالم یہ ہے کہ بہت سے لوگ زندگی مال کو ہی جانتے ہیں اور انسان کے لئے مال و دولت کے علاوہ کسی فضیلت و شرافت کے قائل نہیں ہیں۔ اور اپنی تمام سرگرمیوں کو پیسے جمع کرنے اور مال ذخیرہ کرنے میں صرف کرتے ہیں اور نتیجہ میں مال سے یہی دلبستگی اور حرص ان کو بخل کی صفت میں مبتلا کر دیتی ہے کہ جس کی بنا پر وہ دوسروں کو ان کے حق سے محروم کرتے ہیں اور کبھی اس سے بلند تر قدم اٹھا کر پستی اور بخل کے سامنے تسلیم ہو کر خود بھی اس مال سے بہرہ مند ہونے سے محروم ہو جاتے ہیں، اس طرح نہ خود کھاتے ہیں اور نہ دوسروں کو کھلاتے ہیں اور صرف پیسے جمع کرنے میں لذت محسوس کرتے ہیں۔

جو افراد بخل کی ناپسندیدہ صفت میں مبتلا ہیں (البتہ کنجوسی میں مبتلا ہونے والے ان لوگوں سے پست ہیں) وہ انسانی فطرت سے گر جاتے ہیں اور زندگی کے بازار میں دیوالیہ ہوتے ہیں، کیونکہ:

۱۔ زندگی میں، صرف اپنی سعادت، خوشبختی اور آسودگی کو چاہتے ہیں اور انفرادی زندگی کے قائل ہوتے ہیں، جبکہ انسان کی فطرت نے اجتماعی زندگی کو ہمارے لئے زندگی کے عنوان سے پہچنوایا ہے اور انفرادی زندگی جس راہ سے بھی ہو، اس کا انجام ناکامی ہے۔

۲۔ اپنی قدرت کا دوسروں کے سامنے مظاہرہ کر کے محتاجوں اور ناداروں کی خاطر و تواضع کو اپنی طرف جذب کرتے ہیں اور باوجودیکہ محتاجوں کی کوئی مدد نہیں کرتے لیکن پھر بھی ان سے ہمیشہ اپنی تعظیم کرانا چاہتے ہیں، ان کے ساتھ غلاموں کا سلوک کرتے ہیں اور بت پرستی کا جذبہ زندہ رکھتے ہیںجس کے نتیجہ میں معاشرے سے ہر قسم کی شہامت، شجاعت، فطرت کی بلندی اور انسانی فخر و مباہات ختم ہو جاتے ہیں۔

۳۔ اس کے علاوہ کہ وہ خود پاک جذبات، محبت، مودت، انسان دوستی، خیر خواہی اور انسانی ہمدردی کو پامال کرتے ہیں، معاشرے میں جرم و خیانت اور ہر قسم کی پستی و رذالت کو ترویج دیتے ہیں، کیونکہ جرم و جفا، جیسے: بدگوئی، بے حیائی، چوری، ڈاکہ زنی اور آدم کشی کا قوی ترین طبیعی عامل محتاجوں کے طبقہ میں موجود فقر و فاقہ غیظ و غضب اور کینہ وہ انتقامی جذبہ ہے جو مالداروں کے بارے میں ناداروں اور بیچاروں کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے، کہ اس کے بخیل اور کنجوس مالدار اس کے باعث ہوتے ہیں۔ یہی

وجہ ہے کہ معاشرے میں بخیل شخص در حقیقت معاشرہ کا سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے، بہرحال وہ خدا کے غضب وسخت سزا اور لوگوں کی نفرت میں گرفتار ہوگا ۔

قرآن مجید میں بخل اور کنجوسی کی ناپسند صفتوں کی مذمت اور سرزنش میں اور اس کے برعکس جود وسخاوت، اور خدا کی راہ میں انفاق اور ناداروں و بے چاروں کی دستگیری کرنے والوں کی مدح وثناء میں بہت سی آیتیں نازل ہوئی ہیں ۔

خدائے متعال اپنے کلام پاک میں وعدہ کیا ہے کہ ،جومال انفاق کیا جاتا ہے ، اس کے عوض دس اور بعض مواقع میں ستر بلکہ سات سو سے بیش تر تک اضافہ کرکے انفاق کرنے والے کو واپس بھیجا جاتا ہے۔

تجربہ سے بھی ثابت ہوا ہے کہ سخی لوگ جب جوانمردی کے ساتھ حاجتمندوں کی مدد کرتے ہیں اور انسانی معاشرے کی مشکلات کو دور کرتے ہیں تو روز بہ روز ان کی دولت او ر نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔

کار گرہ گشا نشود در زمانہ بند
ہزگر کسی ندید در انگشت شانہ بند

اگر لوگ کسی دن مشکلات سے دوچار ہوجائیںتو تمام دل ان کے ساتھ ہوں گے، انہوں نے جو دوسروں کے حق میں مدد کی ہے وہ اجتماعی صورت میں ان کے حق میں لوٹے گی ۔ اور اس کے علاوہ انہوں نے اپنے اچھے کردار سے ایک شریف انسان کے مانند اپنے ضمیر کو آرام بخشا ہے، واجب اور مستحب حقوق کے بارے میں ندائے آسمانی کو لبیک کہا ہے اور انسانیت کے پاک جذبات سے مہربانی، شفقت، انسان دوستی اور خیر خواہی سے استفادہ کیا ہے، اس طرح عام محبوبیت اور خالص احترام کے مستحق ہوئے اور آخر کار خدا کی خوشنودی او رابدی سعادت کو کم ترین قیمت پر خرید لیا ۔

علم کی زکواۃ

"علم او رثقافت" بے نظیر دولت ہے، جن سے انسان اپنی زندگی میں ہرگز بے نیاز نہیں ہوتا ہے اور ایسا انسان نہیں پایا جاسکتا ، جو اپنی انسانی فطرت سے جہل پر علم کی برتری کو درک نہ کرتا ہو یا علماء اور دانشوروں کے احترام میں ان کے حق میں فیصلہ نہ دیتا ہو۔

خدائے متعال اپنے کلام پاک میں عالم و جاہل میں فرق کے بارے میں زندہ و مردہ اور بینا و او رنابینا کی مثال دیتا ہے۔ اوراسلام میں علم و دانش کو جو اہمیت دی گئی ہے، وہ اہمیت کسی اور دین میں نہیں پائی جاتی، یہاں تک کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے "[7]

نیز فرماتے ہیں:

"گہوارہ سے قبر تک علم حاصل کرو چاہے دنیا کے اس پار بھی ہو۔ "[8]

اسی کے پیش نظر اسلام نے بخل اور کنجوسی کی نہی کی ہے۔ علم کو چھپانے کی مذمت کی ہے، بلکہ دینی علوم کو چھپانا حرام قرار دیا ہے اور عالم کو جاہل کی تربیت کرنے کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔

معاشرے کے اندرونی دشمنوں سے مقابلہ

چنانچہ ، فطرت کے حکم سے، معاشرے کے بیرونی دشمنوں سے جنگ کرنی چاہیئے اور معاشرہ کو نقصان سے بچانا چائے اور ، اسی طرح معاشرے کے اندرونی دشمنوں سے بھی جنگ او رمقابلہ کرنا چاہیئے۔ معاشرے کا اندرونی دشمن وہ ہے جو عام روش او رجاری قوانین کی مخالفت کرتا ہے اور اس طرح معاشرے کی زندگی کے ناطے کو توڑدیتا ہے اور جاری نظام کو درہم و برہم کردیتا ہے، اس لئے نظم و نسق ، امور کی حفاظت اور معاشرے میں امن و امان برقرار رکھنے کے لئے کچھ افراد پر مشتمل پلیس و غیرہ کا نظام تشکیل دیا جاتا ہے اور خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے مختلف سزائیں مقرر کی جاتی ہیں۔

اسلام نے بھی قوانے نافذہ کے علاوہ، معاشرے کے افراد کے لئے مختلف سزائیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو واجب قرار دیا ہے اور اس طرح مقابلہ کو مزید عوامی اور موثر تر بنادیا ہے۔

اسلام اور معاشرے کی دوسری روشوں کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ دوسری روشیں صرف لوگوں کے افعال و اعمال کی اصلاح کی طرف توجہ کرتی ہیں ، لیکن اسلام لوگوں کے افعال کے علاوہ ان کے اخلاق کی طرف بھی توجہ کرکے دونوں مرحلوں میں فساد کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے۔

جن اعمال کو اسلام نے گناہ اور معصیت کے طور پر حرام قرار دیا ہے، وہ ایسے اعمال ہیں جن سے معاشرے میں بُرے اثرات اور منحوس نتائج بر آمد ہوتے ہیں، اس توصیف کے پیش نظر ان میں سے بعض اعمال براہ راست مرتکب ہونے والے ایک فرد یا تمام افراد کو برباد کردیتے ہیں کہ جس کی وجہ سے انسان کے کسی عضو میں زخم کے مانند معاشرے میں رخنہ ڈالتا ہے۔ اکثر گناہ جو انسان کی بندگی کی حالت میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں او رالٰہی حقوق کو ضرر پہنچاتے ہیں، ان کی بھی یہی حالت ہے، جیسے نماز نہ پڑھنا اور روزہ نہ رکھنا و غیرہ۔

ان میں سے بعض اعمال اجتماعی زندگی کے لئے بالواسطہ خطرہ بنتے ہیں، معاشرے کے پیکر کو تباہ وبرباد کرکے رکھدیتے ہیں۔ ان کی مثال ان بیماریوں کی سی ہے جو براہ راست انسان کی زندگی سے سروکار رکھتی ہیں اور زندگی کے رشتہ کو توڑ دیتی ہیں جیسے جھوٹ بولنا اور تہمت لگانا اسلام کی نظر میں ماں باپ کے حقوق، غیبت اور لوگوں پر تجاوز کا بھی یہی حکم ہے۔

اسلام میں گناہان کبیرہ کی عام سزا

مذکورہ بُرے اعمال، اسلام میں گناہان کبیرہ کہے جاتے ہیں اور خدائے متعال نے اپنے کلام پاک میں واضح طور پر ان گناہوں کے مرتکب لوگوں کے لئے عذاب کا وعدہ دیا ہے۔

اس کے علاوہ ان میں سے بعض کے بارے میں سخت سزائیںمقّرر کی ہیں۔ کلی طور پر ان گناہونکے مرتکب لوگ (اگر ایک ہی بار بھی انجام دیں) عدل و انصاف کا خاتمہ کرتے ہیں، یعنی معاشرے کے ایک صالح عضو سے اس کی شرافت کو سلب کرتے ہیں۔

جو شخص گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتاہے وہ اپنی عدالت کو کھودیتا ہے اور وہ ان اختیارات سے بہرہ مند نہیں ہو سکتا، جن سے معاشرے کا ایک صالح عضو بہرہ مند ہوتا ہے۔ وہ اسلامی حکومت میں کوئی ذمہ داری نہیں سنبھال سکتا، خلافت کے عہدہ پر فائز نہیں ہوسکتا، امام جماعت نہیں بن سکتا، اورکسی کے حق میں یامخالفت میں اس کی گواہی قابل قبول نہیں ہے اور وہ اسی حالت میں رہے گا جب تک کہ توبہ نہ کرلے اور مسلسل تقوی وپرہیزگاری سے دوبارہ "عدالت" کی صفت کا مالک بن جائے۔

۱۔ تحف العقول، ص۴۰۹۔

2۔ میزان الحکمۃ، ج۴ص۲۱۳۔

3۔ میزان الحکمۃج۴ص۲۱۳۔

4۔ امالی شیخ مفید، ص۳۱۰(حواشی میں آیا ہے)۔

5۔ الغدیر، ج۱۰، ص۳۶۸۔

6۔ میزان الحکمۃج۱، ص۴۰۰۔

7۔ اصول کافی، ج۱، ص۳۰، ح۱۔

8۔ نہج الفصاحہ، ص۶۴، ج۳۲۴، ۳۲۷۔

احکام کے بارے میں چند سبق

اجتہاد اور تقلید

انسان کی زندگی میں پائی جانے والی حاجتیں اوران کو پورا کرنے کے لئے ان کی سرگرمیاں، اتنی زیادہ ہیں کہ ایک معمولی انسان ان کو گننے اور شمار کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، ان سب کے بارے میں اور مہارت حاصل کرکے کافی مقدار میں معلومات حاصل کرنے کی بات ہی نہیں!

دوسرے یہ کہ انسان اپنے کام کو فکروارادہ سے انجام دیتا ہے اور جہاں پر اسے کوئی فیصلہ کرنا ہو،تو اس کے بارے میں اس کے پاس کافی معلومات ہونا چاہئے ورنہ وہ کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا اس کو اپنے انجام دینے والے کاموں میں خود ماہر ہونا چاہئے یا کسی ماہر سے پوچھے اوراس کے حکم کے مطابق اس کام کو انجام دے ۔چنانچہ فطری طورپر ہم مریضوں کاعلاج کرنے کے لئے طبیب سے،مکان کانقشہ بنانے کے سلسلہ میں انجینئر سے ،معماری میں معمار سے رجوع کرتے ہیں اور دروازے اورکھڑکیاں بنانے میں نجّار پر اعتماد کرتے ہیں ۔

پس ہم ہمیشہ بہت کم کاموں کے علاوہ اپنے دوسرے تمام مسائل میں تقلید کرتے ہیں۔جو یہ کہتا ہے کہ :"میں اپنی زندگی میں تقلید کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالتا ہوں"وہ شخص یا اپنی بات کے معنی کو نہیں سمجھا ہے یا ایک فکری آفت میں بتلا ہوا ہے ۔

چونکہ اسلام نے اپنی شریعت کی بنیاد انسانی فطرت پر ڈالی ہے ، لہذا اسی روش کا انتخاب کیاہے۔اسلام نے اپنے پیروؤنکو حکم دیا ہے کہ دینی معارف اوراحکام کو سیکھیںّان معارف کا سرچشمہ کتاب خدااور پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وآئمہ ھدی علیہم السلام کی سنت کے علاوہ کوئی اورچیز نہیںہے ۔

بدیہی ہے کہ تمام دینی معارف کو کتاب وسنت سے حاصل کرنا،ہرایک کے بس کی بات نہیں ہے اوریہ کام مسلمانوں کے ایک خاص گروہ کے علاوہ تمام مسلمانوں کے لئے ممکن نہیں ہے ۔

اس لئے خود بخود دین کاحکم اس صورت میں نکلتا ہے کہ مسلمانوں میں سے وہ لوگ جودینی معارف واحکام کواستدلال کی راہ سے حاصل نہیں کرسکتے، انھیںّان لوگونکی طرف رجوع کرنا چاہئے جودینی احکام کودلیل سے حاصل کر چکے ہوں اوراسطرح اپنے فریضہ پر عمل کریں ۔

جو عالم دینی احکام کواستدلال کی راہ سے حاصل کرتا ہے ، اس کو"مجتہد" اور اس کے کام کو"اجتہاد"کہا جاتا ہے اورجو مجتہد کی طرف رجوع کرتا ہے اس کو "مقلد" اور اس کے اس کام کو"تقلید"کہتے ہیں ۔

البتہ اس نکتہ کو جاننا چاہئے کہ تقلید، عبادت، معاملات اور دین کے دوسرے عملی احکام میں جائز ہے ، لیکن اصول دین میں ،جو اعتقادی مسئلہ ہے، کسی صورت میں کسی کی تقلید نہیں کی جا سکتی ہے۔کیونکہ اصول دین میں ایمان وعقیدہ ضروری ہے نہ عمل، اس لئے دوسروں کے ایمان کو اپنا ایمان فرض نہیں کیا جا سکتا ہے ،یعنی یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ خدا ایک ہے اس دلیل پر کہ ہمارے والدین یا عالم ایسا کہتے ہیں ۔یا مرنے کے بعد زندگی حق ہے ، کیونکہ تمام مسلمان اس کا عقیدہ رکھتے ہیں ۔

اس لئے ہر مسلمان پر واجب ہے کہ اپنے اصول دین کو دلیل کی راہ سے جانے اگرچہ سادہ طریقہ سے ہی ہو۔

نجاسات

نجاسات (نجس چیزیں)چند چیزیں ہیں :

ا و ۲:پیشاپ اورپاخانہ۔ (1)

اس حرام گوشت حیوان کاپیشاب اورپاخانہ نجس ہے جو خون جہندہ رکھتا ہویعنی وہ حیوان جس کی رگ کاٹنے پر خون اچھل کر نکلے ، جیسے:بلی ، لومڑی ،خرگوش وغیرہ ،بلکہ اگر مرغی یا کوئی دوسرا حیوان ،جو نجاست کھانے کی وجہ سے حرام گوشت بن چکا ہو ، تو اس کا بھی پیشاب وپاخانہ نجس ہے ۔

٣۔خون جہندہ رکھنے والے حیوانوں کا مردار، خواہ حلال گوشت ہوں یا حرام گوشت، لیکن حرام گوشت حیوان کے بعض اجزاء جیسے ،اون ،بال اورناخن جو جان نہیں رکھتے ہیں پاک ہیں ۔

٤۔خون جہندہ رکھنے والے حیوانوں کا خون ، خواہ حلال گوشت ہوں یا حرام گوشت۔

٥و٦۔ خشکی میں رہنے والے کتے اور سور ، ان کے تمام اجزاء یہاں تک کہ ان کے بال بھی نجس ہیں ۔

٧۔شراب اور مست کرنے والی ہر سیال چیز۔

٨۔آب جو ۔

مطہّرات

(پاک کرنے والی چیزیں)

ہروہ چیز جس سے نجاست پاک کی جاتی ہے ، اسے (مطہر)کہتے ہیں اور مطہرات درج ذیل ہیں :

۱۔پانی،

یہ ہر نجس ہوئی چیز کو پاک کرتا ہے، لیکن یہ اس صورت میں ہے کہ پانی مطلق ہو۔ اسلئے مضاف پانی، جیسے ہندوانہ اورگلاب کے پانی سے نجاست پاک نہیں ہوتی اوران سے وضوو غسل بھی صحیح نہیں ہے ۔[2]

۲۔زمین،

یہ جوتے کی تہ اورپائوں کے تلوے کو پاک کرتی ہے۔

۳۔آفتاب،

یہ نجس زمین اورچٹائی وغیرہ کو اپنی گرمی سے خشک کرکے پاک کرتا ہے۔

٤۔استحالہ،

یعنی نجس چیز اپنی جنس بدل کرایک پاک چیزکی صورت میں ظاہر ہوجائے۔ جیسے کتّا نمک کی کان میں گرکر نمک میں تبدیل ہو جائے۔

٥۔انتقال،

یعنی انسان کے بدن کاخون یاخون جہندہ رکھنے والے کسی حیوان کاخون ایک ایسے حیوان کے بدن میں منتقل ہوجائے جو خون جہندہ نہ رکھتا ہو۔ جیسے انسان کے بدن کا خون مچھر یا مکھی وغیرہ کے بدن میں منتقل ہوجائے ۔

٦۔عین نجاست کازائل ہوجانا،

یعنی حیوان کے ظاہراور انسان کے باطن، مثلاً اگر حیوان کی پشت یا انسان کی ناک کے اندرکاحصہ خون آلود ہوجائے ،تو خون کے زائل ہونے کے بعدپاک ہوجاتا ہے اور اسے پانی سے دھونے کی ضرورت نہیں ہے۔

۷۔ تبعیّت،

تبعیت سے مرادیہ ہے کہ ایک نجس چیزدوسری نجس چیزکے پاک ہونے سے پاک ہوجاتی ہے، جیسے کافر کے مسلمان ہونے سے اس کافرزندباپ کی تبعیت میں پاک ہو جاتا ہے۔

۸۔ کم ہونا،

یعنی انگور کاپانی ابالنے سے نجس ہو جاتا ہے، لیکن اگر ابالنے کے ذریعہ دو تہائی پانی بھاپ میں تبدیل ہو کرکم ہو جائے تو باقی پانی پاک ہوجاتا ہے۔

غسل

غسل دوطریقہ سے انجام دیا جاسکتا ہے:(ترتیبی اورارتماسی)
غسل ترتیبی سے مرادیہ ہے کہ سروگردن اور دائیں و بائیں طرف کوترتیب سے دھویا جائے۔
غسل ارتماسی یہ ہے کہ انسان یکبارگی پورے بدن کو پانی میں ڈبودے۔غسل کی دوقسمیں ہیں:واجب اور مستحب ۔دین اسلام میں مستحب غسل بہت زیادہ ہیںاور واجب غسل سات ہیں :

۱۔ غسل جنابت

۲۔ غسل میت

۳۔ غسل مس میت،یعنی اگرانسان مردہ کے بدن کوسرد ہونے کے بعد اور غسل میت دینے سے پہلے مس کرے ،یعنی اپنے بدن کا کوئی حصہ اس کے بدن سے ملائے،تواسے غسل کرنا چاہئے ۔

٤۔نذریاعہدکیا ہو یاقسم کھائی ہوکہ غسل کرے گا۔

٥۔ غسل حیض

٦۔ غسل نفاس

۷۔ غسل استحاضہ

پہلے چار غسل مردوں اور عورتوں میں مشترک ہیں اورآخری تین غسل صرف عورتوں سے مخصوص ہیں ۔
شخص مجنب پر جو چیزیں حرام ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

١۔اپنے بدن کے کسی حصہ کوقرآن مجید کے الفاظ،خدا کے نام اور پیغمبر ﷺ وائمہ اطہار علیہم السلام کے ناموں سے مس کرنا۔

٢۔مسجد الحرام اور مسجد النبی ﷺ میں داخل ہونا۔

٣۔دوسری تمام مساجد میں رُکنا اور کوئی چیزان میں رکھنا۔

٤۔قرآن مجید کے ان چار سوروں میں سے کسی ایک کی تلاوت کرنا کہ جن پر سجدہ واجب ہے۔یعنی سورہ نجعم،اقرائ،الم تنزیل اور حم سجدہ۔

جنابت،حیض،نفاس اوراستحاضہ کے تمام احکام کوتوضیح المسائل سے حاصل کرناچاہیئے۔

نوٹ۔غسل میں بھی وضوکی طرح نیت کرنالازم ہے اورغسل سے پہلے بدن پاک ہوناچاہیئے اور بدن تک پانی پہنچنے میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں ہونی چاہیئے۔

١۔پیشاب نکلنے کی جگہ صرف پانی سے پاک ہوتی ہے اورپاخانہ نکلنے کی جگہ کوپانی سے دھویا جاسکتا ہے یاپتھریا اسکے مانندتین ٹکڑوں سے پاک کیا جاسکتا ہے.البتہ یہ اس صورت میں ہے کہ پاخانہ اپنی جگہ سے باہر نہ پھیلا ہو ورنہ پانی کے بغیر پاک نہیں ہوگا۔ضمناًیاد دہانی کی جاتی ہے کہ اگرپاخانہ تین پتھر سے صاف نہ ہواتو اس سے زیادہ پتّھر سے پاک کیا جائے۔

2۔پانی کی دو قسمیں ہیں:کرُاور قلیل۔کرُپانی:بیس مثقال کم ١٢٨ من تبریزی ہے،،جوتقریباً٣٨٤کلوگرام ہوتا ہے اوراگر کوئی نجاست اس سے مل جائے،تو نجس نہیں ہوتا،قلیل پانی:وہ پانی جوکرُسے کم ہو،اگراس سے کوئی نجاست مل جائے تو وہ نجس ہوجاتا ہے اور اس کا پاک ہونا اس طرح ہے کہ جاری یابارش کے پانی سے متصل ہو جائے یااس پرایک کرُکااضافہ کیا جائے۔

وضو اور اس کے احکام

انسان کے لئے وضو سے پہلے مسواک کرنا اور کلّی کرنا مستحب ہے یعنی پاک پانی منہ میں ڈالے اور کلّی کرے ۔اس کے علاوہ استنشاق یعنی ناک میں پانی ڈالنا بھی مستحب ہے ۔

وضو کی کیفیت اوراس کے شرائط

وضومیں چہرے کو سر کے بال اگنے کی جگہ سے ٹھوڑی تک اور ہاتھوں کو کہنی سے انگلیوں کے سرے تک دھونا چاہیئے اور سر کے اگلے حصہ پر اور پیروں کے اوپری حصہ پر مسح کرنا چاہیئے ۔وضومیں مندرجہ ذیل چیزوں کا خیال رکھنا ضروری ہے :

۱ ۔وضو کے اعضاء پاک ہوں۔

۲ ۔وضو کا پانی پاک، مطلق اور مباح ہو ۔[1]

۳۔نیت:یعنی وضو کو رضائے الٰہی کے لئے انجام دینا چاہیئے ، لہذا اگر ٹھنڈک حاصل کرنے یا کسی دوسرے مقصد سے وضو کرے،تو صحیح نہیں ہے ۔

٤۔ترتیب :یعنی پہلے چہرہ پھر دایاں ہاتھ اس کے بعد بایاں ہاتھ دھونا چاہیئے، اس کے بعد سر پھر پائوں کا مسح کرنا چاہیئے۔

٥۔ موالات:یعنی وضو کے افعال یکے بعد دیگرے انجام دے اوران کے درمیان اتنا فاصلہ نہ ہو کہ کسی عضو کودھونے یا مسح کرنے کے وقت اس سے پہلا والا عضوخشک ہو جائے، لیکن اگر وضو کے افعال پے در پے انجام پانے کے باوجودہوا گرم ہونے یابدن کی گرمی وغیرہ کی وجہ سے وضو کی رطوبت خشک ہو جائے تو وضو صحیح ہے ۔

نوٹ:یہ ضروری نہیں ہے کہ سر کا مسح سر کی کھال پر ہوبلکہ سر کے اگلے حصہ کے بالوں پر بھی صحیح ہے ، لیکن اگر سر کے دوسرے حصوں کے بال اگلے حصہ پر جمع ہوئے ہوں تو پہلے انھیں ہٹانا چاہیئے اوراگر سر کے اگلے حصہ کے بال اس قدر لمبے ہوں کہ کنگھی کرنے سے چہرے پر آئیں تو اس صورت میں بالوں کی جڑ پر مسح کرنا چاہیئے یا مانگ نکال کر کھال پر مسح کرنا چاہیئے ۔

مبطلات وضو

جو چیزیں وضو کو باطل کرتی ہیں انھیں "مبطلات" کہتے ہیں اور وہ آٹھ ہیں:

۱ ۔پیشاب

۲۔پاخانہ

۳۔ریاح(یہ اس صورت میں ہے کہ جب ہوا پاخانہ کے مقام سے خارج ہو یا بیماری اور آپریشن کی وجہ سے، مخرج دوسری جگہ ہو گیا ہو)

٤۔بیہوشی

٥۔ مستی

٦۔ وہ نیند، جس میں آنکھیں نہ دیکھ سکیں اور کان نہ سن سکیں، اس بنا پر اگر آنکھیں نہ دیکھیں لیکن کان سنیںتو وضو باطل نہیںہوتا ہے۔

۷۔دیوانگی

۸۔جنابت اور وہ اسباب جن کے لئے غسل کیا جاتا ہے نیز استحاضہ جسے عورتیںبعض اوقات دیکھتی ہیں، وضو کو باطل کرتا ہے ۔

تیمم

اگرانسان وقت کی تنگی، بیماری یا پانی نہ ہونے یا اسی طرح کی کسی اورچیز کی وجہ سے نمازاور اس کے مانند دوسرے اعمال کے لئے وضو یا غسل نہ کرسکے تو اسے تیمم کرنا چاہئے۔

تیمم کا طریقہ

تیمم میں چار چیزیں واجب ہیں :

۱۔نیت

۲۔دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو مٹی یا اس چیز پر مارنا جس پر تیمم کرنا صحیح ہے۔

۳۔دونوں ہاتھونکی ہتھیلیونکو سر کے بال اگنے کی جگہ سے بھوئوں اور ناک کے اوپرپوری پیشانی پر پھیرنا ۔بہتر ہے کہ ہاتھوں کو بھوئوں پر بھی پھیرا جائے ۔

٤۔بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو دائیں ہاتھ کی پوری پشت پراور اس کے بعددائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کی پوری پشت پر کھینچنا ۔

وضو کے بدلے کئے جانے والے تیمم میں اتنی ہی مقدارکافی ہے لیکن اگر تیمم غسل کے بدلے ہو، توایک بار پھرہاتھوں کو زمین پر مار کر صرف ہاتھوں کی پشت پر مسح کرے ۔

تیمم کے احکام

۱۔اگر مٹی نہ ملے تو ریت پر، اوراگر ریت نہ ملے تو ڈھیلے پر، اوراگر وہ بھی نہ ملے تو پتھر پر تیمم کرنا چاہئے اور جب ان میں سے کوئی بھی چیز نہ ملے تو کہیں پر جمع ہوئی گردوغبار پر تیمم کرنا چاہئے۔

۲۔چونے اور دوسری معدنی چیزوں پر تیمم کرنا صحیح ہے۔

۳۔اگر پانی کو مہنگا بیچا جارہا ہو، لیکن انسان اسے خرید سکتا ہو تو تیمم نہیں کرسکتا ہے بلکہ اسے پانی خرید کر وضواور غسل کرنا چاہئے۔

۱۔یعنی پانی انسان کا اپنا ہونا چاہئے یا اس کا مالک اس سے وضو کرنے پر راضی ہو۔

نماز

خدائے متعال فرماتا ہے :

(ماسلککم فی سقر،قالوا لم نک من المصلّین)

(مدثر۲٤۳٤)

"جب اہل جہنم سے پوچھا جائے گا آخر تمھیں کس چیز نے جہنم میں پہنچادیا ہے ؟تو وہ کہیں گے ہم نماز گزار نہیں تھے ۔"

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"نماز دین کا ستون ہے ،اگر بارگاہ الٰہی میں یہ قبول ہو جائے گی تودوسری عبادتیں بھی قبول ہوں گی اوراگر یہ قبول نہ ہوئی ،تودوسری عبادتیں بھی قبول نہیں ہوں گی"

جس طرح ایک انسان ،دن رات میں پانچ بارایک نہر میں نہائے تواس کے بدن میں کسی قسم کا میل کچیل باقی نہیں رہے گا ،اسی طرح پانچ وقت کی نمازیں بھی انسان کوگناہوں سے پاک کرتی ہیں ،جاننا چاہئے کہ جو نماز پڑھتا ہے لیکن اسے اہمیت نہیں دیتا،وہ اس شخص کے مانندہے ،جو اصلاًنماز نہیں پڑھتا ہے ۔خدائے متعال قرآن مجید میں فرماتا ہے :

(فویل للمصلّین،الّذین ھم عن صلاتھم ساھون)(ماعون ٥٤)

"توتباہی ہے ان نمازیوں کے لئے جواپنی نمازوں سے غافل رہتے ہیں۔"

ایک دن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں داخل ہوئے ،اور دیکھاکہ ایک شخص نمازپڑھ رہا ہے ، لیکن رکوع وسجود کو مکمل طورپر بجا نہیں لارہا ہے،آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"یہ شخص جس طرح نماز پڑھ رہا ہے اگر اسی حالت میں اس دنیا سے گزر گیاتو مسلمان کی حیثیت سے دنیاسے نہیں گیا ہے ۔"

اس بناپرنماز کو خضوع وخشوع کی حالت میں پڑھنا چاہئے اور نمازپڑھتے وقت اس بات کا خیال رکھے کہ کس ذات سے محو گفتگوہے اور رکوع وسجود اور دوسرے تمام اعمال کو صحیح طورپر انجام دے تاکہ نماز کے عالی نتائج سے بہرہ مند ہوجائے۔ خدائے متعال قرآن مجید میں نماز کے بارے میں فرماتاہے:

(انَّ الصَّلٰوۃ تنھیٰ عن الفحشاء و المنکر) ...)(عنکبوت٤٥)

"...نمازہر برائی اوربدکاری سے روکتی ہے..."

یقینا ایسا ہی ہے، کیونکہ نماز کے آداب اس طرح ہیں کہ اگر نماز گزاران کا لحاظ رکھے تو کبھی برائی کے پیچھے نہیں جائے گا۔ مثلا آداب نماز میں سے ایک یہ ہے کہ نماز گزار کی جگہ اور لباس غصبی نہ ہوں، اگر اس کے لباس میں حتی ایک دھاگا بھی غصبی ہو تو اس

کی نماز صحیح نہیں ہے۔ تو جو نماز گزار اس حد تک حرام سے پرہیز کرنے پر مجبور ہے تو ممکن نہیں ہے کہ وہ حرام مال کو استعمال کرے یا کسی کا حق ضائع کرے!

نیز نماز اس صورت میں قبول ہوتی ہے کہ انسان، حرص، حسد اور دوسری بری صفتوں سے دور رہے اور مسلّم ہے کہ تمام برائیوں کا سرچشمہ یہی بری اور ناشائستہ صفتیں ہیں اور نمازی جب اپنے آپ کو ان صفتوں سے دور رکھے گا، تو وہ یقینا تمام برائیوں سے دور رہے گا۔

اگر بعض لوگ نماز پڑھنے کے باوجود ناپسند کاموں کے مرتکب ہوتے ہیں، تو اس کا سبب یہ ہے کہ وہ نماز کے ضروری احکام کے مطابق عمل نہیں کرتے اور نتیجہ میں ان کی نماز قبول نہیں ہوتی ہے اور وہ اس کے عالی نتائج سے محروم رہتے ہیں۔

دین اسلام کے شارع مقدس نے نماز کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ، ہر حال میں حتی جان کنی کی حالت میں بھی انسان پر نماز کو واجب قرار دیا ہے، اگر وہ نماز کو زبان پر جاری نہیں کرسکتا ہے تو دل پر جاری کرنا چاہئے اور اگر جنگ، دشمن کے خوف یا اضطرار اور مجبوری کی وجہ سے قبلہ کی طرف رخ کرکے نماز نہ پڑھ سکے تو اس کے لئے قبلہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنا واجب نہیں ہے اور جس طرف بھی ممکن ہو نماز پڑھے۔

واجب نمازیں

واجب نمازیں چھ ہیں:

۱۔ پنجگانہ نمازیں [1]

۲۔ نماز آیات

۳۔ نماز میت

٤۔ واجب طواف کی نماز

٥۔ ماں باپ کی قضا نمازیں جو بڑے بیٹے پرو اجب ہوتی ہیں۔

٦۔ وہ نمازیں جو اجارہ، نذر، قسم اور عہد کی وجہ سے واجب ہوتی ہیں۔

مقدمات نماز

نماز بجالانے، یعنی پروردگار عالم کی خدمت میں حاضر ہونے اور ذات مقدس الٰہی کی اظہار بندگی اور پرستش، کے لئے کچھ مقدمات ضروری ہیں۔ جب تک یہ مقدمات فراہم نہ ہو جائیں نماز صحیح نہیں ہے اور یہ مقدمات حسب ذیل ہیں:

۱۔ طہارت

۲۔ وقت

۳۔ لباس

٤۔ مکان

٥۔ قبلہ

ان مقدمات کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ طہارت

نمازی کو نماز کی حالت میں با طہارت ہونا چاہیئے، اپنے فریضہ کے مطابق نماز کو با وضو یا غسل یا تیمم کے ذریعہ بجالائے اور اس کا بدن اور لباس نجاست سے آلودہ نہ ہوں۔

۲۔ وقت

نماز ظہر و عصر میں سے ہر ایک کا ایک مخصوص وقت اور مشترک وقت ہے، نماز ظہر کا مخصوص وقت اول ظہر[2] سے نماز ظہر پڑھنے کا وقت گزرنے تک ہے۔ اگر کوئی شخص اس وقت میں سہواً بھی نماز عصر پڑھے، تو اس کی نماز باطل ہے۔

نماز عصر کا مخصوص وقت، اس وقت ہوتا ہے جب مغرب سے پہلے صرف نماز عصر پڑھنے کے برابر وقت بچا ہو۔ اگر کسی نے اس وقت تک ظہر کی نماز نہ پڑھی ہو تو اس کی نماز ظہر قضا ہو جائے گی۔ اسی طرح نماز ظہر کے مخصوص وقت اور نماز عصر کے مخصوص وقت کے درمیان کا وقت نماز ظہر و عصر کا مشترک وقت ہے۔ اگر کوئی شخص غلطی سے اس وقت کے اندر نماز عصر کو نماز ظہر سے پہلے پڑھے تو اس کی نماز صحیح ہے اور اسے ظہر کی نماز اس کے بعد پڑھنی چاہیئے۔

نماز مغرب کا مخصوص وقت[3] اول مغرب سے تین رکعت نماز پڑھنے کے وقت کے برابر ہے۔ نماز عشا کا مخصوص وقت وہ وقت ہے جب نصف شب[4] سے پہلے نماز عشا پڑھنے کے برابر وقت بچا ہو۔ اگر کسی نے اس وقت تک نماز مغرب نہیں پڑھی ہے تو اسے پہلے نماز عشا پڑھنی چاہیئے پھر اس کے بعد نماز مغرب پڑھے۔

نماز مغرب کے مخصوص وقت اور نماز عشاء کے مخصوص وقت کے درمیان نماز مغرب و عشا کا مشترک وقت ہے۔ اگر کوئی شخص اس وقت میں غلطی سے نماز مغرب سے پہلے نماز عشا کو پڑھے تو اس کی نماز صحیح ہے اور اسے نماز مغرب کو اس کے بعد بجالانا چاہیئے۔

نماز صبح کا وقت اول فجر[5]صادق سے سورج نکلنے تک ہے۔

۳۔ لباس

نمازی کے لباس میں چند چیزیں شرط ہیں:

۱۔ لباس مباح ہو، یعنی نمازی کا اپنا لباس ہو یا اگر اپنا لباس نہ ہو تو اس لباس کا مالک اس میں نماز پڑھنے پر راضی ہو۔

۲۔ لباس نجس نہ ہو۔ ۳۔ مردار کی کھال کا نہ ہو، خواہ حلال گوشت حیوان کی کھال ہو یا حرام گوشت کی۔

٤۔ حرام گوشت حیوان کے اون یا بالوں کا نہ ہو۔ لیکن سمور کے کھال سے بنے ہوئے لباس میں نماز پڑھ سکتے ہیں۔

٥۔ اگر نمازی مرد ہے تو ریشمی اور زرباف لباس نہیں ہونا چاہیئے اور خود کو بھی سونے سے زینت نہ کرے۔ نماز کے علاوہ بھی مردوں کے لئے ریشمی لباس پہننا اور سونے سے زینت کرنا حرام ہے۔

٤۔ مکان

نمازی کے مکان۔ یعنی وہ جگہ جہاں پر وہ نماز پڑھتا ہے۔ کے کچھ شرائط ہیں:

۱۔ مباح ہو۔

۲۔ ساکن ہو۔ اگر ایک ایسی جگہ جو متحرک ہو، جیسے گاڑی میں اور متحرک کشتی میں نماز پڑھنے پر مجبور ہو تو کوئی حرج نہیں ہے، البتہ گاڑی وغیرہ قبلہ کے مخالف سمت میں چل رہی ہوں تو نمازی کو قبلہ کی طرف گھومنا چاہیئے۔

۳۔ اگر مکان نجس ہو تو اس قدر تر نہ ہو کہ اس کی رطوبت نمازی کے بدن یا لباس تک پہنچ جائے۔ لیکن پیشانی رکھنے کی جگہ اگر نجس ہو تو خشک ہونے کی صورت میں بھی نماز باطل ہے۔

٤۔ پیشانی رکھنے کی جگہ گھٹنوں کی جگہ سے ، ملی ہوئی چار انگلیوں سے زیادہ پست یا بلند نہیں ہونی چاہیئے۔

٥۔ قبلہ

خانہ کعبہ ،جو مکہ مکرمہ میں ہے، قبلہ ہے اور اسی کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنی چاہیئے۔ البتہ جو لوگ دور ہیں وہ اگر اس طرح کھڑے ہو جائیں یا بیٹھ جائیں کہ کہا جائے کہ قبلہ کی طرف رخ کئے ہوئے ہیں ، تو کافی ہے، اسی طرح دوسری چیزیں جیسے حیوانات کا ذبح کرنا بھی قبلہ کی طرف رخ کرکے انجام دیا جانا چاہیئے۔

جو شخص بیٹھ کر بھی نماز نہ پڑھ سکتا ہو تو اسے دائیں پہلو پر ایسے لیٹ کر نماز پڑھنا چاہئے کہ اس کے بدن کا اگلا حصہ قبلہ کی طرف ہو، اور اگر ممکن نہ ہو تو بائیں پہلو پر اس طرح لیٹے کہ اس کے بدن کا اگلا حصہ قبلہ کی طرف ہو اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو اسے پشت پر اس طرح لیٹنا چاہئے کہ اس کے پاؤں کے تلوے قبلہ کی طرف ہوں۔ اگر انسان تحقیق کے بعد نہ سمجھ سکے کہ قبلہ کس طرف ہے تو اسے مسلمانوں کے محرابوں، قبروں یا دوسرے راستوں سے پیدا ہوئے گمان کے مطابق عمل کرنا چاہئے۔

واجبات نماز

واجبات نماز یعنی وہ چیزیں جو نماز میں واجب ہیں، گیارہ ہیں:

۱۔ نیت

۲۔ تکبیرۃ الاحرام

۳۔ قیام

٤۔ قرات

٥۔ رکوع

٦۔ سجود

۷۔ تشہد

۸۔ سلام

۹۔ ترتیب، یعنی نماز کے اجزاء کو معین شدہ دستور کے مطابق پڑھے، آگے پیچھے نہ کرے۔

۱۰۔ طمانیت، یعنی نماز کو وقار اور آرام سے پڑھے۔

۱۱۔ موالات: یعنی نماز کے اجزاء کو پے در پے بجالائے اور ان کے درمیان فاصلہ نہ ڈالے۔

مذکورہ گیارہ چیزوں میں سے پانچ چیزیں ارکان ہیں کہ اگر عمداً یا سہواً کم و زیاد ہو جائیں، تو نماز باطل ہے اور باقی چیزیں رکن نہیں ہیں، صرف اس صورت میں نماز باطل ہوگی کہ ان میں عمداً کمی وزیادتی کی جائے۔

ارکان نماز

ارکان نماز حسب ذیل ہیں:

۱۔ نیت

۲۔ تکبیرۃ الاحرام

۳۔ قیام ۔ تکبیرۃ الاحرام کے وقت پر قیام اور متصل بہ رکوع

٤۔ رکوع

٥۔ دو سجدے

۱۔نیت

"نیت" سے مراد یہ ہے کہ انسان نماز کو قصد قربت سے، یعنی خدائے متعال کے حکم کو بجا لانے کے لئے انجام دے ۔ضروری نہیں ہے کہ نیت کو دل سے گزارے یا مثلاً زبان سے کہے :

"میں چار رکعت نماز ظہر پڑھتا ہوں قربۃً الی اللہ"

۲۔تکبیرۃ الاحرام

اذان واقامت کہنے کے بعد، نیت کے ساتھ "اللہ اکبر" کہنے سے نماز شروع ہوتی ہے اور چونکہ اس تکبیر کے کہنے سے کچھ چیزیں جیسے کھانا، پینا ،ہنسنا اور قبلہ کی طرف پشت کرنا، حرام ہو جاتی ہیں، اس لئے اسے تکبیرۃ الاحرام کہتے ہیں۔اور مستحب ہے کہ تکبیرۃ الاحرام کہتے وقت ہاتھوں کو بلند کریں، اس عمل سے خدائے متعال کی بزرگی کو مدنظر رکھ کر غیر خدا کو حقیر سمجھ کر چھوڑ دیں ۔

۳۔قیام

تکبیرۃ الاحرام کہتے وقت میں قیام اور قیام متصل بہ رکوع ،رکن ہے ، لیکن حمد اور سورہ پڑھتے وقت قیام اور رکوع کے بعد والا قیام رکن نہیں ہے. اس بناء پر اگر کوئی شخص رکوع کو بھول جائے اور سجدے میں پہنچنے سے پہلے اسے یاد آجائے اسے کھڑا ہونے کے بعد رکوع میں جانا چاہئے ، لیکن اگر جھکے ہوئے رکوع کی حالت میں ہی سجدہ کی طرف پلٹے، تو چونکہ قیام متصل بہ رکوع انجام نہیں پایا ہے اس لئے اسکی نماز باطل ہے ۔

٤۔رکوع

نمازی کو قرائت کے بعد اس قدر جھکنا چاہئے کہ ہاتھ گھٹنوں تک پہنچ جائیں اور اس عمل کو رکوع کہتے ہیں ۔ رکوع میں ایک مرتبہ "سبحان ربّی العظیم و بحمدہ "یا تین مرتبہ" سبحان اللہ" کہنا چاہیئے ۔ رکوع کے بعد مکمل طور پر کھڑا ہونا چاہیئے اس کے بعد سجدے میں جانا چاہیئے ۔

۵۔ سجدہ

"سجدہ" یہ ہے کہ پیشانی ،دونوں ہتھیلیاں ،دونوں گھٹنے اور دونوں پائوں کے انگوٹھوں کے سرے کو زمین پر رکھے اور ایک مرتبہ" سبحان ربّی الاعلی و بحمدہ "یا" سبحان اللہ" تین مرتبہ پڑھے۔ اس کے بعد بیٹھے اور سجدہ میں جا کر مذکورہ ذکر پڑھے۔

جس چیز پر پیشانی رکھتا ہے وہ زمین یا زمین سے اگنے والی چیز ہونی چاہیئے، کھانے پینے، پوشاک اور معدنی چیزوں پر سجدہ جائز نہیں ہے ۔

تشہد و سلام

اگر نماز دو رکعتی ہے، تو دو سجدے بجالانے کے بعد کھڑا ہو جائے اور حمد و سورہ کے بعد قنوت[6] بجالائے پھر رکوع اور دو سجدوں کے بعد تشہد[7] پڑھے پھر سلام[8] پڑھ کر نماز تمام کرے۔

اگر نماز تین رکعتی ہو تو تشہد کے بعد اٹھے اور صرف ایک بار حمد یا تین مرتبہ سبحان اللہ و الحمد للہ و لا الہ الاّ اللہ و اللہ اکبر پڑھے، پھر رکوع، دو سجدے، تشہد اور سلام پڑھے۔

اور اگر نماز چار رکعتی ہے تو چوتھی رکعت کو تیسری رکعت کی طرح بجالا کر، تشہد کے بعد سلام پڑھے ۔

1۔ یومیہ نمازوں سے مراد: صبح کی دو رکعتیں، ظہر و عصر کی چار چار رکعتیں، مغرب کی تین رکعتیں اور عشا کی چار رکعتیں ہیں۔

2۔ اگر ایک لکڑی یا اس کے مانند کوئی چیز سیدھی زمین میں نصب کی جائے تو، سورج چڑھنے پر اس کا سایہ مغرب کی طرف پڑے گا جس قدر سورج اوپر چڑھے گا، یہ سایہ کم ہوتا جائے گا اور اول ظہر میں اس کی کمی آخری مرحلہ پر پہنچ جائے گی، جب ظہر کا وقت گزرے گا تو سایہ مشرق کی طرف پلٹ جاتا ہے اور سورج جس قدر مغرب کی طرف بڑھے گا سایہ زیادہ ہوتا جائے گا۔ اس بنا پر جب سایہ کم ہوتے ہوئے کمی کے آخری درجہ پر پہنچ جائے اور پھر سے بڑھنا شروع ہوجائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ظہر کا وقت ہے۔ لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ بعض شہروں جیسے مکہ مکرمہ میں ظہر کے وقت سایہ بالکل غائب ہوتا ہے، ایسے شہروں میں سایہ کے دوبارہ نمودار ہونے پر ظہر کا وقت ہوتا ہے۔

3۔ سورج ڈوبنے کے تقریباً پندرہ منٹ بعد مغرب ہوتی ہے۔ اس کی علامت یہ ہے کہ سورج ڈوبنے کے بعد مشرق کی طرف رونما ہونے والی سرخی غائب ہو جائے۔

4۔ نصف شب، شرعی ظہر کے بعد گیارہ گھنٹے اور پندرہ منٹ گزرنے کے بعد ہوتی ہے۔

5۔ فجر کی اذان کے قریب مشرق کی طرف ایک سفیدی اوپر کی طرف بڑھتی ہے اسے فجر اول یا فجر کاذب کہتے ہیں۔ جب یہ سفیدی پھیل جاتی ہے، تو فجر دوم یعنی فجر صادق ہے اور صبح کی اذان کا وقت ہے۔

6۔ حمد و سورہ کے بعد ہاتھوں کو اپنے چہرے کے روبرو بلند کر کے قنوت میں جو بھی ذکر چاہے کہے، مثلاً: "ربنا آتنا فی الدنیا حسنة و فی الاخرة حسنة و قنا عذاب النار"

7۔ تشہد سے مراد یہ ہے کہ ان جملات کو کہے: "اشهد ان لا اله الا الله و حده لا شریک له واشهد ان محمّد اً عبده و رسوله، اللهم صل علی محمّد وآل محمّد"

8۔ سلام کو اسطرح بجالائے: السلام علیک ایّها النّبی و رحمة الله و برکاته، السَّلام علیناو علی عباد الله الصّالحین، السلام علیکم و رحمة الله و برکاته.

نماز آیات

چارچیزوں کی وجہ سے نماز آیات واجب ہوتی ہے:

۱۔ سورج گہن

۲۔ چاند گہن۔ چاہے کچھ حصے کو گہن لگا ہو اور کوئی اس سے خوفزدہ بھی نہ ہو۔

۳۔ زلزلہ۔ اگرچہ کوئی نہ ڈرے۔

٤۔ بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک اور سیاہ و سرخ آندھی وغیرہ، اس صورت میں کہ اکثر لوگ ڈر جائیں۔

نماز آیات پڑھنے کا طریقہ

نماز آیات دو رکعت ہے اور ہر رکعت میں پانچ رکوع ہیں اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ انسان نیت کے بعد تکبیر کہے اور حمد اور ایک مکمل سورہ پڑھے پھر رکوع میں جائے، پھر رکوع سے کھڑا ہوجائے، اور دوبارہ حمد اور ایک سورہ پڑھے پھر رکوع بجالائے یہاں تک کہ پانچ مرتبہ رکوع بجالائے اور پانچویں رکوع سے اٹھنے کے بعد دو سجدے بجالائے پھر کھڑے ہو کر دوسری رکعت کو پہلی رکعت کے مانند بجالاکر تشہد اور سلام کے بعد نماز تمام کرے۔

نماز آیات کا دوسرا طریقہ:

انسان نیت اور تکبیر اور سورہ حمد پڑھنے کے بعد ایک سورہ کی آیات کو پانچ حصوں میں تقسیم کرکے اس کے ایک حصہ کو پڑھ کررکوع میں جائے، رکوع سے اٹھ کر سورہ حمد پڑھے بغیر سورہ کا دوسرا حصہ پڑھے اور پھر رکوع بجالائے اور اسی طرح پانچویں رکوع سے پہلے سورہ کو ختم کرکے پھر رکوع بجالائے اس کے بعد دو سجدے بجالائے پھر دوسری رکعت کو پہلی رکعت کے مانند بجالاکے نماز کو ختم کرے۔

مسافر کی نماز

مسافر کو چھ شرائط کے ساتھ چار رکعتی نماز کو دو رکعت پڑھنا چاہئے:

۱۔ اس کا سفر آٹھ فرسخ سے کم نہ ہو یا چار فرسخ جائے اور چار فرسخ واپس آئے۔

۲۔ ابتداء سے آٹھ فرسخ سفر کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔

۳۔ راستہ میں اپنے قصد کو نہ توڑے۔

٤۔ اس کا سفر گناہ کے لئے نہ ہو۔

٥۔ سفر اس کا پیشہ نہ ہو۔

پس اگر کسی کا پیشہ سفر ہو (جیسے ڈرائیور) تو اسے نماز پوری پڑھنی چاہئے مگر یہ کہ دس روز اپنے گھر میں رہے، تو اس صورت میں تین بار سفر کرنے پر نماز قصر پڑھے۔

٦۔ حد ترخص تک پہنچ جائے، یعنی اپنے وطن یا دس دن تک قیام کی جگہ سے اس قدر دور چلا جائے کہ شہر کی دیواروں کو نہ دیکھ سکے اور اس شہر کی اذان کو نہ سن سکے۔

نماز جماعت

مستحب ہے کہ مسلمان پنجگانہ نمازوں کو جماعت کی صورت میں پڑھے اور نماز جماعت کا ثواب فرادیٰ پڑھی جانے والی نماز کے کئی ہزار گنا ہے۔

نماز جماعت کی شرائط

۱۔ امام جماعت بالغ، مؤمن، عادل اور حلال زادہ ہونا چاہئے، نماز کو صحیح پڑھتا ہو اور اگر ماموم مرد ہے تو امام کو بھی مرد ہونا چاہئے۔

۲۔ امام اور ماموم کے درمیان پردہ یا کوئی اور چیز حائل نہ ہو جو امام کو دیکھنے میں رکاوٹ بنے، لیکن اگر ماموم عورت ہو تو اس صورت میں پردہ یا اس کے مانند کسی چیز کے ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۳۔ امام کی جگہ ماموم کی جگہ سے بلند نہ ہو، لیکن اگر بہت کم (چار انگلیوں کے برابر یا اس سے کم) بلند ہو تو کوہی حرج نہیں ہے۔

٤۔ ماموم کو امام سے تھوڑا پیچھے یا اس کے برابر ہونا چاہئے۔

نماز جماعت کے احکام

۱۔ ماموم حمد و سورہ کے علاوہ ساری چیزیں خود پڑھے، لیکن اگر اس کی پہلی یا دوسری رکعت ہو اور امام کی تیسری یا چوتھی رکعت ہو تو اسے حمد و سورہ کو بھی پڑھنا چاہیئے اور اگر سورہ پڑھنے کی وجہ سے امام کے ساتھ رکوع میں نہ پہنچ سکے تو صرف حمد پڑھ کر خود کو رکوع میں امام کے ساتھ پہنچادے اور اگر نہ پہنچ سکا تو نماز کو فرادی کی نیت سے پڑھے۔

۲۔ ماموم کو رکوع، سجود اور نماز کے دوسرے افعال امام کے ساتھ یا اس سے تھوڑا بعد انجام دینا چاہیئے، لیکن تکبیرۃ الاحرام کو قطعاً امام کے بعد کہے۔

۳۔ اگر امام رکوع میں ہو اور اس کی اقتدا ء کرے اور رکوع میں پہنچ جائے، تو اس کی نماز صحیح ہے اور ایک رکعت حساب ہوگی۔

روزہ

دین مقدس اسلام کے فروع دین میں سے ایک "روزہ" ہے۔ ہر مکلف پر واجب ہے کہ وہ رمضان المبارک میں روزہ رکھے ۔یعنی پروردگار عالم کے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے صبح کی اذان سے مغرب تک ،روزہ کو باطل کرنے والی چیزوں (مفطرات روزہ) سے پرہیز کرے۔

روزہ کو باطل کرنے والی چیزیں

چند چیزیں روزہ کو باطل کرتی ہیں ،وہ حسب ذیل ہیں :

۱۔کھانا اورپینا، اگرچہ اس چیز کا کھانا اورپینا معمول نہ ہو، جیسے مٹی اور درخت رس۔

۲۔خدا، رسول خدا ﷺ اورآپ ﷺ کے جانشینوں (ائمہ ھدی) کی طرف جھوٹ کی نسبت دینا۔

۳۔غلیظ غبار کو حلق تک پہنچانا ۔

٤۔پورے سر کوپانی میں ڈبودینا ۔

٥۔قے کرنا اگر عمداً ہو۔

دوسرے مفطرات روزہ کے بارے میں مراجع کی توضیح المسائل کی طرف رجوع کیا جائے۔

اسلام میں جہاد

جہاد کے کلی مسائل

ہر مخلوق کا اپنی ذات کادفاع کرنا اوراسی طرح اپنے منافع کادفاع کرنا ایک عام قانون ہے جوعالم خلقت میں بلا چون وچرا ثابت ہے۔

انسان بھی اپنی حیثیت سے اپنی ہستی اور منافع کادفاع کرتا ہے اوردوسروں کے مانند دفاع کی توانائیوں سے مسلح ہے تاکہ اپنے دشمن سے مقابلہ کر سکے ۔انسان اپنی خداداد جبلّت اور فطرت سے قائل ہے کہ اسے اپنادفاع کرناچاہئے اوراپنے اس دشمن

کونابود کردینا چاہے جو کسی بھی وسیلہ سے اس کو نابود کرنے سے باز نہیں آرہا ہے۔اسی طرح اگر کوئی شخص اس کے حیاتی منافع پر قبضہ کرنا چاہے تو اسے دفاع کی غرض سے اٹھنا چاہیئے اور ہر ممکن طریقے سے اس کو روکنا چاہیئے ۔

یہ فطری موضوع جوایک انسان کی فطرت میں ثابت اورپائدار ہے ،اسی طرح انسانی معاشروں میں بھی ثابت و مستحکم ہے۔یعنی جودشمن معاشرے کے افرادیامعاشرے کی آزادی کے لئے خطرہ ہو،وہ اس معاشرے کی نظرمیں سزائے موت کا مستحق ہے اور جب سے انسان اور انسانی معاشرے ہیں یہ فکران میں ثابت اوربرقرار ہے کہ ہرفرداورمعاشرہ اپنے جانی دشمن کے بارے میں ہر قسم کا فیصلہ کرسکتا ہے اورردعمل دکھا سکتا ہے ۔

اسلام بھی ۔جوایک اجتماعی دین ہے اور توحید کی بنیادپر استوار ہے ۔حق اور عدالت کے سامنے تسلیم نہ ہونے والوں کواپنا جانی دشمن جانتا ہے اورانھیں نظام بشریت میں مخل جان کران کے لئے کسی قسم کی قدر وقیمت اوراحترام کا قائل نہیں ہے اور چونکہ خود کو عالمی دین جانتا ہے اس لئے اپنے پیروئوں کے لئے کسی ملک اور سرحدوں کی محدودیت کا قائل نہیںہے اور جو بھی شرک کے عقیدہ میں بتلا ہو اور واضح منطق اور حکیمانہ پند و نصیحت کو قبول نہ کرتا ہو اور حق اوراحکام الٰہیٰ کے سامنے ہتھیار نہ ڈالتا ہو ،تو اسلام اس کے ساتھ جنگ کرتا ہے تاکہ وہ حق وعدالت کے سامنے ہتھیار ڈال دے ۔

مختصریہ کہ جہاد کے سلسلہ میں اسلام کے قوانین بھی یہی ہیں اور وہ مکمل طورپراس روش کے مطابق ہیں جوہرانسانی معاشرہ کی اپنی فطرت کے مطابق اپنے جانی دشمنوں کے بارے میں ہے ۔

اسلام ،بدخواہ دشمنوں کے پروپیگنڈوں کے باوجود،تلوار کا دین نہیں ہے،کیونکہ اسلام کی روش سلاطین کی روش نہیں ہے کہ جن کی دلیل و منطق صرف تلواراورسیاسی حربے ہوتے ہیں ، بلکہ اسلام ایک ایسا دین ہے،جس کابانی خدائے متعال ہے ،جواپنے آسمانی کلام میں لوگوں کے ساتھ منطق وعقل کی بنیادپر بات کرتا ہے اوراپنی مخلوقات کو اس دین کی طرف دعوت دیتا ہے جوان کی فطرت کے مطابق ہے۔

جس دین کی عمومی تحت، سلام ہواور اس کا عمومی پروگرام قرآن مجید کے نص کے مطابق"والصلح خیر"[1]ہو،وہ ہرگزتلوارکا دین نہیں ہوسکتا۔

پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں ،جب اسلام کی نورانیت نے تمام حجازکو منور کررکھا تھا اور مسلمان اہم جنگوں اورسخت مقابلوں میں بتلاتھے ، تو اس وقت قتل ہونے والے مسلمانوں کی تعداددوسوسے زیادہ نہ تھی اور قتل ہونے والے کفارکی تعداد ایک ہزارتک نہیں پہنچی تھی ۔کتنی بے انصافی ہے کہ ایسے دین کوتلوارکادین کہا جائے ۔

اسلام میں جنگ کے مواقع

اسلام ،جن کے ساتھ جنگ کرتا ہے ،وہ حسب ذیل چند گروہ ہیں :

١ـ مشرکین :

مشرکین یعنی وہ لوگ جو توحید، نبوت اور معاد کے قائل نہیں ہیں ـ ان کو پہلے اسلام لانے کی دعوت دیتا ہے تاکہ کسی قسم کا شک و شبہ اور بہانہ باقی نہ رہے،دین کے حقائق کو ان کیلئے واضح کرکے تشریح کرتا ہے ،پس اگرانہوں نے قبول کیا تودوسرے مسلمانوں کے بھائی اور نفع ونقصان میں برابر ہونگے ،اور اگر قبول نہ کیا اور حق و حقیقت کے واضح ہونے کے باوجود تسلیم نہ ہوئے تو اسلام ان کے مقابلہ میں اپنا دینی فریضہ "جہاد" کو انجام دیتا ہے ـ

٢ـ اہل کتاب:

اہل کتاب"یہود، عیسائی اور مجوسی ہیں"اسلام ان کو صاحب دین اور صاحب کتاب آسمانی جانتا ہےـ یہ لوگ توحید، نبوت مطلقہ اورمعاد کے قائل ہیں ان لوگوں کے ساتھ بھی مشرکین جیسا سلوک کرنا چاہیئے ، لیکن چونکہ اصل توحید پر عقیدہ رکھتے ہیں ، لہذاجزیہ ادا کرکے اسلام کی پناہ میں آسکتے ہیں ،یعنی اسلام کی سرپرستی کو قبول کریں اوراپنی آزادی کی حفاظت کریں اوراپنے دینی احکام پر عمل کریں ـتو دوسرے مسلمانوں کی طرح ان کی جان ،مال اورعزت محترم ہوگی اور اسکے عوض میں اسلامی معاشرہ کوکچھ مال ادا کریں گے ، لیکن ان کو اسلام کے خلاف پروپیگنڈے،دین کے دشمنوں کی مدد اوردوسرے ایسے کام انجام نہیں دینا چاہیئے جو مسلمانوں کے نقصان میں ہو ـ

٣ـ بغاوت اورفساد برپا کرنے والے :

بغاوت اور فساد برپا کرنے والے یعنی وہ مسلمان جواسلام و مسلمین کے خلاف مسلحانہ بغاوت کرکے خونریزی کریں ، اسلامی معاشرہ ان کے ساتھ جنگ کرتا ہے تاکہ وہ ہتھیارڈال کرفساد اوربغاوت سے ہاتھ کھینچ لیں ـ

٤ـ دین کے دشمن:

دین کے دشمن جودین کی بنیاد کو ویران کرنے یا حکومت اسلامی کو نابودکرنے کے لئے حملہ کریں ،تو تمام مسلمانوں پر واجب ہے کہ دفاع کریں اوران کے ساتھ کافرحربی کا سلوک کریں ـ

اگراسلام اور مسلمین کی مصلحت کاتقاضاہو تواسلامی معاشرہ اسلام کے دشمنوں کے ساتھ وقتی طورپر جنگ بندی کا معاہدہ کرسکتا ہے، لیکن یہ حق نہیں ہے کہ ان کے ساتھ ایسا دوستانہ رابطہ برقرار کرے کہ ان کے گفتاروکردار مسلمانوں کے افکارواعمال پر منفی اثرڈال کرانھیں خراب کردیں۔

جہاد کے بارے میں اسلام کا عام طریقہ

اسلامی معاشرہ پر فرض ہے کہ اگر جہاد کے شرائط موجودہوں تو،اُن کفار سے راہ خدا میں جنگ کریں جن کی سرحدملی ہوئی ہے، اورہر مسلمان بالغ،عاقل، صحت منداورجس کے ہاتھ پائوں اورآنکھ صحیح و سالم نہ ہوں،پرجہادواجب کفائی ہے۔

اسلام کے لشکرپر فرض ہے کہ جب دشمن کے ساتھ مقابلہ پر آئے ،تودینی حقائق کو ان کے لئے اس طرح بیان اورواضح کرے کہ کوئی ابہام باقی نہ رہے اوران کو حق کی طرف دعوت دے اورصرف اس صورت میں جنگ کا اقدام کرے کہ حق کے واضح ہونے کے بعدبھی وہ دین کوقبول نہ کریں۔

اسلام کے سپاہی کودشمنوں پرپانی بندنہیں کرنا چاہیئے اوردشمن پر شب خون نہیں مارناچاہیئے دشمن کی عورتوں ،بچوں ،ناتواں بوڑھوں اوردفاع کی قدرت نہ رکھنے والوں کو قتل نہیں کرناچاہیئے ،دشمن کے برابریادوگنا ہونے کی صورت میں میدان جنگ سے فرارنہ کرے۔

اگرہم اسلام کے جنگی طریقہ کو ترقی یافتہ ملتوںکے جنگی طریقوںسے موازنہ کریں، جوہرخشک وترکوجلادیتے ہیں اورکسی کمزوراوربیچارہ کے حال پررحم نہیںکرتے،تو واضح ہوجائے گا کہ اسلام کس قدرانسانیت کے اصول کاپابند ہے۔

حکومت،قضاوت اورجہاد کیوں مردوں سے مخصوص ہے ؟

معاشرے کے حساس ترین اجتماعی امورکہ ،جن کی باگ ڈورصرف عقل واستدلال کے سپردکی جانی چاہیئے اوران میں جذبات واحساسات کی کسی صورت میں مداخلت نہیں ہونی چاہیئے ، وہ حکومت،قضاوت اورجنگ کے شعبے ہیں۔کیونکہ مملکت کے امورکو چلانے اور،معاشرے میں پیداہونے والی دشمنیوں کو حل کرنے میں ہزاروں ناقابل برداشت واقعات اورطرح طرح کی چہ می گوئیوں اورجان ، مال،عزت و ابروکی دھمکیوں جیسے گوناگوں مسائل سے دوچار ہوناپڑتا ہے کہ جس کو نہایت قوی اور مستقل مزاج افراد کے علاوہ کوئی طاقت برداشت نہیں کرسکتی کہ اوران تمام مسائل سے چشم پوشی کرکے صبر نہیں کیا جاسکتاہے،اورگوناگوںتلخ لفتوں کے درمیان اجتماعی عدالت کونافذنہیں کیا جاسکتا ہے ،جو اس عہدہ کاحامل ہو اسے دوست ودشمن ،بُرے اوربھلے،چاپلوس اوربدگوئی کرنے والے اورعالم وجاہل کوایک نظر سے دیکھناچاہیئے اوراپنے خواہشات نفسانی کے برعکس

حکومت کرنی چاہئے اور فیصلہ دینا چاہئے ۔بدیہی ہے کہ جس کے وجود میں جذبات کا غلبہ ہوتا ہے وہ اس کام کو انجام دینے کی توانائیاں نہیں رکھتا ہے ۔جب جذبات حکومت اور قضاوت سے عاجز ہوں گے تو جنگ کے شعبہ میں بدرجہ اولیٰ نامناسب ہوں گے کیونکہ دوسرے اجتماعی امور کے برعکس جنگ میں ہر خشک وتر کو جلا دیتے ہیں جنگی سپاہی اور دشمن کے شیر خوار بچے کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے۔ اسلام کا جنگی طریقہ عدالت کی بنیاد پر استوار ہے، البتہ اس قسم کی کا طریقہ جذبات کے غلبہ سے عمل میں نہیں لایا جاسکتا ہے، کیونکہ اگر جنگ کے وقت جذبات اور ہمدردی کی بناپر قطب موافق کی طرف مائل ہوا تو ضرورت سے زیادہ نرمی اختیار کرکے شکست کھائے گا اور اگر قطب مخالف کی طرف مائل ہوا، تو حد سے تجاوز کرکے، گنہگاراور بے گناہ کو یکسان سمجھ کر انسانی اصول و ضوابط کو پامال کرے گا۔

اس سلسلہ میں اسلام کے نظریہ کی حقانیت کی بہترین دلیل یہ ہے کہ مغربی ممالک نے مدتوں سے عورتوں کو معاشرے میں مردوں کے دوش بدوش قرار دیا ہے اور تعلیم و تربیت سے ان کی نشو نما کرتے ہیں او راب تک حکومت کے عہدوں ، عدلیہ کے عالی مقامات اور جنگی سرداروں کے عہدوں پر مردوں کے مقابلہ میں عورتوں نے کوئی قابل توجہ ترقی نہیں کی ہے۔ البتہ خانہ داری او ربچوں کی تربیت کے کاموں میں ، کہ جن کا سرچشمہ جذبات اور ہمدردی سے ہمیشہ پیش قدم رہی ہیں۔

امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام نے ایک مختصر جملہ میں معاشرے میں عورت کی حیثیت و منزلت کویوں بیان فرمایا ہے:

"فانّ المرۃ ریحانۃ و لیست بقہرمانۃ"[2]

"بیشک عورت ایک خوشبودار پھول ہے نہ سورما"

اور یہ ایک بہترین جملہ ہے جو اسلامی معاشرے میں عورت کی اجتماعی منزلت کی نشاندہی کرتاہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ عورتوں کے بارے میں نصیحت فرماتے تھے،یہاں تک کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں جو آخری کلمہ فرمایا اور اس کے بعد آپ ﷺ خاموش ہوگئے وہ یہ تھا:

"اللہ اللہ فی النسائ"[3]

امربالمعروف اور نہی عن المنکر اور مختلف قسم کی سزائیں

اسلام کی حیات و بقا سے مربوط ضرورتوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے قوانین کی مخالفتوں کو روکا جائے۔ اس ضرورت کو دور کرنے کے لئے دو امور سے استفادہ کیا گیا ہے:

۱۔ سزا کے لئے قوانین کا وضع کرنا،جن کو اسلامی حکومت کے ذریعہ نافذ ہونا چاہئے اور اس طرح شرعی احکام کی مخالفت کو روکا جاسکتا ہے۔

۲۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر، اسلام نے اپنے تمام پیروؤں پر واجب کیا ہے کہ جب دیکھیں کہ کسی قانون پر عمل نہیں ہورہا ہے، تو وہ آرام سے نہ بیٹھیں بلکہ خلاف ورزی کرنے والے کو اطاعت پر مجبور کریں اور اسے نافرمانی کرنے سے روکیں۔

مسلمانوں کے عام افراد، بادشاہ و رعایا، طاقتور و کمزور، مرد و عورت اور چھوٹے بڑے سب اس دینی فریضہ کو نافذ کرنے پر مامور ہیں اور خاص شرائط کے ساتھ اس کام (امر بالمعروف و نہی عن المنکر) کو انجام دینا چاہیئے۔ یہ اسلام کے شاہکاروں میں سے ایک شاہکار ہے کہ قانون کی خلاف ورزی کو روکنے کے لئے، دنیا کے مختلف کورٹ کچہری اور تھانوںسے بہتر اور قوی تر ہے۔

۱۔ نسائی ۱۲۷۔

2۔ وسائل الشیعہ، ج ١٤، ص ۱۲۰، باب ۸۷۔

3۔ بحار الانوار، ج ۳۲، ص ۵۳۰۔

اسلام میں فیصلہ

مسائل عدلیہ کے کلیات

شرعی طور پر جو صفتیں قاضی میں ہونی چاہئیں ، حسب ذیل ہیں:

۱۔ بالغ

۲۔ عاقل

۳۔ اسلام

٤۔ عدالت، یعنی گناہان کبیرہ کو انجام نہ دے اور گناہان صغیرہ پر اصرار نہ کرے۔

٥۔ حلال زادہ

٦۔ علم، یعنی عدلیہ سے مربوط قوانین کو اپنے اجتہاد سے جانتا ہو، اگر دوسرے کے فتوی کے مطابق سنائے تو کافی نہیں ہے۔

۷۔ یادداشت۔ یعنی بھولنے والا فیصلہ نہیں دے سکتا ہے۔

۸۔ بینائی۔ اکثر فقہا کی نظر میں نابینا جج نہیں بن سکتا ہے۔

اگر قاضی میں مذکورہ صفات میں سے کوئی ایک صفت نہیں پائی جاتی ہو تو وہ خود بخود فیصلہ دینے کے منصب سے عزل ہوجاتا ہے۔

قاضی (جج) کے فرائض

اسلام کی مقدس شریعت میں، جو فیصلہ دینے کے منصب پر فائز ہو، اس کے لئے مندرجہ ذیل فرائض کا انجام دینا ضروری ہے:

۱۔ لوگوں کے ایک دوسرے کے خلاف دعووں کے بارے میں فقہ کی کتابوں میں موجود قوانین کے مطابق فیصلہ دینا۔

۲۔ یتیموں اور دیوانوں کی سرپرستی کرنا، اگر ان کے باپ یا دادا نے ان کے لئے کوئی سرپرست معین نہ کیا ہو۔

۳۔ عمومی اوقاف اور مجہول المالک اموال کی حفاظت کرنا۔

٤۔ احمقوں کے مال کی دیکھ بھال کرنا۔

٥۔ دیوانہ پن اور مفلس ہونے کا حکم جاری کرنا اور حکم جاری کرنے کے بعد مفلس کے مال کی حفاظت کرنا۔

٦۔ خیانت کرنے کی صورت میں وصی کو بدل دینا۔

۷۔ وصی کے ساتھ ایک امین کو بھی رکھنا، جب وصی اکیلے ہی ذمہ داری کو نبھا نہ سکے۔

۸۔ اگر کوئی اپنا قرض ادا نہ کرسکے تو اسے مہلت دینا۔

۹۔ ممکن ہونے کے باوجود واجب نفقہ دینے سے اجتناب کرنے والوں پر ذمہ داری عائد کرنا۔

۱۰۔ اس کے حوالہ کئے گئے اسناد اور امانتوں کا تحفظ کرنا۔

۱۱۔ شرعی حدود جاری کرنا۔

۱۲۔ شرعاً معین شدہ افراد کو جیل بھیجنے کا حکم جاری کرنا۔

فیصلہ کرنے کی اہمیت

اسلام میں "قاضی" کے لئے معین کئے گئے فرائض کی تحقیقات سے فیصلہ کرنے کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اسی لئے قاضی اپنے فیصلہ میں جذبات سے کام نہیں لے سکتا ہے اور رشوت لینے کا، یہاں تک کہ بر حق افراد سے بھی، سخت منع کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ اسے ان افراد کے درمیان فرق نہیں کرنا چاہئے جو اس کے پاس رجوع کرتے ہیں۔

امیرالمؤمنین حضرت علی علیہ السلام "مالک اشتر" کے نام لکھے گئے ایک حکم نامہ میں فیصلہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

"لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لئے ایک ایسے شخص کا انتخاب کرنا جو دعویٰ دائر کرنے والوں کے رجوع کرنے سے تھک کر دل تنگ نہ ہو جائے اور کاموں کی رسیدگی میں مکمل طور پر صبرو تحمل کا مظاہرہ کرتا ہو اور امور کے بارے میں فیصلہ دینا اس کے لئے مشکل نہ ہو۔دعوی، کرنے والے اسے خوار اور حقیر نہ سمجھیں امور کے مشکلات کے بارے میں تحقیقات اور دقت کرے اور کسی کام کو سرسری طور پر انجام نہ دے، اگر کیس اس کے لئے واضح ہے تو لوگوں کی چاپلوسی، دھمکی اور طمع و لالچ دلانے کے اثر میں نہ آئے اور حکم الہیٰ کو کسی شک وشبہہ کے بغیر اظہار کرکے نافذ کرے اور لوگوں کے مال پر طمع کرنے سے پرہیز کرے ،چونکہ اس قسم کے لوگ کم پائے جاتے ہیں اسلئے ان کی اہم اور سنجیدہ ذمہ داری کے پیش نظر مناسب تنخواہ معین کرے تاکہ وہ اپنی آبرومندانہ زندگی میں دوسروں کے محتاج نہ رہیں اور رشوت لینے کے لئے کوئی بہانہ باقی نہ رہے اور انھیں فیصلہ سنانے کی آزادی دینا تاکہ دوسروں کی بدگوئی اور چالبازیوں سے محفوظ رہیں۔"

گواہی

مرداور عورت کی گواہی

جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا کہ استدلال کی قدرت مرد میں اور جذبات کی قدرت عورت میں زیادہ ہوتی ہے، اس لئے اسلام میں دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کی شہادت کے برابر ہے۔ خدائے متعال اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے :

(...واستشہدوا شہیدین من رجالکم فان لم یکونا رجلین فرجل ومراتان ممّن ترضون من الشُّہداء ان تضلّ احدٰہما فتذکر احدٰہما الاخری...) (بقرہ ۲۸۲)

"...اوراپنے مردوں میں سے دو گواہ بنائو اوردومرد نہ ہوں تو ایک مرد اوردو عورتیں تاکہ ایک بہکنے لگے تودوسری یاددلادے۔"

گواہی کے کلیات

تنہا وہ عام راستہ کہ جس کے ذریعہ تمام حالات میں حوادث پر قابو پایاجا سکتا ہے، گواہی کو برداشت کرنا اور اس کو انجام دینا ہے اور دوسرے وسائل جیسے "لکھنا" اور "فنی وسائل" جو حوادث کو ضبط کرنے اور شکل و اعتراف کو استحکام بخشنے کے لئے فراہم کئے گئے ہیں، عام نہیں ہیں اور انسان کے اختیار میں نہیں ہیں۔

اس لئے، اسلام نے اس بہت سادہ اور طبیعی وسیلہ کو اہمیت دی ہے اور حکم دیا ہے کہ لوگ اس راستہ سے حوادث پر قابو حاصل کریں اور ضرورت کے وقت گواہی دیں۔

گواہ کی شرائط

۱۔ بالغ ہو، اس بناپر نابالغ بچے کی گواہی قبول نہیں ہے، صرف جو بچہ دس سال کی عمر تک پہنچاہو، اگر اس نے گناہ نہ کیا ہو، تو وہ زخم لگانے کے بارے میں گواہی دے سکتا ہے۔

۲۔ دیوانہ او راحمق نہ ہو۔

۳۔ مسلمان ہو، لیکن اگر وصیت کرتے وقت مسلمان گواہ تک رسائی ممکن نہ ہو تو کافرذمی (اہل کتاب جو اسلام کی پناہ میں ہو) کی گواہی قابل قبول ہے۔

٤۔ عادل ہو، پس فاسق او رجھوٹی گواہی دینے والے کی گواہی قبول نہیںہے مگر یہ کہ وہ توبہ کرکے اس پر ثابت قدم رہے۔

۵۔ حلال زادہ ہو، اس لحاظ سے حرام زادہ کی گواہی قابل قبول نہیں ہے۔

٦۔ اس پر الزام نہ ہو، اس بناپر اس شخص کی گواہی پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا ہے جو دعوے کے موضوع میں غرضمند ہو۔

۷۔ یقین رکھتا ہو ، اس بناپر جو حدس ویقین حس کے طریقہ سے حاصل نہ ہوا ہو، اس پر گواہی نہیں دی جاسکتی ہے اور اگر جھوٹی گواہی کی وجہ سے کسی کے نقصان میں کوئی حکم جاری ہواہو، تو گواہ ضامن ہے اور اس کی تنبیہ کی جانی چاہئے اور اس کے جھوٹ کو بھی لوگوں میں اعلان کرنا چاہئے۔

اقرار

اقرار کی اہمیت

معاشرے میں پامال اور ضائع ہونے والے حقوق کو زندہ کرنے کے بارے میں "اقرار" کی اہمیت محتاج بیان نہیں ہے۔ کیونکہ عدلیہ جس کا کام انتہایی تلاش و کوشش، دلائل کو جمع کرنے کے لئے محنت و مشقت، قرائن، گواہونکی گواہی او رحدس واندازہ سے انجام دیتی ہے، اسے "اقرار" کے ذریعہ آسان ترین اور واضح ترین صورت میں دو جملوں میں انجام دیاجاتاہے۔

اسلام میں انفرادی نقطہ نظر سے بھی اقرار کی بہت اہمیت ہے، کیونکہ اقرار کا سرچشمہ وہ فطرت ہے کہ اسلام کی تمام سعی و کوشش اس کو زندہ کرنے اور اسے عملی جامہ پہنانے میں صرف ہوتی ہے او روہ ایک ایسے انسان کی حق پرستی کی فطرت ہے جس کے مقابلہ میں ہوا و ہوس پرستی قرار پائی ہے۔

خدائے متعال اپنے کلام پاک میں پیرواں اسلام سے مخاطب ہو کر فرماتاہے:

(یا ایّها الّذین آمنوا کونوا قوّامین بالقسط شهداء لله و لو علی انفسکم او الوالدین و الاقربین) (نسائ١٣٥)

"اے ایمان والو! عدل و انصاف کے ساتھ قیام کرو او راللہ کے لئے گواہ بنو چاہے اپنی ذات یا اپنے والدین او راقربا ہی کے خلاف کیوں نہ ہو..."

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"حق بات کہو اگرچہ اپنے نقصان میں ہو۔"[1]

اقرار کے معنی اور اس کی شرائط

"اقرار" شرع وشریعت میں ایک ایسا قول ہے کہ کہنے والا دوسرے کا حق اپنے اوپر ثابت کرتا ہے، جیسے کہتا ہے:"میں ایک ہزار روپئے کا فلاں شخص کا مقروض ہوں"۔

اقرار کرنے والے کے لئے بالغ، عاقل اور صاحب اختیار ہونا شرط ہے، اس بناء پر بچہ، دیوانہ، مست، بیہوش، سوئے ہوئے اور مجبور شخص کا اقرار صحیح نہیں ہے۔

شفعہ

اگر دو آدمی، دو گھر یا کسی اور ملکیت کے مشترک مالک ہوں اور ان میں سے ایک اپنے حصہ کو کسی تیسرے شخص کے ہاتھ بیچ دے، تو اس کا دوسرا شریک حق رکھتا ہے کہ اسی عقد اور اسی قیمت پر اس کے حصہ کو لے لے، اس حق کو "شفعہ" کہتے ہیں۔

واضح ہے کہ اسلام میں یہ حق کمپنیوں کے تسویہ اور شرکاء کے تصرفات کی وجہ سے رونما ہونے والے نقصانات اور خرابیوں کو دور کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ اکثر یہ اتفاق پیش آتا ہے کہ ملکیت میں تازہ شریک کے تسلط سے صاحب شفعہ کو نقصان پہنچتا ہے، یا سلیقوں میں اختلاف کی وجہ سے اختلافات اور کشیدگیوں کا ایک سلسلہ وجود میں آتا ہے، یا مالکیت میں آزادی (صاحب شفعہ) شریک کے لئے کوئی فائدہ رکھتی ہو بغیر اس کے کہ بیچنے والے شریک کے لئے کوئی نقصان ہو۔

شفعہ، زمین، گھر، باغ اور دیگر غیر منقولہ اموال کے لئے ثابت ہے اور منقولہ اموال میں شفعہ نہیںہے۔

مرد اور عورت کا طبقہ

خالق کائنات نے نوع بشر کو دوسرے جاندار مخلوقات کے مانند نر و مادہ میں تقسیم کیا ہے اور اس طرح اس نوع کی بقاء کا تنہا ضامن تناسل و توالد کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔

مرد اور عورت، اس کے باوجود کہ نسل پھیلانے کے لئے دو مختلف نظاموں سے مسلح ہیں، ان میں سے ہر ایک، ایک انسان کی مکمل فطری توانائیاں رکھتا ہے اور یہ انسان کی ذاتی خصوصیتوں میں بھی برابر ہیں۔ ان دونوں صنفونکی تنہا خصوصیت جو سماج میں جداگانہ امتیازات کا سرچشمہ ہو سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ:

مرد کی صنف میں غور و خوض کی خاصیت زیادہ قوی ہوتی ہے اور عورت کی صنف میں جذبات اور ہمدردیاں زیادہ ہوتی ہیں۔ اور انہی خصوصیات کی وجہ سے، معاشرے میں ان دونوں میں سے ہر ایک نے مخصوص فرائض کو اپنے ذمہ لیکر معاشرہ کو چلاتے ہیں۔ اگر یہ اپنی ذمہ داریوں سے ہاتھ کھینچ لیں تو معاشرہ ٹھپ ہو کر رہ جائے گا۔

اسلام نے جو احکام ان دو صنفوں کے لئے وضع کئے ہیں، ان میں کلی طور پر ہر ایک کی صفتوں اور خصوصیتوں کو مد نظر رکھا گیا ہے اور مشترک قوانین میں اسی نوعی اشتراک کو مدنظر رکھ کر ان دونوں صنفوں کو حتی الامکان نزدیک لایا گیا ہے۔

یہ جاننے کے لئے کہ اسلام نے اپنی حقیقت بینی کی بنا پر، ان دو صنفوں کے اختلافات کو دور کرنے کے لئے کیسے موثر قدم اٹھائے ہیں اور بالخصوص عورتوں کے حالات میں بہتری اور آسودگی لانے کے لئے کیسے قوانین بنائے ہیں، ہمیں اسلام سے قبل عورتوں کے عام حالات سے آگاہ ہونا چاہیئے اور اس سلسلہ میں ایک تحقیق کریں اور ماضی کے ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ معاشروں

میں جو برتائو عورتوں کے ساتھ ہوتا تھا اسے مدنظر رکھیں پھر عورتوں کے بارے میں اسلام کے وضع کیئے گئے قوانین کی تحقیق کریں ۔

اسلام سے پہلے معاشرے میں عورت

الف:قبائلی معاشرے میں عورت

قدیم ملتوں میں جب ان کا طرز زندگی قانونی یا دینی نہیں تھا اور صرف قومی آداب و رسوم کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے،تو عورت، انسان شمار نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کے ساتھ ایک پالتو جانور جیسا سلوک کیا جاتا تھا ۔

انسان جب آغاز سے پالتو جانوروں کو یکے بعد دیگرے اپنا اسیر بنا کر ان کی تعلیم و تربیت کرتا تھا ، ان کی حفاظت اور ان کی زندگی کے لئے بے پناہ محنت کرتا اور رنج و تکلیف اٹھاتا تھا،تو یہ سب اسلئے نہیں تھا کہ انھیں انسانیت کی حیثیت سے پہچانے یا انھیں اپنے معاشرے کا ایک عضو قرار دے اور ان کے لئے کچھ حقوق کا قائل ہو جائے ،بلکہ وہ ان کے گوشت ،کھال ، اون ،دودھ، سواری ، سامان ڈھونے اور دیگر فوائد سے بہرہ مند ہونے کے لئے تھا۔

اس لئے ان جانوروں کی بقاء اور زندگی کے لئے ، کچھ وسائل جیسے خوراک اور رہائش وغیرہ فراہم کرتا تھا ، لیکن یہ محنت و مشقّت ان کے ساتھ ہمدردی کی بنا پر نہیں ہوتی تھی بلکہ اپنے فائدے کے لئے ہوتی تھی۔

انسان ان جانوروں کا دفاع کرتا تھا اور اجازت نہیں دیتا تھا کہ کوئی انھیں مار ڈالے یا انھیں اذیت پہنچائے اور اگر کوئی ان پر تجاوز کرتا،تو وہ اس سے انتقام لیتا تھا ، لیکن یہ سب اس لئے تھا کہ خود کو ان کا مالک جانتا تھا اور اپنے حقوق کی حفاظت کرنا چاہتا تھا نہ یہ کہ ان حیوانات کے لئے کسی حق کا قائل تھا ۔ عورت کو بھی اسی طرح اپنے استفادہ کے لئے چاہتا تھا۔

عورت کی معاشرے میں رکھوالی کرتا تھا اور اس کا دفاع کرتا تھا ،جو اس پر تجاوز کرتا اسے سزا دی جاتی تھی ، لیکن نہ اس لئے کہ وہ انسان ہے یا معاشرے کا عضو شمار ہوتی ہے یا کسی حق و احترام کی حقدار ہے ،بلکہ اس لئے کہ زندہ رہے اور مرد کے جنسی خواہشات کا کھلونا بنی رہے اور اہل خانہ یعنی مردوں کے لئے کھانا پکائے اور تیار کرے ، ساحل نشیں قوموں کے لئے مچھلی پکڑے.سامان ڈھوئے ،گھر کا کام کرے اور ضرورت کے وقت بالخصوص قحط سالی اور مہمان نوازی کے موقع پر اس کے گوشت سے غذا تیار کی جائے ۔

باپ کے گھر میں بھی عورت کی یہی حالت تھی یہاں تک کہ اسے شوہر کے حوالہ کیا جاتا تھا ، لیکن نہ اسکے اپنے اختیار و انتخاب سے،بلکہ ماں باپ کے حکم سے وہ بھی ایک قسم کا بیچنا تھا نہ کہ ازدواج عہد و پیمان۔

عورت، باپ کے گھر میں ، باپ کے ماتحت اور شوہر کے گھر میں ، شوہر کے ماتحت اور اس کی تابع ہوتی تھی اور ہر حالت میں صاحب خانہ کے زیر نظر اور اسکی مرضی کے مطابق زندگی گزارتی تھی ۔

صاحب خانہ اسے بیچ سکتا تھایا اسے کسی کو بخش سکتا تھا یا دوسرے مقاصد کے لئے جیسے عیاشی یا بچہ پید اکرنے یا خدمت کرنے کے لئے عاریت، قرض یا کرایہ پر دوسروں کو دے سکتا تھا اگر اس سے کبھی کوئی غلطی سرزد ہوتی تو اسے ہر طرح کی سزا دینے کا حق تھا، یہاں تک کہ قتل تک کر سکتا تھا، اور اس کے بارے میں کسی بھی قسم کی ذمہ داری کا احساس نہیں ہوتا تھا ۔

ب۔ عورت، ترقی یافتہ سلطنتی معاشرے میں

ترقی یافتہ سلطنتی معاشرہ، جیسے، ایران، مصر، ہندوستان اورچین کہ جو وقت کے بادشاہوں کی مرضی پر چلتا تھا اور اسی طرح متمدن معاشرہ جیسے کلدہ، روم اوریونان جہاں کے لوگ قانونی حکومت کی زندگی بسر کرتے تھے، اگر چہ عورت کی حالت دوسرے معاشروں سے بہتر تھی اور کلی طور پر مالکیت سے محروم قرار نہیں دی جاتی تھی ، لیکن پھر بھی مکمل آزادی نہیں رکھتی تھی جس گھر میں عورت زندگی گزارتی تھی اس کا سرپرست جیسے باپ ، بڑا بھائی یا شوہر اس پر مطلق حکومت کرتا تھا ۔یعنی اسے حق ہوتا تھا کہ جس کے ساتھ چاہے اس کا عقد کرے یا عاریت و کرایہ پر دیدے یا کسی کو بخش دے اور خاص کر (خطا سرزد ہونے پر) اسے قتل کرسکتا تھا یا گھر سے نکال سکتا تھا ۔

بعض ملکوں میں عورت فطری رشتہ داری سے محروم تھی اور مرد اپنی محرم عورتوں سے شادی کرسکتا تھا۔

بعض دوسرے ممالک میں ، عورت باضابطہ اورقانونی رشتہ دار شمار نہیں ہوتی تھی، اور میراث کی حقدار نہیںہوتی تھی ۔

بعض جگہوں پر کئی مرد ایک عورت سے شادی کرتے تھے اورزمانہ جاہلیت میں بعض عرب قومیں اپنی بیٹیونکوزندہ دفنا تے تھے ، عورت کو منحوس جانتے تھے ۔اگر اس پر کوئی زیادتی اور ظلم ہوتا تو اسے عدالت میں جاکر شکایت کرنے اور اپنادفاع کرنے کا حق نہیں تھا اوراسے گواہی دینے کا حق بھی نہیں تھا ۔

خلاصہ یہ کہ اس معاشرے میں عورت ایک کمزور عضو شمار ہوتی تھی جسے مرد کی سرپرستی میں زندگی بسر کرنا ہوتی تھی ۔اسے ہرگز اپنے ارادہ سے فیصلہ کرنے ،کام اورپیشہ کے انتخاب میں آزادی نہیں تھی ۔بلکہ ایک چھوٹے بچے کے مانند تھی جسے بالغ ہونے تک کسی کی سرپرستی میں زندگی بسر کرنا پڑتی ہے فرق صرف یہ تھا کہ یہ عورت کبھی بالغ نہیں ہوتی تھی !

عورت ایک جنگی اسیر کے مانند تھی کہ جب تک آزاد نہ ہوجائے دشمن کی غلامی میں رہتا ہے اور اس کے کام و کوشش سے استفادہ کیا جاتا ہے ،اس کے مکر وفریب سے ہوشیار رہتے ہیں ،فرق یہ تھا کہ عورت کو اس اسیری سے آزادہونے کی کبھی امید نہیں ہوتی تھی ۔

ج: عورت دینی معاشرہ میں

دینی معاشروں میں بھی عورت پر جو کچھ دوسرے معاشروں میں گزرتی تھی۔کوئی خاص فرق نہیں ہوتا تھا اوراس کے لئے کسی قسم کے حق کے قائل نہ تھے ۔

یہودیوں کی موجودہ توریت نے عورت کو موت سے زیادہ تلخ بتایاہے اور کمال سے مایوس شمار کیا ہے ۔

رسول گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے،فرانس میں عیسائی پادریوںکا ایک اجتماع منعقد ہوا،جس میں عیسائی پادریوںنے عورتوں کی حالت پر مفصل بحث و تحقیق کے بعد حکم صادر کیا کہ:

"عورت ایک انسان ہے لیکن مرد کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے ۔!"

ان تمام معاشروں میں، اولادباپ کی تابع ہوتی تھی نہ ماں کی اوران کے نسب کی بنیاد باپ سے تشکیل پاتی تھی نہ ماںسے ،صرف چین اورہندوستان کی چندجگہوں پر کئی شوہر کرنے کارواج تھا،بچے ماں کے تابع ہوتے تھے اوران کے نسب کی بنیاد مائیں تشکیل دیتی تھیں ۔

خلاصہ

اسلام سے پہلے،پوری دنیا میں تاریخ کے مختلف ادوار میں انسانی معاشروں میں، عورت کو معاشرے کاایک سرگرم عضوشمارنہیں کیا جاتا تھا اور وہ استقلال وآزادی کی مستحق نہیں تھی اور ہمیشہ ایک کمزوراور محکوم مخلوق شمار ہوتی تھی اور وہ خود بھی زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی انسانی خصلتوں کو کھو کرکے اپنے لئے کسی قسم کی اجتماعی شخصیت کو تصور نہیں کر سکتی تھی ۔

لفظ "عورت"ذلت، خواری ،پستی اور بیوقوفی کے معنی دیتا تھا ۔ہرزبان کے ادبیات کے نظم ونثرمیں عورت کے بارے میں بہت سی نا شایستہ باتیں اور خرافات پائے جاتے ہیں جو ماضی کے معاشروں میں عورت کے بارے میں روار کھے جانے والے نظریہ کی عکاسی کرتے ہیں ۔

۱۔ میزان الحکمۃ،ج ۲، ص ٤٦٨۔

عورت کے بارے میں اسلام کا نظریہ

جس دن اسلام کا سورج بشریت کے افق پر طلوع ہوا ، اس وقت عورت کی سماجی حالت وہی تھی جو خلاصہ کے طور پر بیان کی گئی ۔

اس زمانہ کی دنیا میں عورت کے بارے میں چند غلط اور خرافات پر مشتمل افکار اور ظالمانہ طرز عمل کے علاوہ کچھ نہیں تھا .لوگ (حتی خود عورت کا طبقہ)عورت کے لئے کسی مقام یا حق کے قائل نہیں تھے اور اسے ایک پست مخلوق سمجھتے تھے جو شریف انسان (مرد)کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے ۔

اسلام نے پوری طاقت کے ساتھ ان افکار کی مخالفت کی اور عورت کے لئے حسب ذیل حقوق مقرر فرمائے :

۱ ۔عورت ایک حقیقی انسان ہے اور انسان کے نرومادہ جوڑے سے پیدا کی گئی ہے اور انسان کی ذاتی خصوصیات کی حامل ہے اور انسانیت کے مفہوم میں مرد کو اس پر کوئی امتیاز حاصل نہیںہے ۔خدائے متعال اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے :

(یایّہا النّاس اِنّاخلقنکم من ذکرٍوانثی) ...)(حجرات ۱۳)

"انسانو!ہم نے تم کوایک مرداورایک عورت سے پیدا کیاہے ..."

کئی دوسری آیتوں میں فرماتا ہے :

(بعضکم من بعض) (آل عمران ۱۹۵)

"تم سب ہم جنس ہو"

۲ ۔عورت ،مرد کے مانند معاشرہ کا عضو ہے اور قانونی شخصیت کی مالک ہے ۔

۳۔عورت چونکہ فطری رشتہ دار ہے اسلئے سرکاری اور قانونی طور پر بھی رشتہ دار ہے ۔

٤۔بیٹی ، اولاد ہے جس طرح بیٹا اولاد ہے ،اسلئے بیٹیاں ،بیٹوںکی طرح اولادہیں ، اس لحاظ سے عورت بھی مرد کی طرح اپنے سببی اور نسبی رشتہ داروں جیسے باپ اورماں سے میراث پاتی ہے ۔

۵ ۔عورت فکری آزادی کی مالک ہے اوراپنی زندگی میں ہر قسم کا فیصلہ کر سکتی ہے اور شرعی حدود میں اپنی مرضی کے مطابق اپنے لئے شوہر منتخب کر سکتی ہے اور باپ یا شوہر کی ولایت اور سرپرستی میں رہے بغیر آزادی کے ساتھ زندگی گزار سکتی ہے اورہر جائز پیشہ کو منتخب کر سکتی ہے ۔

عورت عمل کے میدان میں مستقل ہے اوراس کا کام اورکوشش محترم ہے اور وہ مالک بن سکتی ہے اوراپنی دولت وثروت کو مرد کی سرپرستی اورمداخلت کے بغیر تصرف کر سکتی ہے اوراپنے انفرادی واجتماعی مال اورحقوق کادفاع کر سکتی ہے اوردوسروں

کے حق میں یاخلاف گواہی دے سکتی ہے ۔وہ جنسی آمیزش کے مسئلہ کے علاوہ (جس میں ازدواجی زندگی کے معاہدہ کے مطابق اپنے شوہر کی اطاعت کرنا ضروری ہے)اپنے شوہر کے لئے کوئی دوسرا کام انجام دے تو وہ قابل قدر ہے۔

٦۔مرد کو عورت پر حکم چلانے اور ظلم کرنے کا کوئی حق نہیںہے اور ہر ظلم جومردوں کے بارے میں مقدمہ چلا کرقابل سزا ہے وہ عورتوں کے بارے میں بھی مقدمہ چلانے اور سزا دینے کے قابل ہے۔

٧۔ عورت معنوی دینی شخصیت کی مالک ہے اوراخروی سعادت سے محروم نہیں ہے ،وہ ویسی نہیں ہے جیساکہ اکثرادیان اورمذاہب عورت کو ایک شیطان کے مانند، رحمت خداوندی سے مایوس تصور کرتے ہیں ۔

خدائے متعال اپنے پاک کلام میں فرماتا ہے :

(من عمل صٰلحاً من ذکر او انثی و هو مؤمن فلنحیینّه حیٰوة طیّبة ولنجزینّهم اجرهم بأَحسنِ ماکانوا یعملون) (نحل٩٧)

"جو شخص بھی نیک عمل کرے گاوہ مرد ہو یاعورت بشرطیکہ صاحب ایمان ہو ہم اسے پاکیزہ حیات عطاکریں گے اورانھیں ان اعمال سے بہترجزادیں گے جو وہ زندگی میں انجام دے رہے ہیں"

(...(انّی لااضیع عملَ عامل منکم من ذکر اوانثی) ...)

(آل عمران ١٩٥)

"میں تم میں سے کسی بھی عمل کرنے والے کے عمل کوضائع نہیں کروں گا چاہے وہ مرد ہو یاعورت..."

درج ذیل آیہ شریفہ کے مطابق ممکن ہے ایک عورت تقوی اوردین کی بدولت ہزاروں مردوں پرامتیاز اور فوقیت حاصل کرے :

(یایّها النّاس انّا خلقنٰکم من ذکر وانثی و جعلنٰکم شعوباً وقبائل لتعارفوا انَّ اکرمکم عند اللهٰ اتقکم ...) (حجرات ١٣)

"انسانو! ہم نے تم کو ایک مرداورایک عورت سے پیدا کیاہے اورپھر تم میں شاخیں اورقبیلے قرار دیئے ہیں تاکہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بیشک تم میں سے خدا کے نزدیک زیادہ محترم وہی ہے جوزیادہ پرہیز گار ہے..."

نکاح

(ازدواج)

نکاح کے مسائل اوراحکام

اسلامی تعلیمات میں نکاح اورازدواجی زندگی کے موضوع کو کافی اہمیت دی گئی ہے ۔اس کی اہمیت اس حدتک ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :

نکاح میری سنت ہے اورجو بھی میری سنت پر عمل نہ کرے ،اسے اپنے آپ کو مجھ سے نسبت نہیں دینی چاہیئے اوروہ اپنے آپ کو مسلمان شمارنہ کرے ۔[1]

نکاح کے احکام

دین اسلام میں نکاح کی دو قسمیں ہیں :

۱۔"دائمی نکاح":یہ وہ نکاح ہے کہ عقدجاری ہونے کے فوراًبعد میاں بیوی کارشتہ ہمیشہ کے لئے برقرار ہوجاتا ہے ۔یہ رشتہ صرف طلاق کے ذریعہ توڑاجاسکتا ہے ۔اس ازدواج میں مرد کو مہر کے علاوہ بیوی کی حیثیت کے مطابق اس کی زندگی کے اخراجات اداکرنے ہوتے ہیں اور کم از کم چار راتوں میں سے ایک رات کو اس کے ساتھ گذارے بیوی اس سلسلہ میں شوہر کے تقاضا کو مسترد نہیں کرسکتی ہے ۔

۲۔موقت نکاح جسے"متعہ"کہا جاتا ہے ۔یہ نکاح ،ایک محدود اورمعین مدت کے لئے میاں بیوی کے درمیاں رابطہ کو پیدا کرتاہے اورجوں ہی مدت ختم ہوئی یامردنے باقی مدت کو بخش دیا تو طلاق کے بغیر میاں بیوی کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے ۔

اس ازدواج میں نکاح دائم کے احکام میں سے کوئی حکم نہیں پایا جاتا ہے ،مگر یہ کہ عقد کے وقت شرط کی گئی ہو ۔

نوٹ

نکاح موقت"متعہ"اسلام میں جائزہے اورپیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں رائج تھا ،یہاں تک کہ دوسرے خلیفہ نے بعض وجوہات کی بناپر اس پرپابندی لگادی ،اس لئے اہل سنت اسے جائز نہیں جانتے ،لیکن شیعوں کے نزدیک جائز ہے

اور اسے اسلام کے شاہکاروں میں سے ایک جانتے ہیں، کیونکہ معاشرے کی ضرورتوں کے ایک اہم حصہ کو۔جس کو دوسرے راستہ سے روکنا ممکن نہیںہے دور کرتا ہے اور عمومی عفت کا بہترین حامی اور ضامن ہے۔

امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اگر موقت نکاح کو ممنوع نہ قرار دیا گیا ہوتا تو شقی اور بد بخت کے علاوہ کوئی زنا نہ کرتا"[2]

جن کے ساتھ نکاح کرنا حرام ہے

اسلام میں بعض عورتوں کے ساتھ رشتہ داری اور نسبی رشتہ کی وجہ سے نکاح کرنا حرام اور ممنوع ہے، اور وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ماں ،دادی،نانی اور جتنا سلسلہ اوپر چلا جائے۔

۲۔بیٹی،نواسی اور جتنا سلسلہ نیچے چلا جائے۔

۳۔پوتی اور جتنا سلسلہ نیچے چلا جائے۔

٤۔بہن، بھانجی اور جتنا سلسلہ نیچے چلا جائے۔

٥۔ بھتیجی، بھتیجی کی بیٹی اور جتنا سلسلہ نیچے چلا جائے۔

٦۔پھوپھی

۷۔خالہ

نوٹ

جو عورتیں نسبی رشتہ کی وجہ سے مرد پر حرام ہیں وہی عورتیں ایک شیر خوار بچہ کو دودھ پلانے سے حرام ہوجاتی ہیں۔

بعض عورتیں سببی رشتہ (دامادی) کی وجہ سے مرد پر حرام ہوجاتی ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔بیوی کی ماں اور اسکی دادی ونانی اور جتنا سلسلہ اوپر چلا جائے۔

۲۔بیوی کی بیٹیاں، اگر مرد نے اس بیوی سے ہمبستری کی ہو۔

۳۔باپ کی بیوی، اگرچہ باپ نے اس کے ساتھ ہمبستری بھی نہ کی ہو۔

٤۔بیٹے کی بیوی، اگرچہ بیٹے نے اس کے ساتھ ہمبستری بھی نہ کی ہو۔

٥۔بیوی کی بہن۔جب تک بیوی زندہ اور مرد کے عقد میں ہو۔

۶۔بیوی کی بھتیجی اور بھانجی، جبکہ بیوی سے اجازت نہ لی ہو، لیکن بیوی کی اجازت سے حرام نہیں ہیں ۔بعض عورتیں دوسرے وجوہات سے مرد پر حرام ہوجاتی ہیں:

۱۔شادی شدہ عورت۔

۲۔پانچویں عورت ،جس مرد کے چار دائمی عقد والی بیویاں ہوں ۔

۳۔کافر عورت، لیکن یہودی اور عیسائی کے مانند اہل کتاب ہو تو اس کے ساتھ موقت عقد کیا جا سکتا ہے ۔

عقد کا ولی

دین اسلام میں ، مرد اور عورت اگر بالغ ہوں تو اپنا شریک حیات انتخاب کرنے میں آزاد و مستقل ہیں ۔ لیکن نابالغ بیٹی اور بیٹے کے ولی ان کے باپ ہیں، اس معنی میں کہ باپ اپنی نابالغ بیٹی کا عقد کسی لڑکے سے کرسکتا ہے اور اپنے نابالغ بیٹے کا عقد کسی لڑکی سے کر سکتا ہے ۔

اولاد کے حقوق اور تبعیت

۱۔اگر شادی شدہ عورت، سے کوئی بچہ پیدا ہو تو یہ بچہ اس کے شوہر کا ہے،چنانچہ وہ بچہ دائمی بیوی ہو تو شوہر اپنا بچہ ہونے سے انکار نہیں کرسکتا ہے۔

۲۔اگر بچہ اپنی زندگی کا خرچ پورا نہ کرسکتا ہو ،تو اسکے ماں باپ کو اس کے اخراجات کو پورا کرنا چاہئے اور چنانچہ ماں باپ اپنے اخراجات پورے نہ کرسکتے ہوں تو ان کے اخراجات ان کے فرزند کے ذمہ ہیں ۔

اسلام میں متعدد بیویاں

شریعت اسلام کے مسلمات میں سے ہے کہ مرد ایک ساتھ چار بیویاں رکھ سکتا ہے۔ اس حکم کے فلسفہ کو سمجھنے کے لئے درج ذیل نکات پر توجہ کرنا ضروری ہے:

۱۔یہ حکم، اختیاری احکام میں سے ہے اور واجبی وحتمی حکم نہیں ہے، یعنی مسلمان مرد پر واجب نہیں ہے کہ چار بیویاں رکھے بلکہ ایک ہی وقت میں دو یا تین یا چار بیویاں رکھ سکتا ہے۔

اس کے علاوہ ،چونکہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے میں شرط یہ ہے کہ ان کے درمیان عدالت کی رعایت کرے اور یہ کام بہت مشکل ہے اورہرایک کے بس کی بات نہیںہے ۔ اس لئے اس کام کے لئے قدم اٹھانا اپنے لئے استثناء حالت پیدا کرنا ہے ۔

۲۔بشر کی ضرورتوں میں سے ایک تناسل وتوالداورآبادی بڑھاناہے ۔ خالق کائنات نے اسی غرض سے انسان کو مرداورعورت میں تقسیم کیا ہے .اسلام بھی چونکہ دین فطرت ہے اس لئے اس نے انسان کی ضرورتوں کو مدنظر رکھا ہے اسی لئے ازدواج کا حکم دیا ہے اورچونکہ مرداورعورت میں تناسل اور توالد صلاحیت کے لحاظ سے ، فرق ہے ،اس لئے متعدد شادیاں جائز کی ہیں ۔

اب ہم اختلاف کی علتیں بیان کرتے ہیں :

الف:کلی طورپر عورت نوسال کی عمرمیں ازدواج کی صلاحیت پیدا کرتی ہے جبکہ مرد کے لئے یہ استعداد پندرہ سال میں پیدا ہوتی ہے۔

نتیجہ کے طورپر اگرہم کسی معین سال کو مدنظر رکھ کر لڑکے اور لڑکیوں کی ولادت کو (اکثرلڑکیاں لڑکوں سے زیادہ ہوتی ہیں)درج کریں گے اور بعد والے سالوں کی ولادتوں کو اس پر اضافہ کریں گے توسولہویں سال ہر لڑکا جوازدواج کی شرعی صلاحیت پیدا کرے گا اس کے مقابلہ میں سات لڑکیاں ازدواج کی صلاحیت پیدا کرینگی ۔اگرلڑکوں کے ازدواج کی عمر جو معمولاً بیس سال سے اوپر ہے، کو مدنظر رکھیں ،تواکیسویں سال میں ہرایک لڑکے کے مقابلہ میں دولڑکیاں شادی کے لائق ہونگی اور پچیسویں سال میں کہ عام طورپر شادی اسی عمرمیں کردی جاتی ہے ۔ہردس لڑکوں کے مقابلہ میں سولہ لڑکیاں شادی کے لائق ہو جائیں گی ۔

ب۔عورت غالباً پچاس سال کی عمرمیں بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت کھودیتی ہے جبکہ مرداپنی طبیعی عمر کے آخری دنوں تک یہ صلاحیت رکھتا ہے ۔

ج۔اعدادوشمار کے مطابق نوزاد لڑکوں کی موتیں نوزادلڑکیوں سے زیادہ ہوتی ہیں اورعورتوں کی اوسط عمرمردوں کی نسبت زیادہ ہے کیونکہ گوناگوں عوامل کی وجہ سے عورتوں کی نسبت مردوں میں موتیں زیادہ ہوتی ہیں ۔اسی طرح (اعدادوشمار کے مطابق)مردکی عمرغالباً عورت کی عمرسے کم ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ معاشرہ میں ہمیشہ بیوہ عورتیں ،بیوی کے بغیرمردوں سے زیادہ ہوتی ہیں ۔

اس بات کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں متعدد شادیوں کی رسم صدیوں تک باقی تھی اور باوجود اس کے کہ بعض لاابالی اورفاقد عدالت مردوں نے بھی یہ کام انجام دیا ہے ، لیکن کبھی کوئی مشکل یا عورتوں کی کمی کا مسئلہ پیش نہیں آیا ہے ۔

کہتے ہیں:چونکہ متعدد شادیوں کامسئلہ عورت کی فطرت کے خلاف ہے،چوں کہ اس کے جذبات کو مجروح کرتا ہے یہاں تک کہ بعض اوقات اسے انتقام لینے پر مجبور کرتا ہے اورمردکی زندگی خطرہ میں پڑجاتی ہے ۔

ایسا سوچنے والوں نے اس حقیقت میں غفلت برتی ہے کیونکہ مذکورہ مخالفت عادت سے مربوط ہے نہ اسکی فطرت اور طبیعت سے،کیونکہ اگراس کی بنیاد فطرت پر ہوتی تومتعدد شادیوں کا کام عملاً کبھی واقع ہی نہ ہوتا ۔کیونکہ جوعورتیں کسی مردکی دوسری ،تیسری یا

چوتھی بیوی بنتی ہیں، وہ عورتوں کے اسی طبقہ سے تعلق رکھتی ہیں جوکہ اپنی مرضی اور رغبت سے شادی شدہ کسی مرد سے شادی کرنے پرآمادہ ہوتی ہیں۔ اگریہ کام انکی فطری اور طبیعی جذبات کے خلاف ہوتا،توہرگزایسی چیزکوقبول نہ کرتیں،چنانچہ اگرازدواج میں کسی عورت سے یہ شرط کی جائے کہ اسے تنہازندگی گزارناہوگی اورکسی سے بات نہیں کرے گی،توچونکہ یہ کام اسکی فطرت کے خلاف ہے،اس لئے ہرگز وہ اس شرط کوقبول نہیں کرے گی۔

اسکے علاوہ دین اسلام میں اس مشکل کوحل کرنے کے لئے ایک راستہ موجود ہے،وہ یہ کہ عورت ازدواج کے وقت،عقدلازم کے ضمن میں شرط رکھ سکتی ہے کہ اس کاشوہردوسری شادی نہ کرے اوراس طرح اس کا سدباب کر سکتی ہے۔

اولادکی میراث کا مسئلہ بھی دوسری صورت میں منظم کیاجاسکتا ہے،مثلاًحکومت کو مردکاوارث قراردیں اورمعاشرے کے فرزندوں اورنوزاد بچوں کی تربیت حکومت کے ذمہ چھوڑکر بچوں کو پرورش گاہ اورنرسریوں میں پالا جائے۔

اگرچہ یہ طریقہ انسانی معاشروں میں استثنائی طورپر انجام پاتا ہے، لیکن ایک ناقابل تغیرقانون کی حیثیت سے جاری رہنے کی ہرگز صلاحیت نہیں رکھتا،کیونکہ،یہ طرز عمل،مختصر زمانہ میں ،انسانی جذبات،غمخواری،مہرومحبت اورقوی خاندانی ہمدردی۔جونسل کی ایجاد کے لئے انسان کا اصلی محرک ہے کونابودکرکے رکھدیتاہے اورنتیجہ کے طورپرنسل بڑھانے کے موضوع کولوگوں میں خاص کرعورتوں میں کہ واقعاً ایام حمل کے دوران ناقابل برداشت تکلیفیںاٹھاتی ہیں ایک بیہودہ عمل دکھاتا ہے اورمہرومحبت والے خاندان کوایک تاریک زندان میں تبدیل کردیتا ہے۔

ایسے حالات کے رونماہونے کی وجہ سے تناسل وتوالدکاراستہ بالکل بندہوجاتا ہے اورخاندان جوحقیقت میں شہری معاشرہ کو تشکیل دیتاہے نابود ہوکررہ جاتاہے،اورخاندان کی تشکیل اورتناسل وتوالدفنی وسائل اورسیاسی فریب کاریوں کے ذریعہ انجام پاتے ہیں،جیسے بچہ پیداکرنے والوں کے لئے بڑے بڑے انعامات کااعلان کرنایاسخت قوانین نافذ کرناوغیرہ۔بدیہی ہے کہ اس قسم کی حالت،جوفطرت کے ساتھ سازگار نہیں ہوتی،پائدارنہیں ہے۔

اس کے علاوہ واضح ہے کہ اس صورت میں ،انسان کی زندگی ایک وحشتناک شکل میں تبدیل ہوکرخشک و بے لذت ہوگی اورحقیقت میں ،انسان کی زندگی کاماحول مویشیوں سے زیادہ پست اوردرندوں کے ماحول سے زیادہ خطرناک ہوگا۔

۱۔بحارالانوار،ج۱۰۳،ص۲۲۰ح۲۳۔

2۔وسائل الشیعہ،ج۱٤،ص٤۳٦،باب متعہ۔

طلاق

(میاں بیوی کی جدائی)

میاں بیوی کے شرعی رابطہ کے ختم ہونے کے بعد، ایک دوسرے سے جدا ہو کر ازدواجی حقوق کے قوانین کی پابندی سے آزاد ہونے کو "طلاق" کہتے ہیں ۔

طلاق کا قانون اسلام کا ایک ناقابل انکار امتیاز ہے جو وہ مسیحیت اور چند دیگر ادیان پر رکھتا ہے اور انسانی معاشرے کی ایک ضرورت کو پورا کرتا ہے، کیونکہ بے شمار ایسے مواقع پیش آتے ہیں کہ میاں اور بیوی کے اخلاق آپس میں سازگار نہیں ہوتے اور پیار و محبت کا ماحول ایک میدان جنگ میں تبدیل ہوجاتا ہے اور ان کے درمیان مصالحت ممکن نہیں ہوتی، اس صورت میں اگر میاں بیوی کا رشتہ توڑنے کے قابل نہ ہوتا تو میاں بیوی کو عمر بھر ایک بدبختانہ زندگی گزارنا پڑتی جو کہ در حقیقت ایک شعلہ ور جہنم ہے اور تلخی و محرومیت کے ساتھ نامناسب جسمانی اذیتیں برداشت کرنا پڑتیں اور اس مطلب کی بہترین مثال یہ ہے کہ عیسائی حکومتیں بھی عام ضرورتوں کے پیش نظر آخر کار "طلاق" کو قانونی حیثیت دینے پر مجبور ہوئیں ۔

اسلام میں طلاق کا اختیار مرد کو دیا گیا ہے، البتہ اس حکم میں مرد اور عورت کی فطری حالت کو مدنظر رکھا گیا ہے، کیونکہ اگر طلاق کا اختیار عورت کے ہاتھ میں ہوتا، چونکہ عورت مرد سے زیادہ جذبات کی اسیر ہوتی ہے، اسلئے میاں بیوی کا رابطہ ہمیشہ کمزور پڑتا اور تشکیل پایا ہوا خاندان متزلزل ہو کر آسانی کے ساتھ بکھر جاتا ۔ اسکے باوجود دین اسلام میں ایسی راہیں موجود ہیں کہ عورت بھی طلاق کے حق سے استفادہ کرسکتی ہے، اپنے شوہر سے معاشرت کے ضمن میں دور اندیشی کے پیش نظر عقد نکاح کے وقت شرط رکھے کہ اگر احتمالی مشکلات میں سے کوئی مشکل پیش آئے تو طلاق جاری کرنے کی وکالت کا حق ہوگا یا یہ شرط رکھے کہ اگر شوہر بلاوجہ اسے طلاق دے تو اس پر اس کے مشکلات کو حل کرنے کی ذمہ داری ہوگی ۔

اسلامی شریعت نے اگرچہ طلاق کو قانونی حیثیت دی ہے، لیکن اس کی غیر معمولی اور زبردست مذمت کی ہے اور بہت نصیحت کی ہے کہ اگر مسئلہ اضطرار کی حد تک نہ پہنچے تو مرد اپنی بیوی کو طلاق نہ دے اور ازدواجی رشتہ کو نہ توڑے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

"خدائے متعال کے نزدیک ناپسند و منفور ترین چیزوں میں سے ایک طلاق ہے"[1]

اسی لئے اسلام میں طلاق کے لئے چند مشکل قوانین وضع کئے گئے ہیں، جیسے طلاق دو عادل افراد کے سامنے انجام پانا چاہئے اور ان دنوں میں ہو کہ عورت اپنی عادت کے ایام میں نہ ہو اور مرد نے ان دنوں اس سے ہمبستری نہ کی ہو۔

اسی طرح مقرر ہوا ہے کہ اگر طرفین کے درمیان کوئی اختلاف یا نزاع پیدا ہوجائے تو دو افراد کو حُکم قرار دیں تاکہ میاں بیوی کے درمیان مصالحت کرائیں اور صرف اس صورت میں طلاق دی جائے کہ جب مصالحت کی تمام کوششیں ناکام ہوجائیں ۔

طلاق صحیح ہونے کی شرائط

اپنی بیوی کو طلاق دینے والے مرد میں درج ذیل شرائط ہونی چاہئیے :

۱ ۔ بالغ ہو ۔

۲ ۔ عاقل ہو ۔

۳ ۔ اپنی اختیار سے طلاق دے ۔

٤ ۔ طلاق دینے کا قصد رکھتا ہو ۔

اس بنا پر نابالغ، دیوانہ یا طلاق دینے پر مجبور شخص یا مذاق میں صیغۂ طلاق پڑھنے والے کا طلاق صحیح نہیں ہے ۔

٥ ۔ طلاق کے وقت، عورت خون حیض کو سے پاک ہونا چاہئے اور پاک ہونے کے بعد شوہر نے اس کے ساتھ ہم بستری نہ کی ہو ۔

٦ ۔ طلاق اپنے مخصوص صیغوں میں پڑھا جائے اور دو عادل کے سامنے انجام پائے ۔

طلاق کی قسمیں

طلاق کی دو قسمیں ہیں :

۱ ۔ طلاق رجعی : یہ وہ طلاق ہے کہ مرد اپنی اس بیوی کو طلاق دے کہ جس کے ساتھ ہم بستری کی ہو ۔ اس صورت میں مرد طلاق کا عدہ تمام ہونے سے پہلے رجوع کرکے نئے عقد کے بغیر ازدواجی رابطہ کو پھر سے برقرار کرسکتا ہے ۔

۲ ۔ طلاق بائن : یہ وہ طلاق ہے ، کہ جس میں طلاق جاری ہونے کے بعد مرد رجوع کرنے کا حق نہیں رکھتا ہے ۔ اس کی چند قسمیں ہیں :

الف : عورت کے ساتھ مرد کے ہمبستری ہونے سے پہلے دیا جانے والا طلاق ۔

ب : یائسہ عورت کی طلاق، یعنی وہ عورت جس میں بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت موجود نہ ہو ۔

ج : اس عورت کی طلاق جس کی عمر ابھی نو سال تمام نہ ہوئی ہو ۔

مذکورہ تین قسم کے طلاقوں میں عدہ نہیں ہے ۔

د:اس عورت کی طلاق جس کو تین مرتبہ طلاق دی گئی ہو۔اس طلاق میں اس کے علاوہ کہ مرد رجوع نہیں کرسکتا ہے، اسے پھر سے اپنے عقدمیں بھی نہیں لاسکتا ہے مگر یہ کہ یہ عورت کسی دوسرے مرد کے عقد دائمی میں آجائے اوراس سے ہم بستری کی جائے پھر وہ مرد اسے طلاق دیدے یامرجائے تواس صورت میں عدہ تمام ہونے کے بعدپہلا شوہر اس کے ساتھ پھر سے عقد کرسکتا ہے۔

ھ۔طلاق خلع:اس عورت کی طلاق جو اپنے شوہر کو پسند نہیں کرتی ہے اوراپنامہریا کوئی اورمال اسے بخش کر اس سے طلاق حاصل کرے، اس کو"خلع"کہتے ہیں۔اس طلاق میں جب تک بیوی اپنے شوہر کو بخش دئے گئے مال کامطالبہ نہ کرے، اس وقت تک مرد رجوع نہیں کرسکتا ہے۔

طلاق مبارات:یہ وہ طلاق ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کو نہ چاہتے ہوں اور بیوی مرد کو کچھ مال دے اوراس کے مقابلہ میں وہ اسے طلاق دے۔اس طلاق میں بھی جب تک بیوی اپنے ادا کئے ہوئے مال کا مطالبہ نہ کرے،مرد رجوع کرنے کا حق نہیں رکھتا ہے۔

ز۔نواں طلاق:ان شرائط کے ساتھ جو فقہ کی کتابوں میں تفصیل سے بیان ہوئے ہیں، اس طلاق کے بعدعورت مرد پر ہمیشہ کے لئے حرام ہوجاتی ہے اورکسی صورت میں اس کے ساتھ دوبارہ ازدواجی رشتہ برقرارنہیں کرسکتا ہے۔

عدت کے احکام اوراس کی قسمیں

جس عورت نے اپنے شوہر کے ساتھ ہم بستری کی ہو اورازدواج کے رشتہ کو مستحکم کیا ہو، اگر اس کاشوہراسے طلاق دیدے، تو اسے ایک معین مدت تک عدہ رکھناچاہئے،یعنی اس مدت میں ازدواج کرنے سے پرہیز کرے۔اس کام کے دواہم نتائج ہیں:

اول یہ کہ:نطفوں کے مخلوط ہونے سے بچایا جاسکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ: ممکن ہے اس مدت کے دوران میاں بیوی اپنی جدائی سے پشیمان ہوکر رجوع کریں۔

عدہ کی مدت کے دوران مرد کو بیوی کے اخراجات کو اداکرناچاہئے اوراسے اپنے گھر سے نہ نکالے۔اوراگریہ چوتھی بیوی تھی تو عدہ تمام ہونے تک دوسری عورت سے عقدنہ کرے۔اگرطلاق مرد کی مہلک بیماری کے دوران انجام پائے تو اس کے ایک سال کے اندرمرنے کی صورت میں بیوی اس کے ترکہ سے میراث لینے کی حقدار ہے۔

عدت کی قسمیں

عدہ کی تین قسمیں :

۱۔حاملہ عورت کا عدہ

۲۔غیر حاملہ عورت کا عدہ

۳۔عدہ وفات

ان کی تفصیل حسب ذیل ہے :

۱۔اگر حاملہ عورت کو طلاق دی جائے تو اس کا عدہ بچہ کی پیدائش یا اسکے ساقط ہونے تک ہے۔اس بنا پر اگر طلاق دینے کے ایک گھنٹہ بعد اسکا بچہ پیدا ہو جائے تو وہ دوسرا شوہر کر سکتی ہے۔

۲۔جو عورت حاملہ نہ ہو اور اس کی عمر پورے نوسال ہو یا یائسہ نہ ہو،جبکہ اس کے شوہر نے اس کے ساتھ ہم بستری کی ہو اور حیض کے علاوہ دنوں میں طلاق دی ہو تو اسے اتنا انتظار کرنا چاہئے کہ دوبار حیض دیکھے اور پاک ہوجائے اور جونہی تیسرے حیض کو دیکھے گی اس کا عدہ تمام ہو جائے گا۔

۳۔جس عورت کا شوہر مر جائے اور وہ حاملہ نہ ہو تو اسے چار مہینے دس دن عدہ رکھنا چاہئے۔اگر حاملہ ہو تو اسے بچے کی پیدائش تک عدہ رکھنا چاہئے لیکن اگر چار مہینے دس دن گزرنے سے پہلے، بچہ پیدا ہو جائے تو اسے اپنے شوہر کے مرنے کے دن سے چار مہینے دس دن تک انتظار کرنا چاہئے اور اسے "عدہ وفات" کہتے ہیں ۔

1۔وسائل الشیعہ ،ج ۱۵ ص ۲٦٦ باب ۔

اسلام میں غلامی

شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سے انسان پیدا ہوا ہے یہ فکر اس کے ہمراہ تھی کہ انسان کو بھی دوسری اشیاء کے مانند اپنی ملکیت قرار دے سکتا ہے ۔

قدیم مصر، ھندوستان ، ایران ، عربستان ، روم ،یونان ،یورپ اور امریکہ کے تمام ممالک میں غلام بنانے کا رواج تھا اور یہ رواج یہودیوں اور عیسائیوں میں بھی عام تھا اسلام نے بھی اس میں کچھ تبدیلیاں لاکر اسے جائز قرار دیا ہے ۔

برطانیہ کی حکومت، پہلی حکومت تھی جس نے غلامی کی روش کی مخالفت کی اور ۱۸۳۳ئ میں سرکاری طور پر غلامی کے طرز عمل کو منسوخ کیا ۔ اسکے بعد یکے بعد دیگرے دوسرے ممالک نے بھی اس روش کی پیروی کی ۔یہاں تک کہ سنہ ۱۸۹۰ء میں "بروکسل"میں منعقد ایک مٹینگ میں ایک عمومی قانون کی حیثیت سے غلامی ممنوع قرار دی گئی اور اس طرح دنیا سے غلام کی خریدو فروخت ختم ہوگئی ۔

غلام بنانے کے طریقے

ایسا لگتا ہے کہ یہ قدیم رسم انسان میں من مانی اور بے حساب رائج نہیں تھی کہ جو بھی چاہتا کسی دوسرے کو اپنی ملکیت میں لے لیتا ،بلکہ غلامی مندرجہ ذیل راہوں میں سے کسی ایک راہ سے انجام پاتی تھی:

۱ ۔جنگ و فتح:قدیم الایام سے اگردوجانی دشمنوںمیں سے ایک،دوسرے پر فتح پا کر بعض افراد کو اسیر بناتا تھا ،تو وہ ان جنگی اسیروں کے لئے کسی انسانی احترام کا قائل نہیںہوتا تھابلکہ اپنے لئے ان کے ساتھ ہر طرح کا برتائو کرنے کا حق سمجھتا تھا۔یعنی قتل کرڈالے یا بخش دے یا آزاد کرے یا غلاموں کی حیثیت سے اپنے پاس رکھے اور ان سے استفادہ کرے ۔

۲ ۔تولید وتربیت :خاندان کے باپ ،خاندان کے سرپرست ہوتے تھے اور اپنی اولاد کو اجتماعی شخصیت کے مالک نہیں جانتے تھے بلکہ انھیں خاندان کے تابع اور محض اپنی ملکیت سمجھتے تھے اور خود کو ان کے بارے میں ہر قسم کا فیصلہ کرنے کا مستحق سمجھتے تھے ۔اس لحاظ سے ضرورت کے وقت اپنی اولاد کو بیچ دیتے تھے اور اسی اصل کی بنیاد پر کبھی عورتوں کو بھی بیچ دیتے تھے ۔

۳۔طاقت ور لوگ جو اپنے آپ کو دوسروں سے بلند سمجھتے تھے: ایسے افراد اپنے حکم کو لوگوں کا نظم و نسق چلانے میں نافذ العمل جانتے ہوئے انھیں اپنا غلام شمار کرتے تھے۔یہاں تک کہ بہت سے قدرتمند بادشاہ اپنے کو خدائی کے قابل جان کر لوگوں کو اپنی پرستش کرنے پر مجبور کرتے تھے ،یہ افراد لوگوں کو اپنا غلام بنانے میں مطلق العنان تھے اور اپنے ماتحتوں میں سے جس کو بھی چاہتے، اسے اپنا غلام بناتے تھے۔

غلامی کے بارے میں اسلام کا نظریہ

اسلام نے اپنی اولاد اور عورتوں کو بیچنے کے ذریعہ اورزبردستی اور غنڈہ گردی کے ذریعہ غلام بنانے سے منع کیا ہے ۔اسلام کی نظر میں ہر انسان جو انسانیت کے راستہ پر گامزن ہے اور کم از کم انسانیت کے اصول کا دشمن نہ ہو، وہ آزاد ہے اور کوئی شخص اسے اپنا غلام نہیں بنا سکتا ۔

لیکن جو انسانیت کا جانی دشمن ہے اور جان بوجھ کر انسانیت کے اصول کے سامنے تسلیم نہیں ہوتا ہے اور اپنی پوری طاقت سے اسے نابود کرنے پر تلا ہوا ہے ،وہ ہرگز انسانی احترام کا مستحق نہیں ہے اور اسے اپنے ارادہ و عمل میں آزاد نہیں ہونا چاہئے اور غلامی اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ انسان کے عمل وارادہ کی آزادی اس سے سلب کی جائے اوردوسرے کا ارادہ اس پر حکومت کرے اسی عالمی اصول پر جو ہمیشہ دنیا والوں کی طرف سے موردتائید قرار پایا ہے کفار حربی سے لئے گئے جنگی اسیروں کو غلامی ،یعنی انھیں ارادہ و عمل کی آزادی سلب کرنے کی سزا دیتا ہے کیونکہ وہ انسانیت کے حقیقی دشمن ہیں۔

اسلام جو سلوک جنگی اسیروں کے ساتھ روا رکھتا تھا ، وہ وہی سلوک ہے جسے دوسرے بھی روا رکھتے ہیں ۔جب کوئی ملت جنگ کے بعد فاتح ملت کے سامنے کسی قید و شرط کے بغیر ہتھیار ڈالتی ہے ،تو جب تک ان کے درمیان باقاعدہ صلح بر قرار نہ ہو تب تک اسے ارادہ و عمل کی آزادی سے محروم کرنے کی سزادی جاتی ہے ۔

ان ملتوں کا اسلام کے ساتھ جو تنہا اختلاف ہے، وہ یہ ہے کہ اسلام اسے "غلامی" کے نام پر یاد کرتا ہے اور یہ قومیں اس لفظ کو استعمال کرنے سے پہلو تہی کرتی ہیں ۔البتہ جس روش کو وہ زندہ اور معاشرے کے لئے راہنما جانتے ہیں اپنی تعلیمات کی بنیاد کو نام گزاری کی بنیاد پر استوار نہیں کرنا چاہئے ۔

اسلام اور دوسرے نظریات کی تحقیق

گزشتہ بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ غلامی کو منسوخ کرنے والی عام قراردادنے بجائے اس کے کہ اسلام کے کام میں کوئی گرہ لگائے ، ایک گرہ کو کھول دیا ہے ۔ حقیقت میں یہ قرار داد دین اسلام کے قوانین کی ایک دفعہ کا نفاذ ہے کیونکہ اس طرح عورتوں اور بچوں کو بیچنے کا موضوع ختم ہوا ہے ، اور یہ وہی چیز ہے جسے چودہ سو سال پہلے اسلام نے منسوخ کیا تھا۔ اسلام نے جنگی اسیروں کی غلامی کا جو راستہ کھلا رکھا ہے ، وہ اس لئے ہے کہ انسان کو ہمیشہ اس حکم کی ضرورت ہے ، اور یہ کبھی ختم نہیں ہوگا .تنہا چیز جسے اسلام نے "غلامی"کا نام دیا ہے وہ یہی جنگی اسراء ہیں ۔ لیکن دوسرے لوگ "غلامی " کے نام کو زبان پر لائے بغیر عملاً"غلامی"کی رسم کو مستحکم کررہے ہیں ، اور جو استفادہ صدراسلام میں مسلمان (جنگی اسیروں)غلاموںسے کرتے تھے وہی استفادہ آج کی حکومتیں جنگی قیدیوں اور جنگ میں شکست کھائی ملتوں سے کرتے ہیں ۔

غلاموں کے ساتھ اسلام کا سلوک

اسلامی قوانین کے تحت، اسیر کئےگئےکفار حربی ، ممکن ہے مسلمانوں کے سرپرست اورحاکم کے حکم سے آزاد کئے جائیں یابطور غلام رکھے جائیں ۔

جنگ ہوازن میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کئی ہزار عورتوں اور بچوں کو ایک ساتھ آزاد کیا ۔جنگ بنی المصطلق میں مسلمانوں نے کئی ہزاراسیروں کو آزاد کیا ۔

اسلام میں ، غلام ،گھر کے اعضاء کے مانند ہیں ،گھر کے دوسرے اعضاء کے ساتھ جیسا سلوک کیا جاتا ہے ویساہی برتائو ان کے ساتھ بھی کیا جانا چاہیئے ۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غلاموں کے ساتھ بیٹھتے تھے اور ایک ساتھ کھانا کھاتے تھے ۔

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام دو کرُتے خریدتے تھے،ان میں سے بہتراپنے غلام کودیتے تھے اور معمولی کرُتے کو خودپہنتے تھے ۔

حضرت امام رضا علیہ السلام اپنے غلاموں اورکنیزوں کے ساتھ ایک دسترخوان پر کھانا کھاتے تھے ۔

اسلام حکم دیتا ہے کہ غلاموں کے ساتھ مہربانی سے پیش آئیں ، ان کے ساتھ سختی نہ کریں ، گالیاں نہ دیں اور جسمانی اذیتیں نہ پہنچائیں اورضرورت کے وقت ان کے ازدواج کے وسائل فراہم کریں یاخود ان کے ساتھ ازدواج کریں ۔خدائے متعال اس سلسلہ میں فرماتا ہے :

(...(بعضکم من بعض) ...)(نساء ۲۵)

"سب ایک پیکر کے اعضاء ہیں"

اسلام میں، غلام، اپنے مالک کی اجازت سے یادوسرے راستہ سے، مالک بن سکتے ہیں اور جس مال کے وہ مالک بن جائیں، آزادی کے بعدان کے لئے کسی قسم کا ننگ و عار نہیں ہے، جیسے کہ غلامی کے زمانہ میں بھی نہیں تھا. کیونکہ اسلام میں بزرگی اور فضیلت کا معیارصرف تقویٰ ہے لوگوں میں سب سے زیادہ پرہیزگار شخص کو سب سے بہتر جانتا ہے۔ اسلام کی نظرمیں ایک باتقوی غلام ہزار بے تقوی آزاد لوگوں سے بہتر ہے۔

اسلام کی بعض عظیم شخصیتیں جیسے سلمان فارسی اوربلال حبشی آزاد کئۓ گئے غلام تھے. اسلام نے غلام کو آزاد کرنے کے مسئلہ کو ہمیشہ مد نظر رکھاہے اور اس کام کے لئۓ مختلف راستے کھولے ہیں منجملہ جرمانہ اور بعض گناہوں کا کفارہ غلاموں کی آزادی کے لئۓ قراردیا ہے، اس کے علاوہ غلاموں کو آزاد کرنے کی بہت تاکید کی گئ ہے اور اسے اہم مستحبات میں قراردیا ہے تاکہ اس طرح ہرسال بہت سے غلام آزادہو کرآزاد معاشرے کے عضوبن سکیں۔

نتیجہ یہ تھاکہ اسلام حتی الامکان غیراسلامی معاشروں (کفار حربی) سے ایک گروہ کو جنگی اسیروں کی صورت میں پکڑتاتھا اور انھیں حق وعدالت کے معاشرے میں داخل کرتاتھا، ان کی تعلیم وتربیت کرتا تھا، پھر مختلف راستوں سے آزاد کرکے اسلامی معاشرے کا حصہ بناتا تھا۔

اس لحاظ سے جو شخص بھی جنگی اسیرہوتاتھا، آزاد ہونے تک غلام رہتا تھا۔ اگر وہ مسلمان ہونے کے فوراًبعدآزاد ہوتا، تواس صورت میں ممکن تھاہراسیر ہونے والاکافر، ظاہراً مسلمان ہوجاتا، اوراس طرح اپنے آپ کو نجات دلاتا اور تھوڑی ہی دیر کے بعدپھرسے اپنی سابقہ حالت کی طرف پلٹ جاتا۔

غصب

جو شخص کسی کے مال کو زبردستی اس سے چھین کر، مالکیت کے اسباب میں سے کسی سبب کے بغیر اسے اپنامال قرار دے یا کسی دوسرے کے مال پر زبردستی قبضہ کرکے استفادہ کرے ، اگرچہ اسے اپنا مال قرار نہ دے ، اس عمل کو شرعاً "غصب" کہتے ہیں ۔

لہذا، تسلط جمانے کے کسی جائز سبب جیسے : بیع ، اجارہ اور اجازت کے بغیر کسی دوسرے کے مال پر قبضہ جمانے کو غصب کہتے ہیں ۔یہاں پر معلوم ہوتا ہے کہ غصب، ایک نامناسب کام ہے جو مالکیت کی خصوصیت کی بنیاد کو پامال کرتا ہے۔جس قدر مالکیت کی خصوصیت کی بنیادمعاشرے کے زندہ اورپائیدار رہنے میں موثرہے اسی قدر غصب معاشرے کو برباد کرکے اس کی ترقی کو روکتا ہے ۔

اگریہ طے پاجائے کہ معاشرے کے اثرو رسوخ رکھنے والے افرادقانون کی اجازت کے بغیرکمزوروں اوراپنے ماتحتوں کی کمائی پر قبضہ جمائیں توخصوصیت اورمالکیت اپنے اعتبارکو کھودے گی۔ہرایک اپنے سے کمزورلوگوں کے خصوصی حقوق کے بارے میں اسی طرز فکرپر عمل کرے گااورماتحت اورکمزورلوگ بھی اپنی محنت و مشقت کی کمائی کی حفاظت کے لئے ہر ممکن اقدام کرکے عزت وشرافت فروشی پر مجبور ہوں گے۔اورنتیجہ میں انسانی معاشرہ غلاموں کے خرید و فروخت کے ایک بازار میں تبدیل ہو کر رہ جائے گا اورقوانین و ضوابط اپنے اعتبارسے گرجائیں گے اور ان کی جگہ پر ظلم و ستم جانشین ہوگا ۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے غاصب کے لئے سخت قوانین وضع کئے ہیں اورغصب کو گناہ کبیرہ شمار کیا ہے۔

قرآن وسنت کی نص کے مطابق، شرک کے علاوہ ہر قسم کے گناہ کو خدا کی طرف سے بخش دئے جانے کا احتمال ہے ۔اورہرگناہ حتی شرک بھی توبہ کے ذریعہ قابل عفو و بخشش ہے ۔لیکن جس کی زندگی کے ریکارڈمیں دوسروں کے حقوق کے بارے میں غصب اورظلم و ستم درج ہو،تواس کے لئے کسی بھی صورت میں حقدار سے بخشش حاصل کئے بغیر خدا کی پوچھ گچھ اورسزا سے بچنے کی اُمید نہیں ہے ۔

غصب کے بعض احکام

۱۔ غاصب پر واجب فوری ہے کہ غصب کیاگیا مال، مالک کو لوٹادے ، اوراگروہ زندہ نہ ہوتواسے اس کے وارثوں کے حوالہ کمردے ، اگرچہ اس مال کا واپس کرنا غاصب کے لئے کافی نقصان کاسبب بنے ۔مثال کے طورپر کسی کاپتھریا لوہے کا ایک ٹکڑاغصب کر کے اپنے مکان کی بناء میں نصب کرے جواس کے لاکھوں برابرقیمت پر تعمیرہوئی ہو ،تو مکان کوگراکر اس پتھر اورلوہے کے ٹکڑے کو نکال کراس کے مالک کو لوٹادے ،مگریہ کہ اس کا مالک اس کی قیمت حاصل کرنے پر راضی ہو جائے

۔یااس کے مانند کسی نے دس من گندم غصب کرکے دس خروار جو سے مخلوط کیا ہو ، اگر گندم کامالک اس کی قیمت لینے پرراضی نہ ہو جائے تو اسے عین گندم کو جو سے جدا کرکے مالک کو واپس کرنا چاہیئے ۔

۲۔ اگر غصب کئے گئے مال میں کوئی نقص پیدا ہوجائے ، توعین مال کو واپس کرنے کے علاوہ نقصان کی تلافی بھی کرنا چاہیئے ۔

۳۔ اگر غضب کیاگیا مال تلف ہو جائے تو اس کی قیمت اداکی جانی چاہیئے۔

٤۔ اگر غاصب ، غصب کئے گئے مال کے کسی حصہ کو ضائع کردے ، تو چاہے اس نے خوداس سے استفادہ نہ کیا ہو تو بھی وہ اس مال کے منافع کا ضامن ہے، جیسے، کسی نے کرایہ کی گاڑی کو غصب کرکے کئی دن تک اسے گیرج میں رکھا ہو ۔

اسی طرح اگرغاصب ، غصب کئے گئے مال میں اضافہ کردے، جیسے ایک بھیڑکو غصب کرنے کے بعداسے اچھی گھاس کھلا کرفربہ بنادے تواس اضافہ میں کوئی حق نہیں رکھتا ہے البتہ اگرمذکورہ اضافہ منفصل ہو،یعنی ایک زمین کو غصب کرکے اس میں کا شتکاری کرکے زراعت حاصل کرے توغصب کیاہوامال اجرت کے ساتھ مالک کولوٹادے اورزراعت غاصب کی ہوگی ۔

لُقطہ

جوبھی مال پایا جائے اوراسکا مالک معلوم نہ ہواسے "لُقطہ"کہتے ہیں :

۱۔جومال پایا جائے اوراس کا مالک معلوم نہ ہو، اگراس کی قیمت ایک مثقال[1]چاندی سے کم ہو،تواسے اٹھاکر خرچ کیا جاسکتا ہے اوراگراس کی قیمت ایک مثقال چاندی سے زیادہ ہو تواسے نہیں اٹھاناچاہیئے اوراٹھانے کی صورت میں عادی راہوں سے ایک سال تک اس کے مالک کو ڈھونڈنا چاہیئے اورمالک کوڈھونڈلینے کی صورت میں اس کے حوالہ کرنا چاہیئے اوراس کامالک نہ ملاتواس مال کواسکی طرف سے کسی فقیر کوصدقہ دینا چاہیئے ۔

۲۔اگرکسی مال کوایک ایسی ویران جگہ میں پایاجائے جس کے باشندے نابود ہوچکے ہوں یاغاراور اس بنجر زمین میں پایاجائے کہ جس کا کوئی مالک نہ ہو۔ توپایاگیا مال پانے والے کا ہے ، اوراگرمال ایسی زمین میں ملے جو کسی کی ملکیت ہوتو اس کے گزشتہ مالکوں سے دریافت کیا جانا چاہیئے ، اگرانہوں نے اس کو چھپایاہو توعلامت ونشانی بتانے کی صورت میں دیا جائے ورنہ یہ مال پانے والے کا ہے ۔

بنجر زمینوں کوآباد کرن

ایسی زمین کوآباد کرنا جس سے استفادہ نہیں ہوتا تھا (خواہ وہ زمین کبھی آباد نہیں تھی ، یا کبھی آباد تھی لیکن وہاں کے باشندوں کے معدوم ہونے کی وجہ سے غیرآباداور بے فائدہ رہی ہو یامرغ زاروں یانرسل زاروں کے مانند)۔بہر حال زمینوں کوآباد کرنا اسلام میں نیک کام شمارہوتا ہے اور مالکیت کاسبب بننے کے علاوہ اخروی ثواب بھی رکھتا ہے۔

پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ :

"جو کوئی شخص کسی بنجرزمین کوآباد کرے ، وہ زمین اس کی ہے۔" [2]

حضرت امام جعفرصادق علیہ السلام سے روایت نقل کی گئی ہے کہ:

"اگر کوئی گروہ کسی بنجر زمین کوآباد کرے ،تووہ اولویت کاحق رکھتا ہے اوروہ اس زمیں کا مالک ہے ۔" [3]

اسلام میں بنجرزمینوں کا مالک خدا،رسول خدا ﷺ اورامام ہے (اسلامی حکومت سے مربوط ہیں)اورانفال میں شمار ہوتی ہیں ۔بنجرزمینوں کو مندرجہ ذیل شرائط سے آبادکرکے ان کامالک بن سکتے ہیں ، اوراگرکئی افرادملکیت کاقصد کریں توجوپیش قدمی کرے گا وہ اولویت کاحق رکھتاہے:

١ ۔امام یاان کے نائب کی اجازت سے۔

٢۔کسی دوسرے شخص نے پہلے اس کی پتھروں سے نشاندہی یاحد بندی نہ کی ہو۔

٣۔دوسروں کی ملکیت کے حدود سے متصل نہ ہو، جیسے نہرکے اطراف کنویں کے پشتے میں اورکھیت کی سرحد سے ملی نہ ہو۔

٤۔خالی زمین ، جیسے خراب شدہ مسجدیا اوقاف ، عام مسلمانوں کی زمین جیسے کوچے اورسڑکیں نہ ہوں۔

نوٹ

تعمیر اور آباد کرنا ایک عرفی مفہوم ہے ،اس لئے جب عرف کہے:"ایک شخص نے فلاں زمین آباد کی ہے" مالکیت تحقق پاتی ہے ۔البتہ آباد کرنا بھی مختلف مقاصدکے پیش نظر مختلف ہے ۔چنانچہ کھیتی باڑی میں ہل چلانے سے آباد کرنا عمل میں آتا ہے اور عمارت بنانے میں دیوار بنانے سے ثابت ہوتا ہے ،یہاں تک کہ حاضرلوگوں میں سے ہرایک کھدائی اوراستخراج کے بغیراس سے استفادہ کرسکتا ہے،ہرایک کے لئے جائزہے کہ ضرورت کے مطابق اس سے استفادہ کرے اور اگران کااستفادہ کرنا کھدائی اوراستخراج اوردیگر فنی کاموں پر منحصرہو ، جیسے سونا اورتانباوغیرہ توجو محنت و مشقت سے کھدائی وغیرہ کرکے استخراج کرے وہی مالک ہوگا۔

بڑی نہریں مسلمانوں میں مشترک ہیں اسی طرح دریا اور برف وباران کا پانی جو پہاڑوں سے بہہ کر نیچے آتا ہے ،جو بھی ان کے نزدیک اور آگے ہو وہ دوسروں پر مقدم ہے ۔

تخصیص اور مالکیت کی اصل

یہی عقیدہ کہ انسان زمین کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے ، اسے اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ اس کے مظاہر سے آسانی کے ساتھ استفادہ کرے ۔ مثلاًاس کا زلال پانی پیئے ،میٹھے میوے اور حیوانوں کا گوشت کھائے ،پہاڑوں کے درّوں میں درختوں کے سائے میں آرام کرے ، یا صنعت ۔یعنی مادہ پر انجام دی سرگرمیوں کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال میں لائے ۔

البتہ اگر صرف چند افراد زمین پر ایسی زندگی گزارتے کہ آپس میں کوئی ٹکراو نہ ہوتا تو ہرگز کوئی مشکل پیش نہ آتی ، لیکن افراد کا جمع ہونا اور ان کا باہم زندگی گزارنا جو انسان کی اجتماعی شہری زندگی کی بنیاد ہے ،کہ ہر فرد زمین اور اس کے مظاہر کو اپنی ملکیت سمجھ لے تو،قدرتی طور پر لوگوں کے درمیان ٹکراؤ اور شدید تصادم کا سبب بن جائے گا ،جب ہر شخص اپنی ضرورت کو پورا کرنے کی تلاش وکوشش کرے گا،تو دوسرے اسے اپنی آزادی وآسائش میں مخل سمجھتے ہوئے اس کے لئے رکاوٹ ایجاد کریں گے،کیونکہ انسان اپنی زندگی کو ہر قیمت پر جاری رکھنے کے لئے مجبور ہے۔

اس لئے پہلے "اصل تخصیص" کے نام پر ایک اصل وقانون وضع کیا گیا،تاکہ اجتماعی ٹکراؤ اور تصادم کو روکا جائے ۔اس اصل کو قابل احترام سمجھا گیا ہے ۔اس اصل و قانون کے مطابق، انسان جس چیز کو اپنی سعی وکوشش سے حاصل کرے وہ اس کا مالک ہے اور دوسروں کو اس پر طمع ولالچ کر کے اس کے لئے رکاوٹ پیدا کرنے کا حق نہیں ہے۔ اس کے بعد "اصل مالکیت" کے نام پر ایک اور اصل وضع کر کے اسے قابل احترام سمجھا گیا ہے کہ اس کے مطابق انسان اپنی کوششوں سے حاصل کی گئی چیزوں پر اپنی مرضی سے تصرف کر سکتا ہے ۔

یہ اصل حقیقت میں "اصل تخصیص" کو مکمل کرنے والی ہے ۔کیونکہ "اصل تخصیص" دوسروں کی خلل اندازی کو روکتی ہے اور یہ اصل اس چیز کی مالکیت کے لئے ہر قسم کے تصرف کو جائز بنادیتی ہے ۔

اسلام نے مالکیت کی اصل کو محترم جانا ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی معروف حدیث (الناس مسلطون علی اموالهم)[4] میں مالک کے اپنے مال پر مکمل تسلط کی تائید فرمائی ہے ۔

اس قانون کے مطابق انسان جس طرح چاہے اپنے مال کو استعمال کر سکتا ہے ، اس کی حفاظت کر سکتا ہے ، کھا سکتا ہے ، پی سکتا ہے ، بخش سکتا ہے ، بیچ سکتا ہے اور اسی طرح دوسرے جائز تصرفات انجام دے سکتا ہے ، لیکن جو تصرفات ممنوع اور معاشرہ کی مصلحت کے خلاف ہیں مالک کو ان کا ہرگز اختیار نہیں ہے ۔

مالک اپنے مال پروہ تصرف نہیں کرسکتا ہے جو اسلام و مسلمین کے نقصان میں ہو یا اسراف اور فضول خرچی سے اپنے مال کونابود نہیں کرسکتا ہے، یا اپنے سونے اورچاندی کے سکّوں کوجاری نہ رکھ کر خزانہ کے طور پر جمع نہیں کرسکتا ہے ۔

اصل مالکیت ، اہم ترین اصل ہے جو انسان کو اپنی آرزو تک پہنچاتی ہے اور قوانین کی رعایت کے سایہ میں انفرادی آزادی کو امکان کی آخری حد تک فراہم کرتی ہے ۔

جتنا مال کی نسبت انسان کا تسلط یا اس کے کار و کوشش کے بارے میں اسکا اختیار کم ہوجائے گا اتنی اس کی آزادی سلب ہو جائے گی اور اس کا استقلال نابود ہوجائے گا اور اگر اصل تسلط بالکل نابود ہو جائے ،تو حقیقت میں ایک زندہ مخلوق سے اس کی اصل آزادی چھین لی جائے گی۔

اصل مالکیت کے دو تتمے

مالک کا اپنی ملکیت پر مکمل تسلط اور اس کے ہر جائز تصرف میں مطلوب آزادی ، ممکن ہے دو راستوں سے خطرہ میں پڑ جائے :

۱۔دوسروں کی طرف سے تجاوز کی وجہ سے، جیسے کوئی اس کی ملکیت پر قبضہ کرکے اس کے لئے استفادہ کے راستہ کو مسدود کر دے۔

۲۔اس راستہ سے کہ دوسرے ایسا کام انجام دیں جس سے مالک کو نقصان پہنچے۔

دین اسلام نے مذکورہ خطرات کو روکنے کے لئے دو مزید اصلوں کو وضع کیا ہے کہ اصل مالکیت خود بخود حاصل ہوتی ہے کہ حقیقت میں یہ دو اصلیں اسکے نفاذ اور حفاظت کی ضامن ہیں :

الف:اصل ضمان :اسلام اس اصل کے مطابق حکم دیتا ہے کہ جو بھی دوسرے کے مال کو پائے ،وہ اسکا ضامن ہے ،یعنی اس کو وہ مال مالک کو لوٹادینا چاہئے اور اگر ضائع ہوجائے تو اسکے مانند یا قیمت ادا کرے اس حکم کی دلیل ،پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث ہے:

"علی الید مااخذت حتی تؤد"

ب:قائدہ لاضرر: اس قائدہ کو حدیث نبوی (لاضرر ولاضرار فی الاسلام) سے استدلال کیا جاتا ہے۔اس قائدے کے مطابق اگر اسلام کا کوئی بھی حکم جاری کرنے میں کسی شخص کو بعض مواقع پر مالی یا جانی نقصان پہنچائے،تو وہ حکم اس مورد میں، جاری نہیں ہوگا۔

جن چیزونکو ملکیت بنایا جاسکتا ہے

دین مقدس اسلام میں ان چیزونکو ملکیت بنایا جاسکتیں ہے:

۱۔قابل توجہ فائدہ ہو،مثال کے طور پر حشرات قابل ملکیت نہیں ہیں۔

۲۔مذکورہ فائدہ حلال ہو،اس بناء پر جوئے کے وسائل،موسیقی کے آلات اوران کے مانند،جن کا حلال فائدہ نہیں ہے،کسی کی ملکیت نہیں ہوسکتے۔

۱۔احکام ضمان کے دو حکم:

الف:اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی ملکیت کو غصب کرے،یعنی مالک کی اجازت کے بغیر اسے اپنے قبضہ میں لے لے یا مالک کو اپنی ملکیت میں تصرف کرنے نہ دے، اسلام کے حکم کے مطابق فوراً اسے مالک کو واپس کرے اوراگر یہ ملکیت ضائع ہو جائے تو اسکے مانندیا اس کی قیمت اداکرے اور اگر غصب کرنے کی وجہ سے مال کے مالک کو کوئی نقصان پہنچے تو غاصب اس کا ذمہ دار ہے۔

ب:اگر کوئی شخص مالک کی اجازت کے بغیر اس کے مال میں تصرف کرے، لیکن مالک کو بھی تصرف کرنے میں رکاوٹ نہ ڈالے۔تو خود مال اگر تلف ہوجائے تو اس کے مانندیا قیمت مالک کودے، ضمان کے احکام ومسائل بہت زیادہ ہیں، تفصیلات جاننے کیلئے فقہی کتابونکی طرف رجوع کریں۔

۳۔مذکورہ حلال فائدہ کسی فردیاچندافراد کی تخصیص کے قابل ہو۔اس بناء پر مساجد،عام سڑکیں اور ان کے مانند چیزیں،جو معاشرے کے تمام لوگوں سے مربوط ہوتی ہیں، کسی خاص شخص کی ملکیت نہیں بن سکتی ہیں۔

جن چیزوں سے انسان مالک بن سکتا ہے

مالک بننے کے لئے، انسانی معاشرے میں بہت سے وسائل موجود ہیں، لیکن ان میں سے بعض جیسے جوا، شرط لگانا، سودخواری اور رشوت،چونکہ معاشرے کیلئے مضر ہیں، اس لئے اسلام نے ممنوع فرمایا ہے۔لیکن دوسرے وسائل مانند: بیع، اجارہ، ھبہ

اورجعالہ، جومعاشرے کے لئے مفید ہیں، ان میں کچھ اصلاح کر کے انھیں قبول کیا ہے اور کلّی طور پر اسلام کی نظر میں مالک بننے کے دو وسیلے ہیں :

۱۔وہ جس کے انجام دینے میں کوئی لازم ہو جیسے :خرید وفروخت کہ اس کو انجام دینے کے لئے عقد بیع پڑھنایا لین دین کا ہونا ضروری ہے۔

۲۔وہ جس میں کسی عمل کی ضرورت نہیںہے ، جیسے:وفات کہ اس کے ذریعہ مالک کا مال وارثوں کو منتقل ہوتا ہے اور اس میں کسی لفظ یا عمل کی ضرورت نہیں ہے ۔

میراث اورنکاح کے احکام کی اہمیت کے پیش نظر ہم ان سے مربوط کلی مسائل بیان کرتے ہیں۔

۱۔تقریباً ساڑھے تین گرام۔

3،2۔ میزان الحکمۃ،ج ۱، ص ٩٤ ۔

4۔ عوالی اللئالی،ج ۱، ص ٤٥٧ ۔

کھانا پینا

دین مقدس اسلام میں ،ہر وہ چیز جو کھانے اور پینے کے قابل ہو، حلال ہے لیکن چند استثنائی چیزوں کے علاوہ، کہ ان میں سے بعض قرآن مجید میں اور بعض احادیث پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں .بیان ہوئی ہیں۔

مذکورہ استثنائی چیزیں جن کا کھانا اور پینا حرام ہے ،دو قسم کی ہیں :

جان دار اور بے جان۔

پہلی قسم :حیوانات

حیوانات تین قسم کے ہیں :دریائی ، خشکی ، اور پرندے۔

الف۔ دریائی حیوانات:

پانی میں رہنے والے حیوانوں میں صرف آبی پرندے اور چھلکے دار مچھلیاں حلال گوشت ہیں اور باقی جیسے سانپ مچھلی ، سگ مچھلی ،مگرمچھ ، سمندری کتا اور سور وغیرہ حرام ہیں ۔

ب۔ خشکی کے حیوانات:

خشکی کے حیوانات دو قسم کے ہیں :(پالتو اور جنگلی)

پالتو جانوروں میں ، بھیڑ،بکری ،گائے اوراونٹ حلال گوشت ہیں ۔اسی طرح گھوڑا، خچر اورگدھا حلال ہیں ، لیکن ان کا گوشت کھانا مکروہ ہے اور ان کے علاوہ جیسے کتا او بلی حرام ہیں ۔

جنگلی حیوانوںمیں گائے،بینڈھا،جنگلی بکری ، جنگلی گدھا اورہرن حلال گوشت ہیں اورباقی درندے اور ناخن دار حیوانات ، جیسے :شیر،چیتا ،بھیڑیا ، لومڑی ،گیدڑ اور خرگوش ،حرام گوشت ہیں۔

ج۔پرندے:

پرندوں میں سے جن کے پوٹا اور، سنگ دانہ ہو یا اڑتے وقت پر مارتے ہوں اور ناخن نہ رکھتے ہوں، جیسے پالتو مرغی، کبوتر، فاختہ ،اور تیتر حلال گوشت ہیں اور باقی حرام گوشت ہیں اور ٹڈی کی ایک خاص قسم حلال گوشت ہے ان کی تفصیلات کے لئے توضیح المسائل کی طرف رجوع کیا جائے۔

نوٹ

گوشت کے حلال ہونے کے بارے میں جن حیوانوں کا نام لیا گیا، اس میں تزکیہ کی شرط ہے یعنی توضیح المسائل میں دی گئی تفصیل اور طریقہ سے ذبح کرنا۔

دوسری قسم: بے جان اشیائ

بے جان چیزیں دو قسم کی ہیں:

الف۔جامد (ٹھوس)

ب۔سیال چیزیں

الف: جامد چیزیں

١۔ہر حیوان کا مردار خواہ حرام گوشت ہو یا حلال گوشت، اس کا کھانا حرام ہے۔

اسی طرح نجس چیزیں، جیسے: حرام گوشت حیوانوں کا فضلہ اور وہ کھانے کی چیزیں جو نجاست کے ملنے سے نجس ہو گئی ہوں کا کھانا حرام ہے۔

٢۔مٹی

٣۔مہلک زہر

٤۔وہ چیزیں جن سے انسان فطری طور پر متنفر ہو، جیسے حلال گوشت حیوان کا فضلہ اور اس کی ناک کا پانی اور جو کچھ اس کی انتڑیوں سے نکلتا ہے۔اسی طرح حلال گوشت حیوان کے بدن کے اجزاء میں سے پندرہ چیزیں حرام ہیں (تفصیل کے لئے توضیح المسائل کی طرف رجوع کیا جائے)

ب: سیال چیزیں

۱۔ مست کرنے والی ہر رقیق چیز، اگرچہ کم ہی ہو اس کا پینا حرام ہے۔

۲۔ حرام گوشت حیوانات کا دودھ ، جیسے سور، بلی اور کتّا۔

۳۔ خون جہندہ رکھنے والے حیوان کا خون ۔

٤۔ نجس مائعات، جیسے خون جہندہ رکھنے والے حیوانوں کا پیشاب اور منی وغیرہ۔

٥۔ وہ مائعات جن میں نجاستوں میں سے کوئی ایک مل گئی ہو۔

نوٹ

کھانے پینے کی حرام چیزیںٓاس وقت حرام ہیں جب اضطرار نہ ہو اور اضطرار کی صورت میں (جیسے: اگر کوئی شخص حرام غذا نہ کھائے تو بھوک سے مر جائے گا ، بیمار پڑنے یا بیماری کے شدید ہونے سے ڈرتا ہو یا کمزور ہو کر سفر میں اپنے ہمسفروں سے پیچھے رہ کر ہلاک ہوجائے گا) کھانے پینے کی حرام چیزوںٔمیں سے اس قدر کھانا جائز ہے ،کہ اس کا اضطرار دور ہوجائے. لیکن جو چوری کے لئے یا اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کے لئے وطن سے باہر آکر مضطر ہوجائے تو اس کیلئے جائز نہیںہے ۔

ایک اہم یاد دہانی

حفظان صحت کی رعایت ، انسان کے بنیادی فرائض میں سے ہے کہ ہر انسان خداداد شعور کے ذریعہ تھوڑی توجہ سے اس کے بارے میں معلوم کر سکتا ہے۔

حفظان صحت پر مختلف قسم کے کھانے پینے کی چیزوں کے اثرات بھی بالکل واضح ہیں ۔اس کے علاوہ یہ چیزیں انسان کی روح واخلاق اور اسی طرح اس کے اجتماعی میل ملاپ پر بھی قابل توجہ اثرات ڈالتی ہیں ۔

ہمیں ہر گز اس میں شک وشبہ نہیں ہے کہ مست انسان کی نفسیاتی حالت اور اس انسان کی حالت ایک جیسی نہیں ہوتی جو ہوش میں ہے۔ اور ان کی اجتماعی گردش بھی ایک جیسی نہیں ہے ۔

یا اگر کوئی شخص مثلاًنفرت آمیز چیزوں کو کھانے کی عادت کرے ، اور اس عادت سے جو اثر اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں پیدا ہوگا ، وہ عام افراد کے لئے قابل برداشت نہیں ہے ۔

یہاں پر انسان اپنی خداداد فطرت سے سمجھتا ہے کہ اسے اپنے کھانے پینے میں کم وبیش محدودیت کا قائل ہونا چاہیئے، ہر کھانے والی چیز کو نہ کھالے اور ہر پینے والی چیز کو نہ پی لے۔آخر کار ہر نگلنے والی چیز کو نہ نگل لے۔

خدائے متعال نے اپنے کلام پاک کی نص کے مطابق زمین پر موجود ہر چیز کو انسان کے لئے خلق کیا ہے اور خدائی متعال خود ،انسان اور انسان کی ضروریات زندگی کی چیزوں کا محتاج نہیں ہے اور اپنی مخلوقات کے فائدہ ونقصان کے بارے میں سب سے زیادہ دانا اور بینا ہے۔انسان کی خیر وسعادت کے لئے کھانے اور پینے کی چیزوں میں سے بعض کو حلال اور بعض کو حرام قرار دیا ہے۔

بعض ان محرمات کو حرام قرار دینے کا فلسفہ ،سادہ اور بے لاگ سوچ رکھنے والوں کے لئے واضح ہے اور بعض حکمتیں علمی بحثوں کے ذریعہ تدریجاً واضح ہوئی ہیں اور جن چیزوں کے حرام ہونے کا فلسفہ ہمیں ابھی تک معلوم نہیں ہوسکا ہے، ان کے بارے میں نہیں کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہرگز ہمارے لئے واضح نہیں ہوں گی اور اگر واضح بھی نہ ہوں تب بھی نہیں کہا جاسکتا ہے کہ ان میں کوئی فلسفہ نہیں ہے۔بلکہ اس کے پیش نظر کہ قوانین کا سرچشمہ خدائے متعال کا بے انتہا علم ہے ،اس لئے کہنا چاہیئے کہ اس میں بہترین اور موثر ترین حکمت و مصلحت ہوگی اگرچہ ہم اپنی تنگ نظری اور محدود علم کی وجہ سے اس کو درک کرنے سے عاجز اور بے بس ہیں
۔

میراث کے کلی مسائل

عالم طبیعت میں میراث کا موضوع، ایک کلی قانون ہے جو تخلیق کی توجہ کا مرکز رہا ہے اور ہر ایک نسل اپنے اسلاف کی ذاتی خصوصیتوں کو میراث کے طور پر حاصل کرتی ہے ،"گندم از گندم بروید جواز جو"۔

انسان بھی کسی حد تک اپنے اجداد کے اخلاق، صفات اور ان کے وجودی اوصاف کو میراث میں حاصل کرتے ہیں اسی ذاتی میل میلاپ اور ہماہنگی کا سبب ہے کہ انسان عام حالت میں اپنے رشتہ داروں کی نسبت ایک خاص دلچسپی کو محسوس کرتا ہے اور بالخصوص اپنی اولاد کو اپنا جانشین سمجھ کر ان کی بقا کو بالکل اپنی بقا جانتا ہے اور قدرتی طور پر جو کچھ اس کی ملکیت ہے، جسے اس نے محنت وزحمت اور کام و کوشش کرکے حاصل کیا ہے اور اپنے لئے مخصوص کر رکھا ہے ،اسے اپنی اولاد کی ملکیت جانتا ہے بلکہ اپنے رشتہ داروں کی ملکیت جانتا ہے۔

اسلام بھی اسی فطری درک واحساس کے لحاظ اور احترام کے پیش نظر انسان کے مال کو اس کے مرنے کے بعد اس کے زندہ رشتہ داروں سے متعلق جانتا ہے اور میاں بیوی کو بھی جونسب اور ایک دوسرے کی زندگی میں شریک ہونے کے بانی ہیں رشتہ داروں میں شامل کرتا ہے۔پہلے طبقہ کو نسبی وارث اور دوسرے طبقہ کو سببی وارث جانتا ہے۔

اس بناپر، مرنے والے کا مال، اس کے نسبی اور سببی وارثوں میں ایک معین قانون کے مطابق تقسیم ہوگا، لیکن کچھ افراد ایسے ہیں جو میراث سے محروم ہیں، یہاں پر ان میں سے دو افراد کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:

١۔کافر کو مسلمان کی میراث نہیں مل سکتی ہے۔اس کے علاوہ اگر کوئی کافر مرجائے اور اس کے وارثوں میں کوئی مسلمان ہوتو اس کے کافر رشتہ دار میراث نہیں پائیں گے۔

٢۔قاتل، اگر کوئی شخص اپنے رشتہ داروں میں سے کسی کو قتل کردے تو قاتل اس کی میراث نہیں پائے گا، لیکن قاتل کی اولاد میراث سے محروم نہیں ہیں۔

نسبی وارث (رشتہ دار)

نسبی وارث، رشتہ کے نزدیک اوردور ہونے اور رشتہ کا رابطہ ہونے یانہ ہونے کے سبب، تین طبقوں میں تقسیم ہوتے ہیں، کہ ہرطبقہ کے ہوتے ہوئے بعد والاطبقہ میراث نہیں پائے گا اوران تین طبقوں میں سے کسی ایک کے نہ ہونے کی صورت میں، میراث ایک خاص ضابطہ کے تحت تقسیم ہوتی ہے، جس کا بعد میں ذکر کیا جائے گا۔

خدائے متعال اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے:

((...و اولواالار حام بعضهم اولى ببعض) ...)(انفال۷۵)

"...بعض رشتہ داربعض دوسروں پرزیادہ اولویت رکھتے ہیں..."

نیزاپنے کلام میں آٹھ آیتوں کے ضمن میں وارثوں کے طبقوں اور ان کے حصونکو بیان فرمایا ہے:

پہلا طبقہ

مرنے والے کے باپ، ماں، بیٹا اوربیٹی، جو مرنے والے کے براہ راست رشتہ دارہیں، مرنے والے کے کوئی بیٹا اوربیٹی نہ ہونے کی صورت میں ان کا حصہ ان کی اولاد کو ملے گا، لیکن جب تک مرنے والے کی اولادمیں سے کوئی ایک بھی ہوتو مرنے والے کی اولادکی اولاد کو نہیں ملے گی۔ مثلاً اگرمرنے والے کے باپ، ماں اوراس کے بیٹے کا ایک بیٹا اوربیٹی ہوتو، مرنے والے کے بیٹے کا حصہ مرنے والے کے بیٹے کے بیٹے اوربیٹی کو ملے گا اور ان میں تقسیم ہوگا اور اگرمرنے والے کے بیٹے کے بیٹے اوربیٹی کی کوئی اولادہوتو اسے کچھ نہیں ملے گا۔

دوسرا طبقہ

مرنے والے کے دادا، دادی، نانا، نانی اور بھائی اوربہن ہیں، جو ایک واسطہ سے (باپ یاماں کے واسطہ سے) مرنے والے کے رشتہ دارہیں۔

اس طبقہ میں بھی بھائی یابہن کی اولاد کو، ان کے ماں باپ کا حصہ، اگر وہ مرگئے ہوں، تومرنے والے کے طورپر ملے گا۔ اور جب تک بھائی اوربہن کی کوئی اولادزندہ ہو تو اولادکی اولادکومیراث نہیں ملتی ہے۔

نوٹ

مرنے والے کے اگرپدری بھائی بہن بھی زندہ ہوتاورپدری ومادری بھائی بہن بھی زندہ ہوں تو اس کی میراث پدری بھائی بہنوں کو نہیں ملے گی ۔

تیسرا طبقہ

چچا، پھوپھی ،ماموں اورخالہ ہیں ،جو دوواسطوں سے(باپ یاماں یادادا یادادی) مرنے والے کے رشتہ دارہوتے ہیں ۔اس طبقہ میں بھی اولاداپنے ماں باپ کی جگہ پرہیں اورجب تک مرنے والے کے ماں باپ کی طرف سے ایک شخص بھی زندہ ہوتوباپ کے رشتہ داروں کو میراث نہیں ملتی ۔

میراث کے حصے

اسلام میں مذکورہ وارثوں میں سے ہر ایک کے میراث کے حصے،علم ریاضی کے مطابق نہایت توجہ اور دقت کے ساتھ منظم ومر تَّب کئے گئے ہیں اورتمام حصے تین قسم کے ہیں :

۱۔وہ ورثا ورع جن کی میراث کاحصہ نصف ، ایک تہائی اور اس کے مانند ہے ان کی عددی نسبت معین ہے ۔فقہ میں ان حصوں میں سے ہرایک کو "فرض"کہتے ہیں اور یہ مجموعاًچھ ہیں :

نصف ، ایک چوتھائی ،آٹھواں حصہ ،دوتہائی ، ایک تہائی اورچھٹاحصہ ۔[1]

۲۔جولوگ رشتہ داری کی وجہ سے میراث پاتے ہیں ، لیکن ان کاحصہ نسبت کے مطابق معین نہیں ہے ۔

میراث کے فرض

۱۔نصف (۱۲)یہ تین وراثوں کے لئے ہے ۔

الف:شوہر،جبکہ اسکی بیوی مرگئی ہواوراس کے کوئی اولاد نہ ہو ۔

ب:بیٹی ، اگرمرنے والے کی تنہا اولاد ہو ۔

ج: بہن ، مادری وپدری یا صرف پدری ہو، جب کہ میت کا کوئی اور وارث نہ ہو۔
۲۔ ایک چوتھائی (۱٤) یہ دو وارثوں کے لئے ہے:

الف: شوہر، جب کہ اس کی بیوی مرگئی ہو اور اس کے اولاد ہو۔
ب: بیوی، جب کہ اس کا شوہر مرگیا ہو اور اس کے اولاد نہ ہو۔
۳۔ آٹھواں حصہ (۱۸) یہ بیوی یا متعدد بیویوں کی میراث ہے، جبکہ مرنے والے کے اولاد ہو۔
٤۔ دوتہائی (۲۳) یہ دو وارثوں کے لئے ہے:
الف: دو بیٹیاں یا اس سے زیادہ، جبکہ مرنے والے کے کوئی بیٹا نہ ہو۔
ب: دو یا اس سے زیادہ پدری ومادری بہنیں یا صرف پدری بہن ہو، جبکہ مرنے والے کے کوئی بھائی نہ ہو۔
٥۔ ایک تہائی (۱۳) یہ بھی دو وارثوں کے لئے ہے۔
الف: ماں، جبکہ مرنے والی اولاد کے اولاد اور متعدد بھائی نہ ہوں۔
ب: مادری بہن اور بھائی جبکہ ایک سے زیادہ ہوں۔
٦۔ چھٹا حصہ (۱٦) اور یہ تین وارثوں کے لئے ہے:
الف: باپ، اگر میت کی اولاد زندہ ہو۔
ب: ماں، اگر مرنے والے کی اولاد زندہ ہو۔
ج: مادری بہن یا بھائی جبکہ منحصر بہ فرد ہو۔

ماں باپ کی میراث

۱۔ اگر مرنے والے کا وارث صرف اس کا باپ یا ماں ہو تو میت کا تمام ترکہ اس کی ماں یا باپ کی میراث ہے۔
۲۔ اگر مرنے والے کے وارث اس کے ماں باپ اور اس کی اولاد ہوں تو اس کے ماں باپ میں سے ہر ایک، چھٹا حصہ (۱٦) لینگے اور باقی اس کی اولاد کا ہوگا۔
۳۔ اگر مرنے والے کے وارث باپ اور ماں ہوں، اور اسکی کوئی اولاد نہ ہو تو اگر مرنے والے کے چند بھائی ہوں تو، اگرچہ اس کے بھائی میراث نہیں پاتے، لیکن اس صورت میں چھٹا حصہ (۱٦) ماں کا اور باقی مرنے والے کے باپ کا ہوگا۔ اور اگر مرنے والے کے کوئی بھائی نہ ہو تو اس صورت میں ماں کا حصہ ایک تہائی (۱۳) اور باپ کا حصہ دوتہائی (۲۳) ہوگا۔

اولاد

۱۔ اگر مرنے والے کا وارث ایک بیٹا یا ایک بیٹی ہو تو تمام ترکہ اسی کا ہے اور اگر کئی بیٹے یا کئی بیٹیاں ہوں تو مال مساوی طور پر ان کے درمیان تقسیم ہوگا اور اگر مرنے والے کے بیٹے اور بیٹیاں ہوں تو ہر بیٹے کو بیٹی کے دو برابر حصہ ملے گا۔

دادا، دادی اور نانا، نانی

۲۔ اگر میت کے وارث دادا اور دادی ہوں، تو دو حصے دادا اور ایک حصہ دادی کو ملی گا۔ اور اگر میت کے وارث نانا اور نانی ہوں تو ان کے درمیان میت کا مال مساوی طور پر تقسیم ہوگا۔ اور اگر میت کے وارث دادا، دادی اور نانا، نانی ہوں تو مال کو تین حصوں میں تقسیم کیا جائے گا ان میں سے دو حصے دادا، دادی کو اسطرح کہ دادا کو دادی کے دو برابر دیا جائے گا۔ اور ایک حصہ نانا اور نانی کو مساوی طور پر تقسیم کر کے دیا جائے گا۔

۳۔ اگر مرنے والے کے وارث اجداد اور بھائی بہن ہوں، چنانچہ وہ بھائی یا بہن مادری یا پدری یا پدری و مادری ہوں تو ایک تہائی اجداد کو اور باقی دو تہائی بھائی بہنونکو ملے گا۔

لیکن اگر بھائی بہن میں بعض پدری و مادری اور بعض دوسرے صرف پدری ہوں تو مادری بھائی یا بہن کو کچھ نہیں ملیگا اور باقی ماندہ دو حصے پدری و مادری یا پدری بھائی اور بہن کو ملے گا۔

چچا اور پھوپھی

۱۔ اگر مرنے والے کے وارث چچا یا پھوپھی ہوں تو سب مال ان کو ملے گا اور اگر کئی چچا یا کئی پھوپھیاں ہوں تو ان میں مساوی طور پر مال تقسیم ہوگا اور اگر چچا اور پھوپھی ہوں اور سب پدری و مادری یا پدری یا مادری ہوں تو چچا کو دو حصے اور پھوپھی کو ایک حصہ ملے گا اور اگر بعض پدری و مادری ہوں اور بعض پدری اور بعض مادری ہوں، تو اس صوت میں اگر چچا اور پھوپھی مادری ہوں تو ایک تہائی (۱۳) مال اور اگر زیادہ ہوں تو دو حصے اس کو ملیں گے اور باقی پدری و مادری چچا اور پھوپھی کو ملے گا اور پدری چچا و پھوپھی کو میراث نہیں ملے گی۔

۲۔ اگر مرنے والے کے وارث، پدر و مادری چچا یا پھوپھی اور پدری چچا یا پھوپھی ہوں تو پدری چچا یا پھوپھی کو میراث نہیں ملے گی اور تمام مال پدری و مادری چچا و پھوپھی کو ملے گا۔

ماموں اورخالہ

ماموں اورخالہ جبکہ سب پدری ومادری ہوں، اگرچہ بعض لڑکے اوربعض لڑکیاں ہوں،تو مال ان میں مساوی طورپر تقسیم ہوگااوراگربعض پدری ومادری یاپدری اوربعض مادری ہوں،تومادری ماموں اورخالہ کاحصہ ١٦ ہے جو ان میں مساوی طورپر تقسیم ہوگا اورباقی مال پدری ومادری یاپدری ماموں اورخالہ کو ملے گا کہ ہرلڑکے کو لڑکی کے دوبرابرحصہ ملے گا۔

میاں بیوی کی میراث

جیساکہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ شوہرکی میراث جبکہ اس کی بیوی کے کوئی اولادنہ ہوتونصف ہے اوراگراس(فوت شدہ)بیوی یادوسری بیوی سے اولاد ہوتوایک چوتھائی ہے۔ اوربیوی کی میراث،اگر(فوت شدہ)شوہر سے کوئی اولادنہ ہوتو ایک چوتھائی اوراگراس(فوت شدہ)شوہریادوسرے شوہرسے اولادہوتو اس کو١٨ میراث ملے گی۔

لیکن جانناچاہیئے کہ بیوی زمین سے میراث نہیں پاتی،بلکہ ١٤ یا١٨ منقولہ اموال اوراعیان زمین، جیسے عمارت،تعمیر اوردرختوں سے میراث پاتی ہے، لیکن شوہربیوی کے تمام اموال سے میراث پاتاہے۔

١۔ ترتیب وار ١٢، ١٣، ١٨،٢٣، ١٤اور١٦۔

ولاء

اگرکسی مرنے والے کامذکورہ وارثوں میں سے کوئی ایک بھی نہ ہوتواس کی میراث "ولائ" کے ذریعہ انجام پائے گی ۔اور ولاء کی تین قسمیں ہیں کہ جو بالترتیب میراث حاصل کرتے ہیں :

۱۔ولائے عتق

وہ یہ ہے کہ کوئی اپنے غلام کوآزاد کرے ،چنانچہ وہ غلام مرجائے اور اس کا کوئی وارث نہ ہوتو اس کامالک اورمولا اسکے تمام ترکہ کاوارث بن جاتا ہے ۔

۲۔ولائے ضمان جریرہ

اگرکوئی شخص کسی شخص کے ساتھ عہد کرے کہ"کسی کو قتل کرنے یا زخمی کرنے کی صورت میں جو جرمانہ اس پر کیا جائے گا،وہ اسے اس شرط پر اداکرے گاکہ اگراس کے مرنے کے بعداس کا کوئی وارث نہ ہوتواس کے ترکہ کولے لے گا "اس صورت میں وہ اس کے تمام ترکہ کاوارث بنتا ہے ۔

۳۔ولائے امامت

یہ امام کی سرپرستی ہے ۔امام،تمام مسلمانوں کا سرپرست ہے اوراگرکسی شخص کا کوئی وارث نہ ہو،تواس کاترکہ امام کواورامام کی غیبت میں ان کے نائب کوپہنچتا ہے۔ امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام ،لاوارثوں کے ترکہ کوان کے ہم شہریوں اورہمسایوں میں تقسیم فرماتے تھے۔

میراث کے احکام

۱۔باپ کے رشتہ داراوربانباپ کے رشتہ دارمیراث کو کچھ فرق کے ساتھ تقسیم کرتیں ہیں ،یعنی ہرمردعورت کے دوبرابرلیتا ہے ،لیکن ماں کے رشتہ داروں میں میراث مساوی طورپر تقسیم ہوتی ہے ۔

۲۔ وارثوں کے ہر طبقہ میں اولاد، باپ اورماں کی جگہ ہوتی ہے، یعنی اگرماں باپ نہ ہوں توان کی میراث کاحصہ ان کی اولاد لیتی ہے، مثلاًاگرمرنے والے کے ماں باپ اوراس کی پوتی اورنواسہ ہو، توماں باپ میں سے ہرایک کو مال کا۱۶حصہ ملے گا اور باقی مال تین حصوں میں تقسیم ہوتا ہے اوران میں سے دوحصے پوتے کواورایک حصہ نواسے کو ملے گا۔

۳۔ اگرمرنے والے کے ایک بیٹا اورایک پوتاہوتو تمام میراث بیٹے کوملے گی اور پوتے کو کچھ نہیں ملے گا۔

٤۔ اگروارثوں کے حصے اور فرض اصل ترکہ سے زیادہ ہوتو، کمی کو بیٹیاں اور باپ کے رشتہ داربرداشت کریں گے۔ مثلاًاگرمرنے والے کے وارث شوہر، باپ، ماں اورکئی بیٹیاں ہوں توچونکہ شوہر کاحصہ ۱٤ اورماںباپ میں سے ہرایک کاحصہ ۱٦ اور بیٹیوں کاحصہ ۲۳ ہے اور یہ مجموعاً ۱۱٤ ہوتا ہے اسطرح ۱٤ تمام ترکہ سے یعنی عددواحدزیادہ ہوتا ہے۔اس صورت میں شوہر، باپ اور ماں کاپوراحصہ اداکرنے کے بعدباقی بچے مال کو بیٹیوں میں مساوی طورپر تقسیم کیا جاناچاہیئے۔اور کمی ان سے متعلق ہوتی ہے۔

اہل سنت اس صورت میں کمی کو ہرایک حصہ دارکے حصہ سے کم کرتے ہیں اوراسے "عول"کہتے ہیں۔

۵۔ اگرتمام حصے اصل مال سے کم ہوں، یعنی عددواحدکم ہو اس طرح کہ فرض اور حصوں کو اداکرنے کے بعد کچھ مال بچے تو باقی ماندہ مال کو بیٹی یاباپ کے رشتہ داروں، یعنی کمی کا خسارہ برداشت کرنے والے رشتہ داروں کے حصہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ مثلاًاگرمرنے والے کی وارث ماں اورایک بیٹی ہوتوماں کاحصہ ۱۳ ہے اوربیٹی کاحصہ ۱۲ اوراس صورت میں ۱٦ حصہ مال باقی بچتا ہے اسے بیٹی کودیاجاتا ہے۔ لیکن اہل سنت اس بچے ہوئے مال کوباپ کے رشتہ داروں۔جوبعدوالاطبقہ ہے۔کو دیتے ہیں اور اسے "تعصیب"کہتے ہیں۔

مردوعورت کے حصوں میں جزئی فرق

اسلام کی نظرمیں مردوعورت انسانی طبیعت اورحقوق ومعنویت کے لحاظ سے مساوی ہیں۔ لیکن ان دونوں صنفوں میں سے ہرایک میں اپنی مخصوص خصوصیات کی بناپر کچھ فرق بھی ہے۔ جیسے میراث میں عورت کاحصہ مرد کے حصہ کا نصف ہے اور دوعورتوں کی گواہی ایک مردکی گواہی کے برابرہے اور مرد ایک وقت میں چاربیویاں رکھ سکتا ہے لیکن عورت کو ایک شوہر سے زیادہ کاحق نہیںہے اورطلاق کا حق مرد کو ہے اورحکومت، فیصلہ اور جہادمردوں سے مخصوص ہے اور عورت کے اخراجات مرد کے ذمہ ہیں ۔

البتہ یہ جزئی فرق جواسلام میں مرداورعورت کے درمیان پایا جاتا ہے، اس کا سبب ان کی مخصوص فطرت اورجذبات ہیں۔کیونکہ دونوں صنفوں میں انسانیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔

مرد اورعورت میں جو واضح فرق ہے وہ یہ ہے کہ عورت کی فطرت میں جذبات اورہمدردیاں مردکی نسبت زیادہ ہوتی ہیں۔

یہ بات ناقابل انکار ہے کہ تمام ناموس کی طرح اس حکم کے بھی استثنائی مواقع بھی ہیں، یعنی دنیا میں ایسی عورتیں بھی پیدا ہوئی ہیں کہ ان کی عقلی توانائی بہت سے مردوں سے کہیںزیادہ تھی، لیکن عام طور پر مردوں کی اکثریت میں عقل وفکر کی توانائی زیادہ رہی ہے اورجذبات و احساسات عورتوں میں زیادہ رہے ہیں۔

یہ بات طولانی تجربوںاورآزمائشوں کے بعدثابت ہوئی ہے کہ اسلام میں مرد اور عورت کے حقوق میں جو فرق پایا جاتا ہے، اس کی علت یہی فکراورجذبات اوردیگر طبیعی اسباب ہیں۔ہم یہاں پراجمالی طورپران میں سے بعض فرق کو بیان کرتے ہیں۔

مرد اور عورت کی میراث میں فرق

اسلامی نقطۂ نظر سے، میراث میں عورت کاحصہ ،مرد کے حصہ کانصف ہے۔ لیکن دقیق تحقیق سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کادوسرا حکم، یعنی عورت کے اخراجات کومرد برداشت کرے، اس کمی کی تلافی کرتا ہے ۔کیونکہ ہم جانتے ہیںکہ روئے زمین پرموجود تمام مال و دولت ہرزمانہ میں نسل حاضر کی ملکیت ہوتی ہے اور میراث کے ذریعہ دوسری نسل پہنچتی ہے اور وہ اس سے استفادہ کرتی ہے۔

اس لئے،مرد اورعورت کے ایک حصہ اور دو حصہ لینے(جو اعداد و شمار سے تقریباًمساوی ہے) کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کی پوری دولت کا دوتہائی حصہ مرد کا ہے اورایک تہائی حصہ عورت کا ہے۔

لیکن چونکہ اسلام میں عورت کے اخراجات اور اس کی زندگی کے لوازم عدالت ومساوات کی بنا پر مرد کے ذمہ ہے، لہذا مال کانصف حصہ مرد کو جوزیادہ دیاگیا ہے وہ عورت پر خرچ ہوتا ہے اور وہ عورت اپنے حصہ کو بھی اپنے اختیار سے خرچ کر سکتی ہے۔

پس روئے زمین کی دولت کا دوتہائی حصہ اگرچہ ہر زمانہ میں مردکا اور ایک تہائی حصہ عورت کا رہا ہے، لیکن اخراجات کے لحاظ سے مسئلہ برعکس ہے۔

پس حقیقت میں اسلام نے ملکیت کے لحاظ سے دنیا کے مال کا دوتہائی حصہ تدبیر، فکر وعقل نظام چلانے والے کے ہاتھ میں دیا ہے اور اس کاایک تہائی حصہ جذبات اوراحساسات کے سپردکیاہے۔ لیکن اخراجات کے لحاظ سے اس کا دوتہائی حصہ جذبات واحساسات کے سپرد کیا گیا ہے اور ایک تہائی حصہ فکر و عقل کے سپرد کیا گیاہے۔

بدیہی ہے کہ مال و دولت کے سلسلہ میں عقل کی توانائی جذبات اور احساسات سے زیادہ ہے اورجذبات اوراحساسات مال کو خرچ کرنے میں عقل کی زیادہ محتاج ہیں کیونکہ یہ ایک نہایت عادلانہ و عاقلانہ طریقہ ہے کہ دنیا کی دولت کودو مختلف طاقتوں یعنی عقل وجذبات میں تقسیم کردیا جائے تاکہ یہ دونوں طاقتیںزراضی رہیں جو زندگی میں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔

بیع

(خرید و فروخت)

بیع کیا ہے ؟

"بیع"کے معنی کسی مال کوبیچنے یاکسی مال کو دوسرے مال سے بدلنے کے ہیں،اس صورت میں کہ مال کا مالک جسے"بیچنے والا"کہتے ہیں،اپنے مال کی ملکیت سے ان پیسوں کے عوض دست بردار ہوجاتا ہے جوکہ،دوسرا شخص،یعنی"خریدار"ادا کرتا ہے۔اور"خریدار"بھی مال کے عوض بیچنے والے کو اپنے پیسے دیدیتا ہے۔

واضح رہے کہ"بیع"ایک عقد ہے اور اپنے وجود میں طرفین (بیچنے والے اورخریدنے والے)کا محتاج ہے۔اس لئے اس میں عقود کے عام شرائط جیسے بلوغ،عقل،قصد اوراختیار ہونا چاہئے۔

بیع عقد لازم ہے

بیع،عقود لازمہ میں سے ہے،یعنی عقد کے منعقد ہونے کے بعد متعاقدین (بیچنے والے یاخریدار) میں سے کوئی اسے توڑ نہیں سکتا۔لیکن چونکہ کبھی بیع کے منعقد ہوجانے کے بعد غفلت یا غلطی سے بیچنے والے یا خریدار کو دھوکہ ہو جاتا ہے اور وہ قابل اعتنا نقصان سے دوچار ہوتا ہے،لہذا ایسے مواقع پر بیع کا انجام عام مصلحتوں کے خلاف ہوتا ہے۔دین اسلام نے اس خرابی سے بچنے کے لئے دو اقدام کئے ہیں:

اول:"اقالہ"وہ یہ ہے کہ بیع انجام دینے والے طرفین میں سے ایک پشیمان ہوجائے اور مد مقابل سے معاملہ توڑنے کی درخواست کرے تو مستحب ہے اسے قبول کرکے معاملہ کو توڑدیا جائے۔

دوم:"خیار" یہ ایک خاص اختیار ہے جس کے تحت معاملہ کرنے والا معاملہ کو توڑ سکتا ہے۔

مشہور"خیارات" حسب ذیل ہیں:

۱۔خیار مجلس:جب تک عقد کی مجلس برخاست نہ ہوجائے معاملہ کے طرفین معاملہ کو توڑ سکتے ہیں۔

۲۔خیار غبن: یہ ہے کہ عقد کے طرفین میں سے کسی ایک نے دھوکہ کھایا ہو اور معاملہ میں نقصان اٹھایا ہو۔ مثلاً مال اس کی اصل قیمت سے کم میں بیچ دیا گیا ہو یا اصل قیمت سے زیادہ میں خریدا گیا ہو۔ تو اس صورت میں طرفین میں سے جس کو نقصان ہوا ہے وہ فوراً معاملہ کو توڑ سکتا ہے۔

۳۔خیار عیب: اگر معاملہ طے پانے کے بعد، خریدار مال میں کوئی عیب پائے تو وہ معاملہ کو توڑ سکتا ہے۔ یا قیمت کے تفاوت کو حاصل کر سکتا ہے۔

٤۔خیار حیوان: حیوانوں، جیسے بھیڑ اور گھوڑے وغیرہ میں خریدار تین دن تک معاملہ توڑنے کا حق رکھتا ہے۔

۵۔خیار شرط: اگر بیچنے والا یا خریدار یا دونوں اپنے معاملہ میں کوئی شرط رکھیں، تو وہ شرط کی خلاف ورزی کی صورت میں معاملہ کو توڑ سکتے ہیں۔

نقد، ادھار، اور سلم

پیسہ لینے اور مال دینے کے لحاظ سے "بیع" کی چار قسمیں ہیں:

۱۔معاملہ انجام پانے کے ساتھ ہی خود مال اور پیسے ادا کئے جائیں تو اس بیع کو "نقد" کہتے ہیں۔

۲۔معاملہ انجام پانے کے وقت مال خریدار کے حوالہ کر دیا جائے لیکن اس کی قیمت تاخیر سے ادا ہونا قرار پائے، تو اس معاملہ کو "ادھار" کہتے ہیں۔

۳۔دوسری قسم کے برعکس پیسے نقد ادا کئے جائیں لیکن مال کو بعد میں دینا قرار پائے تو اس بیع کو "سلم" کہتے ہیں۔

٤۔پہلی قسم کے برعکس معاملہ طے ہونے کے بعد مال اور پیسے دونوں بعد میں ادا کرنا قرار پائے تو اس بیع کو "کالی بہ کالی" کہتے ہیں۔

مذکورہ چار قسموں میں سے بیع کی پہلی تین قسمیں صحیح اور چوتھی قسم باطل ہے۔

منابع وماٰخذ کی فہرست

۱۔قرآن مجید

الف:

۲۔احقاق الحق،قاضی سید نوراللہ الحسینی المرعشی التستری، طبع، الخیام، قم۔

۳۔اصول کافی، مرحوم کلینی، دارالکتب الاسلامیہ، تہران۔

٤۔امالی، شیخ مفید، دفترانتشارات اسلامی، قم۔

ب:

٥۔بحارالانور، علامہ مجلسی، دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان۔

ت:

٦۔تاریخ طبری، محمدبن جریر طبری، دارالمعارف، مصر۔

۷۔تحف العقول، ابو محمد حسن بن علی بن حسین شعبۃ حرانی، دفتر انتشارات اسلامی قم۔

س:

۸۔سفینتہ البحار، شیخ عباس قمی، انتشارات فراہان، تہران۔

ش:

۹۔شرح غررالحکم، جمال الدین محمدخوانساری، مئوسسۂ انتشارات وچاپ، تہران۔

ع:

۱۰۔عوالی اللئالی، محمدبن علی بن ابراھیم احسائی، مطبعۃ سیدالشہداء علیہ السلام دانشگاہ قم، ایران۔

غ:

۱۱۔غایۃ المرام، صمیری بحرانی، دارالهادی، قم۔

۱۲۔الغدیر، علامہ امینی، دارالکتب العربی، بیروت، لبنان۔

۱۳۔غرر الحکم، مترجم محمد علی انصاری، مئوسسئہ صحافی خلیج، ایران، قم۔

ک:

۱٤۔کنز العمال، علامہ علاء الدین علی المتقی بن حسام الدین الھندی، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت۔

م:

۱۵۔محجۃ البیضا، ملا محسن کاشان، دفتر انتشارات اسلامی، قم۔

۱٦۔مستدرک الوسائل، حسین نوری طبرسی، افست مطبعۃ الاسلامیہ۔

۱۷۔مسند احمد بن حنبل، مکتب اسلامی دار صادر، بیروت۔

۱۸۔میزان الحکمۃ، محمدری شہری، مکتب العلوم الاسلامی، قم۔

ن:

۱۹۔نہج البلاغہ صبحی صالح۔

۲۰۔نہج البلاغہ فیض الاسلام۔

۲۱۔نہج الفصاحہ، مترجم، ابوالقاسم پاینده، سازمان انتشارات جاویدان۔

و:

۲۲۔وسائل الشیعہ، شیخ حر عاملی، مکتبۃ الاسلامیۃ، تہران۔

ی:

۲۳۔ینابیع المودہ، قندوزی، موسسئہ اعلمی۔

فہرست

حرف اول 5

دینی معلومات 7

نتیجہ 8

خدا کے قانون سے رابط کا اچھا اثر 8

۱۔ عقائد 9

۲۔ اخلاق 10

۳۔ عمل 10

دین کا فطری ہون 12

دین کے فائدے 13

تاریخ ادیان کا ایک خلاصہ 14

دین اسلام اور اس کی آسمانی کتاب 15

دین، قرآن مجید کی نظر میں 17

معاشرے میں دین کا کردار 19

معاشرے کو قوانین کی ضرورت 19

قوانین کے مقابلہ میں انسان کا آزاد ہونا 20

قوانین کی ترقی میں کمزوریاں 20

قانون میں خامی کا اصلی سرچشمہ 21

تمام قوانین پر دین کی ترجیح 22

نتیجہ 22

دوسروں کی کوشش.......... 23
انسان کے آرام وآسائش میں اسلام کی اہمیت 24
اسلام کا دوسرے ادیان سے موازنہ.......... 24
سماج کے رسم ورواج سے اسلام کا موازنہ 25
نتیجہ 26
طبیعی وسائل سے اسلام کی ترقی.......... 27
تبلیغ اور دعوت اسلام 27
تبلیغ کا طریقہ 28
اسلام میں تعلیم و تربیت 29
اسلامی تعلیمات کے دواہم شاہکار.......... 29
آزادی فکر اور حق پوشی.......... 30
نتیجہ 31
سماجی زندگی میں اسلام کی خدمات.......... 32
افراد کے منافع کا تحفظ اوررفع اختلاف.......... 32
اسلام کا طریقہ کار اور اس کی بنیاد.......... 32
سماجی اختلافات.......... 33
عداوت و اختلاف سے اسلام کا مقابلہ 35
رفع اختلاف کے لئے ایک عام وسیلہ 36
نماز، روزہ اورحج یارفع اختلافات کا وسیلہ.......... 37
عقائد.......... 40

۱۔توحید........ 40

اثبات صانع 40

ابتدائے خلقت کی بحث 41

معرفت خدا اور ملتیں 42

انسان کی زندگی میں تجسس کا اثر........ 43

توحید کے بارے میں قرآن مجید کا اسلوب 44

مثال اور وضاحت........ 45

قرآن مجید کی نظر میں خداشناسی کا طریقہ 47

کمال کیا ہے؟ 48

توحید اور یکتائی........ 49

وضاحت........ 50

خدائے متعال کا وجود، قدرت اور علم 50

خدا کی قدرت........ 51

وضاحت........ 51

خدا کا علم........ 51

وضاحت........ 51

خدا کی رحمت 52

تمام صفات کمالیہ........ 52

وضاحت........ 52

۲۔نبوت 53

انسان کو پیغمبر کی ضرورت 53
انبیاء کی تبلیغ 54
معاشرے میں قوانین و قواعد کی ضرورت 55
قواعد و ضوابط کی تکوینی بنیاد 55
زندگی کے قوانین کی طرف تکوینی ہدایت 55
نتیجہ 56
انسان اور دوسری مخلوقات کی ہدایت میں فرق 57
انسان اور دوسری مخلوقات میں فرق 58
پیغمبر کی صفات 60
انبیاء، انسانوں کے درمیان 60
صاحب شریعت انبیائ 61
اولوالعزم پیغمبر اور دوسرے انبیائ 61
۱۔ حضرت نوح علیہ السلام 62
۲۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام 63
۳۔ حضرت موسی کلیم اللہ علیہ السلام 64
٤۔ حضرت عیسی مسیح علیہ السلام 65
۵۔ خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم 67
بحیرا راہب کا قصہ 68
نسطورا راہب کا قصہ 70
حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت 71

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طائف کی طرف سفر 74
مدینہ کے یہودیوں کی بشارت 75
نبی کی بشارتوں کی طرف قرآن مجید کا اشارہ 75
پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مدینہ میں ورود 76
پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جنگوںکا ایک مختصر جائزہ 78
۱۔جنگ بدر 78
۲۔جنگ احد 78
۳۔جنگ خندق 79
٤۔جنگ خیبر 80
بادشاہوں اور سلاطین کو دعوت اسلام 80
٥۔جنگ حنین 81
٦۔جنگ تبوک 81
اسلام کی دوسری جنگیں 82
پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معنوی شخصیت کا ایک جائزہ 83
پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غیر معمولی معنوی شخصیت 85
پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت 85
پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کے بارے میں چند نکات 88
مسلمانوں کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت 90
پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت اور جانشینی کا مسئلہ 90
قرآن مجید، نبوت کی سند 92

قرآن مجید کی اہمیت 94

قرآن مجید کا معجزہ 94

قرآن مجید کی مشرکین کو مناظرہ کی دعوت 97

قرآن مجید کی تعلیمات..100

قرآن مجید کی نظر میں علم وجہل 100

وضاحت..102

قرآن مجید کا احترام 103

راہ خدا میں جہاد او رفداکاری کے متعلق قرآن کا دستور..103

بحث کا خاتمہ..104

۳۔ معاد یا قیامت..105

۳۔ معاد یا قیامت..105

ادیان وملل کی نظر میں معاد 105

قرآن مجید کی نظر میں معاد..106

موت سے قیامت تک 107

بدن مرتا ہے نہ کہ روح 107

اسلام کی نظر میں موت کے معنی..108

برزخ..108

قیامت یقینی ہے..108

٤۔عدل..111

٥۔ امامت اور امت کی رہبری 113

امام کی ضرورت پر ایک نقلی دلیل 114
ولایت کے بارے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بیان 115
پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ جانشین کا تقرر 116
امامت کی ضرورت پر ایک دلیل 116
امام کی ضرورت 117
امام کی عصمت 118
امام کے اخلاقی فضائل 118
امام کا علم 118
ائمہ ھدیٰ علیہم السلام 119
ائمہ علیہم السلام کے اسمائے گرامی 119
ائمۂ اطہار علیہم السلام کی عام سیرت 119
پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت علیہم السلام 120
اہل بیت علیہم السلام کی عام سیرت 121
وقت کے حکّام کے ساتھ ائمہ اطہار کے اختلافات کا اصلی سبب 123
خلاصہ اور نتیجہ 125
اہل بیت علیہم السلام کے کردار میں ایک استشنائی نکتہ 125
اہل بیت علیہم السلام کے فضائل 126
ائمہ علیہم السلام کی تقرری 128
ائمہ معصومین علیہم السلام کی زندگی کا ایک مختصر جائزہ 129
حضرت امام علی علیہ السلام 129

(مسلمانوں کے پہلے امام)..129

امام علی علیہ السلام کے فضائل کا خلاصہ..132

حضرت امیر المؤمنین کا طریقہ 133

حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام 135

(دوسرے امام) 135

حضرت امام حسین علیہ السلام..136

(تیسرے امام)..136

کیاامام حسن اورامام حسین علیہما السلام کی روش مختلف تھی ؟ 137

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام 140

(چوتھے امام)..140

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام...141

(پانچویں امام) 141

حضرت امام جعفرصادق علیہ السلام...141

(چھٹے امام) 141

امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام کی تحریک 142

حضرت امام موسی کاظم علیہ السلام...143

(ساتویں امام) 143

حضرت امام رضا علیہ السلام..143

(آٹھویں امام)..143

حضرت امام محمد تقی علیہ السلام 145

(نویں امام)..145
حضرت امام علی نقی علیہ السلام 145
(دسویںامام)..145
حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام..145
(گیارہویں امام)..145
حضرت امام مہدی موعود عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف 146
(بارہویںامام)..146
ائمہ دین کی روش کا اخلاقی نتیجہ 147
ائمہ معصومین علیہم السلام کے اجمالی حالات 148
پہلے امام..148
دوسرے امام 148
تیسرے امام..149
چوتھے امام..149
پانچویں امام 149
چھٹے امام 150
ساتویں امام 150
آٹھویںامام 151
نویں امام..151
دسویں امام 152
گیارہویں امام..152

بارہویں امام 152
اخلاق واحکام کے چند سبق.. 154
۱۔اخلاق کے چند سبق.. 154
خدا کے بارے میں انسان کافریضہ 154
خدا پرستی.. 155
اپنے بارے میں انسان کافریضہ 156
بدن کی صفائی.. 157
صفائی کاخیال 157
کُلّی اور مسواک 158
استنشاق(ناک میں پانی ڈالنا) 158
تہذیب اخلاق 159
حصول علم 159
اسلام کی نظرمیں طالب علم کی اہمیت.. 160
معلم اورمربی کی اہمیت 161
معلم اور شاگرد کا فریضہ 161
ماں باپ کے بارے میں انسان کا فریضہ.. 162
بزرگوں کا احترام.. 163
اپنے رشتہ داروںکے بارے میں انسان کافریضہ 163
ہمسایوں کے بارے میں انسان کافریضہ 163
ماتحتوں اور بیچاروں کے بارے میں انسان کا فریضہ.. 164

معاشرے کے بارے میں انسان کا فریضہ......165
عدالت......168
انفرادی عدالت......168
اجتماعی عدالت......168
سچائی......169
جھوٹ......169
جھوٹ کے نقصانات......170
غیبت و تہمت......170
لوگوں کی عزت پر تجاوز......171
رشوت......171
حسن معاشرت......172
نیکوں کی مصاحبت......174
بروں کی مصاحبت......175
ماں باپ پر اولاد کے حقوق......175
اولاد پر ماں باپ کے حقوق......177
بھائیوں اور بہنوں کے باہمی حقوق......177
عاق والدین......178
عزت نفس اور کامیابی......178
احسان اور محتاجوں کی مدد......179
تعاون......180

خیرات اور نیکیوں کی طرف سبقت کرن 180

یتیم کا مال کھان 181

کسی کو قتل کرن 181

رحمتِ خدا سے مایوسی 181

جہاد اور دفاع سے فرار کی سزا 182

وطن کا دفاع 183

حق کا دفاع 183

غیظ و غضب 183

کام کا واجب ہونا اور صنعت و حرفت کی اہمیت 184

.بیکاری کے نقصانات 185

خود اعتمادی 185

کھیتی باڑی اور اس کے فائدے 186

دوسرونکے سہارے زندگی گزارنے کے نقصانات 186

ناپ تول میں کمی کی سزا 186

ظلم و ستم کی برائی 187

مردم آزاری اور شرارت حرام ہے 187

چوری 188

فرض شناسی 189

فرض شناسی 189

فریضہ کی تعیین میں مختلف روشوں کا اختلاف 190

دفاع کی اہمیت 191
بخش دین 192
مال کی زکواۃ.. 193
علم کی زکواۃ.. 194
معاشرے کے اندرونی دشمنوں سے مقابلہ.. 195
اسلام میں گناہان کبیرہ کی عام سزا 196
احکام کے بارے میں چند سبق.. 197
اجتہاد اور تقلید.. 197
نجاسات 198
نجاسات (نجس چیزیں) چند چیزیں ہیں : 198
۱و۲:پیشاب اور پاخانہ۔ (1).. 198
مطہّرات 198
(پاک کرنے والی چیزیں) 198
۱۔پانی، 199
۲۔زمین ، 199
۳۔آفتاب ، 199
٤۔استحالہ ، 199
۵۔انتقال ، 199
٦۔عین نجاست کازائل ہوجانا،.. 199
۷۔تبعیّت،.. 200

۸۔کم ہونا،..200
غسل 200
وضو اور اس کے احکام..202
وضو کی کیفیت اوراس کے شرائط 202
مبطلات وضو 202
تیمم..203
تیمم کا طریقہ...203
تیمم کے احکام 204
نماز..205
واجب نمازیں 206
مقدمات نماز...206
١۔ طہارت..207
٢۔ وقت 207
٣۔ لباس...208
٤۔مکان..208
٥۔ قبلہ 208
واجبات نماز...209
ارکان نماز...209
١۔نیت...210
٢۔تکبیرۃ الاحرام 210

٣۔قیام 210

٤۔رکوع 210

٥۔سجدہ 211

تشہد وسلام 211

نماز آیات 213

نماز آیات پڑھنے کا طریقہ 213

نماز آیات کا دوسرا طریقہ : 213

مسافر کی نماز 213

نماز جماعت 214

نماز جماعت کی شرائط 214

نماز جماعت کے احکام 214

روزہ 216

روزہ کو باطل کرنے والی چیزیں 216

اسلام میں جہاد 216

جہاد کے کلی مسائل 216

اسلام میں جنگ کے مواقع 217

١۔مشرکین : 218

٢۔اہل کتاب : 218

٣۔بغاوت اورفساد برپا کرنے والے : 218

٤۔دین کے دشمن: 218

جہاد کے بارے میں اسلام کا عام طریقہ......219
حکومت، قضاوت اورجہاد کیوں مردوں سے مخصوص ہے ؟......219
اسلام میں فیصلہ......222
مسائل عدلیہ کے کلیات......222
قاضی (جج) کے فرائض......222
فیصلہ کرنے کی اہمیت......223
گواہی......224
مرداورعورت کی گواہی......224
گواہی کے کلیات......224
گواہ کی شرائط......224
اقرار......226
اقرار کی اہمیت......226
اقرار کے معنی اور اس کی شرائط......226
شفعہ......227
مرد اور عورت کا طبقہ......227
اسلام سے پہلے معاشرے میں عورت......228
الف:قبائلی معاشرے میں عورت......228
ب۔ عورت، ترقی یافتہ سلطنتی معاشرے میں......229
ج: عورت دینی معاشرہ میں......230
خلاصہ......230

عورت کے بارے میں اسلام کا نظریہ............231
عورت کے بارے میں اسلام کا نظریہ............231
نکاح............233
(ازدواج)............233
نکاح کے مسائل اوراحکام............233
نکاح کے احکام............233
نوٹ............233
نوٹ............234
عقد کاولی............235
اولاد کے حقوق اور تبعیت............235
اسلام میں متعدد بیویاں............235
طلاق............238
(میاں بیوی کی جدائی)............238
طلاق صحیح ہونے کی شرائط............239
عدت کے احکام اور اس کی قسمیں............240
عدت کی قسمیں............241
اسلام میں غلامی............242
اسلام میں غلامی............242
غلام بنانے کے طریقے............242
غلامی کے بارے میں اسلام کا نظریہ............243

اسلام اور دوسرے نظریات کی تحقیق...244
غلاموں کے ساتھ اسلام کا سلوک 244
غصب 246
غصب کے بعض احکام...246
لُقطہ 247
بنجر زمینوں کو آباد کرن 248
نوٹ 248
تخصیص اور مالکیت کی اصل...249
اصل مالکیت کے دو تتمے 250
ا۔ احکام ضمان کے دو حکم:...251
جن چیزوں سے انسان مالک بن سکتا ہے 251
کھانا پینا...253
جان دار اور بے جان ۔ 253
پہلی قسم :حیوانات 253
الف۔ دریائی حیوانات: 253
ب۔ خشکی کے حیوانات:...253
ج۔پرندے:...254
نوٹ 254
دوسری قسم :بے جان اشیائ 254
ب: سیال چیزیں...255

نوٹ 255
ایک اہم یاد دہانی........ 255
میراث کے کلی مسائل 256
نسبی وارث (رشتہ دار) 258
پہلا طبقہ 258
دوسرا طبقہ........ 258
نوٹ 259
تیسرا طبقہ 259
میراث کے حصے 259
میراث کے فرض........ 259
ماں باپ کی میراث 260
اولاد........ 261
دادا، دادی اور نانا، نانی........ 261
چچا اور پھوپھی........ 261
ماموں اور خالہ 262
میاں بیوی کی میراث 262
ولاء 263
۱۔ ولائے عتق........ 263
۲۔ ولائے ضمان جریرہ........ 263
۳۔ ولائے امامت 263

میراث کے احکام..263
مرد و عورت کے حصوں میں جزئی فرق..264
مرد اور عورت کی میراث میں فرق..265
بیع..266
(خرید و فروخت)..266
بیع کیا ہے؟..266
بیع عقد لازم ہے..266
نقد، ادھار، اور سلم..267
منابع و مآخذ کی فہرست..268